’’چہارسُو‘‘

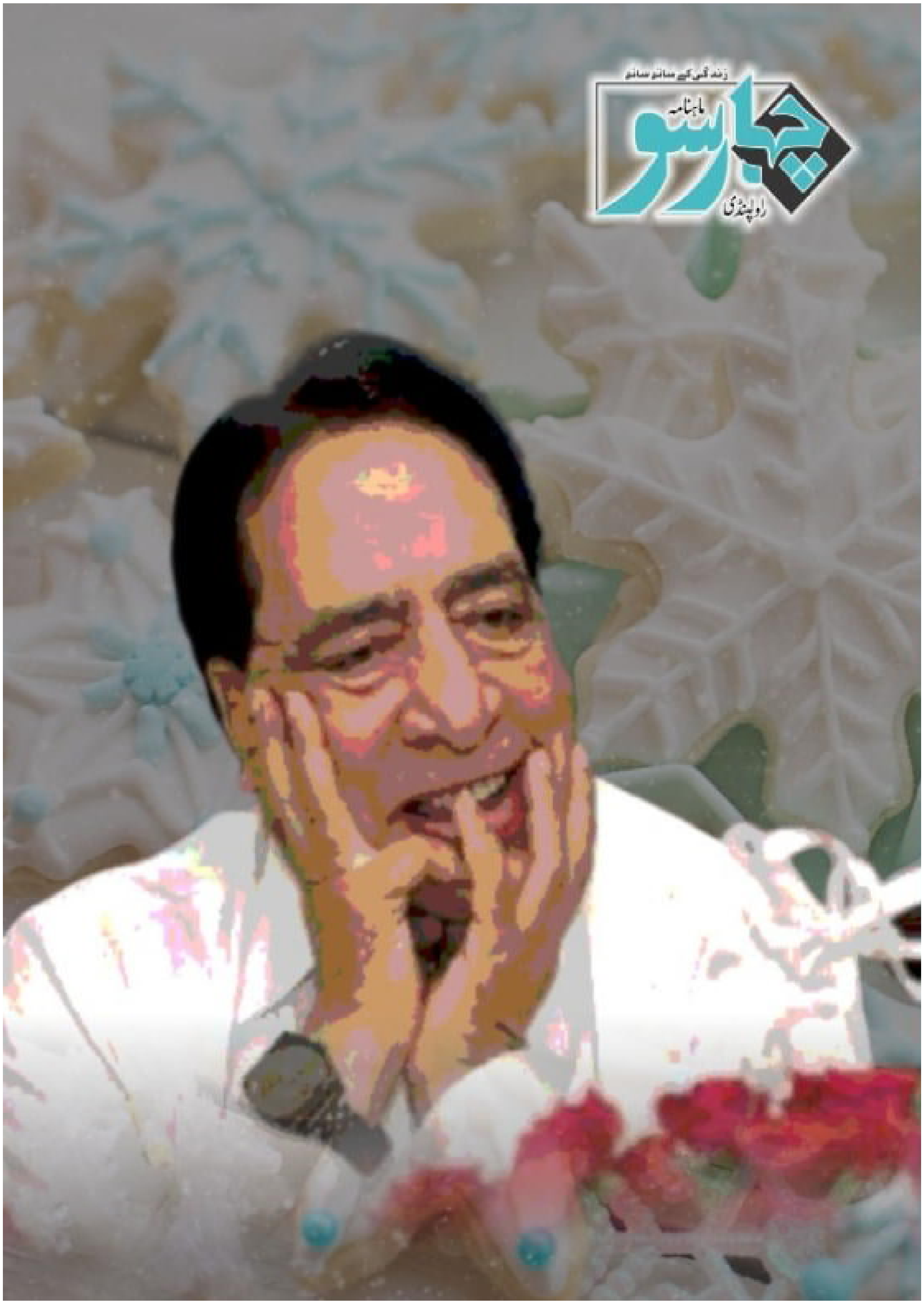
زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... بوم بسیرا ......

ظفر قریشی بھی کیا خوب لکھاری ہے، ترجمے کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے کے بعد اب اُس نے یہ ناول لکھا ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ناول لکھنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے تجربے، مشاہدے، مہارت اور فکر و فلسفے کے میدان کا شہ سوار ہونا ضروری ہوتا ہے مگر ناول کے بیانیے کو دلچسپ کہانی کا انداز دینے کے لیے ناول نگار کو ایک ایسے کرب سے گزرنا پڑتا ہے جو کسی حد تک خوش گوار بھی ہوتا ہے۔ اس کی مختصراً تفہیم یوں کر لیں کہ وہ بھیانک ترین واقعات کو بھی اتنے سہل اور خوبصورت انداز میں بیان کرتا ہے کہ وہ قاری کے ساتھ ساتھ خود بھی محظوظ ہوتا ہے۔ ظفر قریشی کا ناول ’’بوم بسیرا‘‘ ایسے ہی بے شمار ہولناک اور ہوش رُبا واقعات سے مزین ہے اور یہ واقعات صرف ایک ملک یا ایک خطے تک محدود نہیں بلکہ وہ امریکا اور برصغیر کے کئی ممالک کی بھی سیر کراتا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ ’’بوم بسیرا‘‘ کا مطالعہ کئی دنیاؤں کی سیر مفت میں کرا دیتا ہے۔ وہاں کی نیرنگیاں، نیرنگی ہائے سیاست، انسانوں کے اچھے برے رویے، ان کی مہربانیاں، خباثتیں، سازشیں، رہن سہن، کھانا پینا غرض ظفر اتنے پہلوؤں کا تذکرہ کرتا ہے کہ ہمیں ناول کی کہانیاں فلم کے پردے پر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ یہ تذکرے بڑی بے باکی سے کرتا ہے اور کہیں کہیں اس کے رویے میں تلخی بھی نظر آتی ہے۔ جو ہمارے خیال میں بے سبب نہیں ہے۔ البتہ مادر پدر آزاد ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اتنا محتاط ضرور رہتا ہے کہ ہم اسے جنسی اُبال کا نام ہرگز نہیں دے سکتے۔ ایک جگہ جدید ذرائع اطلاعات کا تذکرہ کرتا ہے تو ’’بوم بسیرا‘‘ ہمیں بہ قول ڈاکٹر ممتاز احمد خان یہ ناول ’’عالمی گاؤں‘‘ کی حقیقی صورت حال پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ’’بوم بسیرا‘‘ ظفر قریشی کے بہ قول یہ ناول ایک دیسی نوجوان کی کہانی ہے جو امریکا جا کر وہاں گم ہو گیا مگر اس نے اپنے وطن، اپنے وطن کے لوگوں، حالات اور اقدار سے ناتا بالکل نہیں توڑا، اپنے وطن کے حالات پر اس کا کرب اور پریشانی کا اظہار اس بات کے گواہ ہیں۔ اُس نے پوری سچائی کے ساتھ اپنے اور دوسرے معاشروں کی عکاسی کی ہے اور اگر میں ظفر قریشی کو ایک ناول نگار سے زیادہ حقیقت نگار کا درجہ دوں تو یہ قطعی غلط نہ ہوگا۔ یہ ناول اس نے اپنا جگر، خون کر کے لکھا ہے اور میں یہ بھی کہنے کی جرأت کروں گا کہ اب جدید ناول نگاروں میں ’’ظفر قریشی‘‘ کا نام بھی چمکتا دمکتا نظر آئے گا۔

...... **غلام محی الدین**

...... عدالتی روز و شب ......

ایسا نہیں کہ میرے دیگر بچوں میں صلاحیتوں کا فقدان رہا ہے بلکہ پسرم ریاض احمد ریاضؔ جو فیڈرل گورنمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ پر تھا بڑے عمدہ اشعار کہا کرتا تھا۔ اس کا مجموعہ کلام (گہر چنتا رہا) اعجاز احمد نے اس کی رحلت کے بعد ۲۰۱۳ء میں شائع کروایا لیکن اعجاز دیگر بچوں میں کچھ زیادہ ہی زرخیز ذہن رکھتا ہے۔ فنِ کتابت ہو کہ شاعری، علم موسیقی ہو کہ مصوری، اعجاز احمد ایک ہمہ گیر شخصیت بن کر سامنے آیا ہے۔ میں اس کے بچپن میں ہی اس کی صلاحیتیں بھانپ گیا تھا کہ یہ ضرور ترقی کی منازل طے کرے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اللہ رب العزت نے اسے جج جیسا منصب عطا کیا۔ شاعری کے فن سے نوازا اور اب میں اسے ملازمت سے (بحیثیت سیشن جج) ریٹائرمنٹ کے بعد کالم نگار کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ قبل ازیں اس کے کالموں کا مجموعہ (میزان عدل) مارکیٹ میں آچکا ہے اور اب اس کے کالموں کا دوسرا مجموعہ (عدالتی شب و روز۔ حصّہ اوّل) آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دُعا گو ہوں کہ اللہ کریم پسرم اعجاز احمد کے علمی و ادبی راستوں کو آسانیوں سے مزّین کر دے (آمین)۔ میں انتہائی خوش قسمت ہوں اور اللہ رب العزت کا لاکھ بار شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے پانچ بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے ہوئے انہیں اعلیٰ عہدوں پر سرفراز فرمایا۔

...... **چوہدری نبی احمد**

...... سہ ماہی مکالمہ ......

جناب مبین مرزا جس طور ادب کی ترتیب، تدوین اور ترسیل کی خدمت سنجیدگی، لگن اور پُر وقار طریق پر کر رہے ہیں وہ لائق تحسین بھی ہے اور لائق اعتبار بھی۔ مکالمہ ۵۶، ۵۷ اور ۵۸ ضخامت کے اعتبار سے کسی تبصرے کا حامل نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ کی مانند اس بار بھی سنجیدہ ادب کے قاری کو وہ سب کچھ فراہم کر رہا ہے جس کی توقع کسی بھی ضخیم ادبی مجلّے سے کی جاتی ہے مثلاً شمارہ ۵۶: ڈاکٹر اسلم انصاری، جناب فاروق خالد، ڈاکٹر حسن منظر، جناب رؤف خیر، جناب حمید شاہد، جناب جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، محترمہ عارفہ شمین طارق، جناب اصغر ندیم سید، جناب سرور الہدیٰ۔ شمارہ ۵۷: جناب افتخار عارف، محترمہ ذکیہ مشہدی، جناب حمزہ فاروقی، محترمہ حمیرا خلیق، محترمہ نجیبہ عارف، جناب صمد جاوید انور، جناب تقسیر حسن۔ شمارہ ۵۸: ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر تحسین فراقی، جناب حمزہ فاروق، محترمہ یاسمین حمید، جناب حسین مجروح، ڈاکٹر سید جعفری، جناب ہاشم خان جیسے ادب کے جید پارکھ ادب، شاعری اور تنقید کے حوالے سے نئے معنی و مفہوم اور زاویے وا کر رہے ہیں۔ قیمت فی شمارہ: ۳۰۰ روپے، دستیابی: آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی۔

...... **محمد انعام الحق**

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۱، شمارہ: مارچ، اپریل ۲۰۲۲ء

بانی مدیرِ اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت
○☆○
قارئینِ چہارسُو
○☆○
زرِسالانہ
○☆○
دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرِ مسؤل
گلزار جاوید
○☆○
مدیرانِ معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق
عروب شاہد
آمنہ علی

رابطہ: 537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔
فون: (+92)-51-8730633-8730433
موبائل: (+92)-336-0558618
ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

- متاعِ چہارسو -

سرِ ورق، پسِ ورق------شعیب حیدر زیدی
تزئین----------------عظمیٰ رشید
کمپوزنگ---------------محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

لب کشائی کے اعجاز---اعتبار ساجد، ثمینہ رحمت ۶
بادشاہ کون-------------عطاء الحق قاسمی ۷
حسن و لطافت کی بات-----تھارلڈ براسٹالسٹ ۸
وصیت نامہ-------------عطاء الحق قاسمی ۹
براہِ راست---------------گلزار جاوید ۱۱
عقیدوں کے پجاری---------عطیہ سکندر علی ۱۷
روزنِ دیوار سے---------ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۱
موثر و پیٹنٹ قلمکار----------کرنل محمد خان ۲۳
عطا کا سفر نامہ ----------احمد ندیم قاسمی ۲۵
لایا ہے تیرا شوق-----------مشتاق یوسفی ۲۶
کالم اور بالم--------------اشفاق احمد ۲۹
شوقِ آوارگی-------------ڈاکٹر سلیم اختر ۳۰
عرضِ حال---------------محمد خالد اختر ۳۲
شاعری میں حرفِ سادہ کا ہُنر---اختر حسین جعفری ۳۵
رب کا شکرادا کر بھائی--------صدیق سالک ۳۸
عطاء الحق قاسمی کے ڈرامے---------منشا یاد ۴۱
لفظوں کے زیروبم-------------فاری شا ۴۵
الٰہ دین کا چراغ-----------عطاء الحق قاسمی ۴۷

تشکیلِ کائنات

نسیم سحر، شاہد صدیقی۔ ۴۹

افسانے

فلٹرٹِپ----------------جمیل عثمان ۵۰
فیضانِ محبت -------------رینو بہل ۵۳
کھوٹا سکّہ----------------فیروز عالم ۵۷
سفر ہے شرط --------------قمر جمالی ۶۰
مٹی-----------------تابش خانزادہ ۶۴

برکندہِ دل

خواجہ میر درد، عبداللہ جاوید، آصف ثاقب، انتظار باقی، نوشی گیلانی، جاوید زیدی، رحمان فارس، آفتاب مضطر، فیصل عظیم، ڈاکٹر ریاض احمد۔ ۶۵

افسانے

دروازہ--------------آصف عمران ۷۰
کاغذات ------------محمد علیم اسماعیل ۷۶
سوراخ-------------ولاء جمال العسیلی ۷۸
نگاہِ حسرت-------------توصیف بریلوی ۸۰
سسٹم سے جنگ-----------ندیم راعی ۸۲

بچپن کی بگیا

نوید سروش، ارشد سعید، مادھو کوشک، جاناں ملک، مسعود جعفری، فہیم اختر، اصغر شمیم، فریاد آزر، احمد سوز، سیفی سرونجی، سبھاش گپتا شفیق، ذکی طارق بارہ بنکوی۔ ۸۴

ناول

خاکِ شفا-----------پیرزادہ آلِ انوار ۸۸

اُفق کے اُس پار

نیلا گلدستہ-------------ظفر قریشی ۹۴

دنیا میرے آگے

جھیل کنارے نیاگرا-----پروفیسر افتخار یوسف ۹۶

انگشتِ شہادت

ستیہ پال آنند، ایوب خاور، مامون ایمن، رضیہ اسماعیل، گل بخشالوی، قیصر نجفی، عدیل ہاشمی، سید شاہ حسین نہری، نزہت شاہ، وشال کھُلر۔ ۹۹

نشانِ راہ

ادھوراپن مکمل ہے----------پروین شیر ۱۰۶

آئینۂ فن

رعنا کوثر کی کہانی کے رنگ-------جمیل عثمان ۱۰۸
حمد میں دل کی بات کر لینا----------نسیم سحر ۱۱۰

وسعتِ بیکراں

اردو کی محبت میں----------محمد انعام الحق ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

انل بسواس -------------دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین---------وجیہہ الوقار ۱۱۷

قرطاسِ اعزاز
عطاء الحق قاسمی
کے نام

نام : عطاء الحق قاسمی
تاریخ پیدائش: یکم فروری ۱۹۴۳ء
موجودہ پیشہ : کالم نگاری
سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور۔

تصانیف:

☆ دنیا خوبصورت ہے ☆ ہنسنا رونا منع ہے
☆ عطایئے ☆ مزید گنجے فرشتے
☆ ’’شر‘‘ گوشیاں ☆ جرم ’’ظریفی‘‘
☆ وصیت نامے ☆ بلبلے
☆ دلی دور است ☆ شوق آوارگی
☆ گوروں کے دیس میں ☆ ملاقاتیں ادھوری ہیں
☆ ’’خند‘‘ مکرر ☆ ڈھول ڈھمّپا
☆ کالم تمام ☆ مجموعہ ہائے کتب

ڈرامہ سیریلز برائے ٹی وی

☆ خواجہ اینڈ سنز ☆ شب دیگ
☆ حویلی ☆ شیدہ ٹلی
☆ اپنے پرائے ☆ علی بابا چالیس چور
☆ ہر فن مولا ☆ سارے گامے

مناصب(Acknowledment)

☆ سابق سفیر پاکستان برائے ناروے، تھائی لینڈ۔
☆ چیئرمین بورڈ آف گورنرز، لاہور آرٹس کونسل (الحمراء) لاہور۔
☆ چیئرمین پنجاب لائبریری فاؤنڈیشن
☆ رکن کمیٹی برائے سول ایوارڈ، حکومت پنجاب، لاہور۔
☆ رکن رائٹر ویلفیئر فنڈز، حکومت پنجاب، لاہور۔
☆ رکن بورڈ آف گورنرز مجلس ادب، لاہور

ایوارڈ(Awards)

☆ ہلالِ امتیاز
☆ پرائیڈ آف پرفارمنس
☆ آدم جی ایوارڈ
☆ نیشنل بک ایوارڈ
☆ رشید احمد صدیقی ایوارڈ
☆ مجلس فروغ اردو ادب (دوحہ قطر) ایوارڈ

لب کشائی کے اعجاز

یہ عطائے خدا، صورت آدمی
نقش بھی آدمی، عکس بھی آدمی

لب کُشائی کے اعجاز کی دل کشی
حرفِ اظہار کی تازگی آدمی

’’روزن در سے‘‘ اس نے جہاں بینی کی
اس لیے سر بہ سر روشنی آدمی

یہ عمارت بنی ہے اُسی کے لیے
خشتِ اوّل کی بنیاد ہی آدمی

آدمیت سے ہٹ کر نہیں کوئی شے
نغمہ گر آدمی، نغمگی آدمی

اپنے انداز کی منفرد اک صدا
اپنے اسلوب کا آخری آدمی

اعتبار ساجد
(لاہور)

آنکھ سے بن کے اترا نمی قاسمی
دردمندی کی اک چاشنی قاسمی
ہے فرشتہ صفت آدمی قاسمی
لڑکھڑاتے ہوؤں کی چھڑی قاسمی

جیسے تیرا قلم ہے رواں قاسمی
ایسے لکھتا ہے کوئی کہاں قاسمی
خوش خیال و شگفتہ بیاں قاسمی
عہد اہل ستم کی زباں قاسمی
نسل نو پر سدا مہرباں قاسمی
سب کے سر پر تنا آسماں قاسمی
گلستاں ہے ترا گلستاں قاسمی
موسم گل ترا جاوداں قاسمی
اُلجھے رستے پہ ہر دم رواں قاسمی
پھر بھی ہے منزلوں کا نشاں قاسمی

اچھے لوگوں میں سب سے بھلا قاسمی
دکھ کی سولی پہ لٹکا ہوا قاسمی
جنگ اوروں کی لڑتا رہا قاسمی
کیوں نہ پائے پھر اس کی جزا قاسمی

تیرے رب نے نوازا تجھے بے حساب
تیرے آنگن میں کھلنے لگے ہیں گلاب
جب بھی ہو گا مرتب وفا کا نصاب
ہوگی شامل تری زندگی کی کتاب
آنکھ سے بن کے اترا نمی قاسمی
دردمندی کی اک چاشنی قاسمی
ہے فرشتہ صفت آدمی قاسمی
لڑکھڑاتے ہوؤں کی چھڑی قاسمی

ثمینہ رحمت منال
(یوکے)

بادشاہ کون ہے۔۔؟

عطاءالحق قاسمی

ہمارے ہاں بعض سیاستدان اپنے بارے میں مسلسل یہ تاثر دینے میں لگے رہتے ہیں کہ وہ امریکہ کے آدمی ہیں چنانچہ جب بھی فضا میں گھٹن ہوتی ہے یہ فلم پھنے خان میں مجھے خان کا کردار ادا کرنے والے علاؤالدین کی طرح اپنی قمیض کے دامن سے پنکھا کرتے ہوئے کہتے ہیں ''بڑی گرمی ہے'' اور اس دوران ان کے نیفے میں اڑسا ہوا ''امریکہ'' نظر آجاتا ہے، جس سے بے چارے دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ ایک اسی طرح کے پھنے خان سیاست دان سے میری ملاقات رہتی ہے۔ ایک دن کافی دیر تک مجھے یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ امریکہ کے آدمی ہیں اشاروں، کنایوں میں انہوں نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ تھوڑی دیر پہلے جو فون کی گھنٹی بجی تھی وہ صدر بائیڈن کی تھی۔ انہوں نے مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی کہ وہ ان دنوں صرف سگنل کے منتظر ہیں لیکن جب ان کے بارے میں میرا ایمان بالکل ڈانوا ڈول نہ ہوا تو انہوں نے مجھے ایک اور طرف سے آلیا۔ کہنے لگے یہ تو تم جانتے ہی ہوگے کہ پاکستان ایسے ترقی پذیر ملکوں میں کوئی حکومت امریکہ کی مرضی کے بغیر نہیں بنتی۔ میں نے کہا غالباً آپ ٹھیک کہتے ہیں پھر فرمانے لگے ''اور یہ بھی تمہیں معلوم ہوگا کہ کوئی حکومت امریکہ کی مرضی کے بغیر جاتی بھی نہیں، میں نے کہا غالباً آپ یہ بھی ٹھیک فرماتے ہیں پھر انہوں نے مجھے یہ شعر بھی سنایا۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

میں نے اس شعر پر داد دی تو کہنے لگے ''لوگ میرے بارے میں ایسے ہی افواہیں اڑاتے رہتے ہیں کہ میں امریکہ کا آدمی ہوں حالانکہ صدر بائیڈن سے میرے تعلقات محض ذاتی نوعیت کے ہیں اگر ہو سکے تو کبھی اپنے کالم میں میرے بارے میں یہ غلط تاثر دور کرنے کی کوشش کرنا۔ اس پر مجھے اپنے ایک شاعر دوست یاد آگئے۔ پہلے مجھے وہ اپنے بارے میں کوئی نہایت مضحکہ خیز سی خبر سناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ کہیں اس پر کالم نہ لکھ دینا اور جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ میں اس پر کالم ضرور لکھوں گا تو آخر میں وہ یہ درخواست کرتے ہیں چلو ٹھیک ہے کالم لکھ دینا لیکن یار کہیں ساتھ میری تصویر نہ چھاپ دینا اور پھر اگلے روز وہ مجھے کالم لکھنے پر برا بھلا کہتے ہیں اور اٹھتے اٹھتے اپنے حوالے سے ایک اور مضحکہ خیز خبر سناتے ہوئے کہتے ہیں ''میں جانتا ہوں تم کمینے آدمی ہو تم میرے روکنے سے بھی کالم لکھنے سے نہیں رکو گے۔ اور تم تصویر چھاپنے سے بھی باز نہیں آؤ گے۔ چلو اگر دوستوں کو ذلیل کر کے تمہیں خوشی ملتی ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں مگر تصویر یہ والی چھاپنا اور اس کے ساتھ وہ اپنی تازہ تصویر بھی عطا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ کالم نگار کے علاوہ کالم میں کسی اور کی تصویر شائع نہیں ہوتی۔

میں نے ابھی جس سیاست دان کا ذکر کیا ہے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں جنہیں پاکستان میں امریکہ کے ''نمائندہ خصوصی'' ہونے کا دعویٰ ہو اور وہ اس ''شہرت'' پر خوش ہوتے ہوں بلکہ ایسے کئی ''دانے'' ہمارے ہاں اور بھی ہیں، جو خود یا ان کے حواری ان کا نام بڑی طاقتوں سے نتھی کر کے ہم کمزور دلوں کو دہلاتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی اتنی رازداری سے کی گئی بات بچے بچے کی زبان پر آجاتی ہے مجھے یاد آیا جس طرح ہمارے ہاں سکھوں کے لطیفے مشہور ہیں۔ اسی طرح یورپ میں پولینڈ کے لوگوں کے لطیفے زبان زد عام و خاص ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ ایک ''سفارتی'' نمائندے کو بعض انتہائی اہم نوعیت کی دستاویزات حاصل کرنے کے لئے پولینڈ کے ایک جاسوس کے پاس بھیجا گیا جو سی آئی اے کے لئے کام کرتا تھا اور اس کا نام جارج تھا۔ کوڈ لفظ یہ دیا گیا کہ ''بڑی گرمی ہے'' چنانچہ جب یہ ''سفارتی'' نمائندہ لمبا سفر طے کر کے پولینڈ کے اس قصبے میں پہنچا جہاں وہ انتہائی خفیہ جاسوس رہتا تھا تو اس نے ایک بار میں داخل ہو کر شراب کا آرڈر دیا اور اسی دوران بار والے سے پوچھا ''یہاں جارج نام کا کوئی شخص رہتا ہے؟'' اس نے کہا ''جارج نام کے کئی لوگ اس قصبے میں رہتے ہیں ایک جارج لوہار ہے۔ ایک جارج ٹائپسٹ ہے۔ ایک جارج انجینئر ہے۔ حتیٰ کہ خود میرا نام بھی جارج ہے۔'' اس پر طویل سفر طے کر کے آنے والے شخص نے کہا ''بڑی گرمی ہے'' یہ سن کر بار والے نے کہا۔ ''اچھا اچھا تم جارج جاسوس کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔'' جن سیاست دانوں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بھی عالمی طاقتوں کے اتنے ہی خفیہ نمائندے ہیں کہ ان کے کوڈ خفیہ نہیں رہتے اور یوں بچہ بچہ ان سے واقف ہے، کیونکہ قمیض کے دامن سے پنکھا کرتے ہوئے یہ کوڈ وہ خود دہراتے ہیں کہ ''بڑی گرمی ہے'' جس سے علاقے میں ان کی ٹور بنی رہتی ہے۔ تاہم یہ خفیہ، اسی طرح کے ''خفیہ'' ہیں جس طرح کے ایک جلسے کا اعلان سردار جی کر رہے تھے کہ ''سجنو تے مترو! آج خالصوں کا خفیہ جلسہ فلاں جگہ پر فلاں خفیہ مقام پر فلاں وقت ہو رہا ہے، سارے مترو وہاں پہنچ جائیں۔''

اب اگر سنجیدگی سے اس مسئلے کے بارے میں میری رائے پوچھی جائے تو بات یہ ہے کہ جنگل ایک ہے بادشاہت کے خواہش مند بہت سے ہیں۔ جس کے پاس طاقت ہو وہ بادشاہ بن جاتا ہے، کیونکہ جنگل کا قانون بھی یہی ہے تاہم کبھی کبھی اس ضمن میں کوئی ''سانحہ'' بھی پیش آجاتا ہے۔ جنگل کا بادشاہ ایک روز سیر ہو کر اپنی کچھار سے نکلا۔ رستے میں اسے ایک لومڑی نظر آئی بادشاہ سلامت نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اوئے جنگل کا بادشاہ کون ہے؟'' لومڑی نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''حضور آپ جنگل کے بادشاہ ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک گیدڑ سامنے سے گزرا بادشاہ سلامت نے اسے گالی دے کر پاس بلایا اور کہا

باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ کیجیے

حُسن ولطافت کی بات

تھارلڈ براسٹالسٹ

(اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل وزارتِ خارجہ ناروے کی الوداعی تقریر)

ہزایکسی لینسز،
خواتین وحضرات!

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سفیر عزت مآب جناب عطاء الحق قاسمی کو الوداع کہنے کا وقت آ گیا ہے جو ہمارے عزیز دوست اور رفیق کار تھے۔

سفیر محترم! آپ نے دو سال کا عرصہ ہمارے ساتھ گزارا ہے اور مجھے پتہ ہے کہ یہ دو سال آپ کے لیے بڑی مصروفیت کے سال رہے ہیں۔ آپ نے ایک بین الاقوامی ٹیلی ویژن چینل کے افتتاح کے موقع پر اپنے ملک کے وزیر اعظم کو مدعو کیا اور ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیے۔

آپ کے اس دو سالہ قیام کے دوران ناروے اور پاکستان کے درمیان سیاسی مشاورت کے دو دور ہوئے، ان میں سے ایک دور کے دروان مجھے اپنے ملک کے وفد کی قیادت کا اعزاز حاصل ہوا اور اگر کوسووو کا بحران مانع نہ ہوتا تو اس سال کے شروع میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والے دوسرے دور میں جانے والے ناروے کے وفد کی سربراہی کا بھی اعزاز حاصل کرتا۔

آپ نے اپنی مدت قیام کے دوران دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور باہمی مفاہمت کو فروغ دیا۔ ناروے کی پارلیمنٹ کے ممبران، سیاست دانوں بشمول اوسلو کے میئر، اور دیگر اہل الرائے لوگوں کا پاکستان کا سفر اور اسی طرح کئی ایک پاکستانیوں کی ناروے آمد نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔

سفیر محترم! کبھی کبھی گہرے دوستوں کے درمیان بھی اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے لیکن دوست ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے پچھلے سال کے ایٹمی دھماکوں پر اور اس سال کے میزائل ٹسٹوں پر ہم نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی ہے۔ آپ کو اس بات کا فخر ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنی حکومت کا موقف اور استدلال واضح اور مربوط انداز میں ہمیں پیش کیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ بادل جلد ہی چھٹ جائیں گے اور ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان مکمل تعاون کی فضا بحال ہو جائے گی۔ یہ فضا تعاون کا ایک نیا میدان کھول دے گی جو کہ میں جانتا ہوں کہ ایک ادبی شخصیت ہونے کے ناطے آپ کو عزیز ہو گا، میری مراد ثقافت کے میدان میں تعاون سے ہے۔ پاکستان نے دو برس قبل اپنی آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی لیکن اس کی روایات ہزاروں سال پیچھے تک جاتی ہیں۔ ہم پاکستان کے قدیم ثقافتی ورثے کو گہری عزت اور توصیف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جب حُسن اور لطافت کی بات آتی ہے تو ہم پاکستان کی طرف تجسس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس کے پاس دنیا کو اس مد میں دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ آپ کی ناروے آمد کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہماری ترقیاتی تعاون کی وزیر کو پاکستانی عجائبات کی ایک نمائش کا افتتاح کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ عجائبات لوک ورثہ اسلام آباد سے لائے گئے تھے۔ اس کے چند دن بعد ثقافتی تعاون کی ایک یادداشت پر بھی دستخط ہوئے۔

مزید عملی پہلو کے لحاظ سے آپ نے ناروے اور پاکستان کے درمیان براہِ راست پرواز شروع کرنے کے سلسلے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

یہ بات بالکل قابلِ فہم ہے کہ بطور سفارت کار آپ کا یہاں پر زیادہ تر کام پاکستانی کمیونٹی اور پاکستانی تارکین وطن سے متعلق رہا ہے۔ یہ کام ہمارے باہمی تعلقات کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ترقی پذیر ممالک سے نقل مکانی کر کے آنے والے لوگوں میں پاکستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جبکہ مجموعی طور پر سب کے سب نقل مکانی کر کے کمیونٹی ناروے اور خاص کر نارویجین معاشرے کے لیے ایک قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتی ہے۔

سفیر محترم! آپ کی ناروے میں آپ کے دوستوں کو اور آپ کے رفقائے کار کو زبردست کمی محسوس ہو گی۔ آپ نے اس شہر کے سفارتی حلقے کو ایک روشنی بخشی ہے۔ اپنی ہمدردی اور شکر گزاری کے اظہار کی علامت کے طور پر میں آپ کو ایک شفاف گلدان آپ کے اوسلو میں گزرے ہوئے لمحات کی یادگار کے طور پر پیش کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہ دیکھنے میں خالی نظر آتا ہے لیکن یہ نیک خواہشات سے معمور ہے۔

خواتین وحضرات! میری آپ سب سے درخواست ہے کہ آپ سفیر پاکستان کے اعزاز میں میرے ساتھ ایک ٹوسٹ میں شرکت فرمائیں جس میں سفیر محترم اور اُن کی فیملی کے لیے ہماری طرف سے اُن کی صحت، خوشی اور ایک میدافزا مستقبل کے لیے ہماری تمام تر نیک خواہشات شامل ہوں۔

کفارہ

کہتے ہیں وہ کالمسٹ زندہ رہتے ہیں جن کے قاری انہیں ڈھونڈیں اور ہمارے کالمسٹ بھی اسی لیے زندہ ہیں کہ ان کے قاری نہیں ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن عطا اِن کا کفارہ ہے اس کے ہاں طنز کے کانٹے کے چُبھن بھی ہے مگر وہ نہیں جو کانٹا چبھتے وقت ہوتی ہے بلکہ وہ جو نکالتے وقت ہوتی ہے۔ مشاق احمد یوسفی کی تحریریں پڑھ کر لوگ مسکراتے ہیں ابن انشاء کی پڑھتے ہوئے مسکراتے ہیں جبکہ عطاء کی مسکراتے ہوئے پڑھتے ہیں۔

۔۔۔یونس بٹ

(پیرصاحب ہتھوڑا شریف کا)

وصیت نامہ

عطاء الحق قاسمی

نورِ نظر، لختِ جگر!

میرے قویٰ مضمحل ہوگئے ہیں، زندگی کا کوئی پتہ نہیں، اللہ جانتا ہے اور کتنے دن اس دنیا میں ہوں، لہٰذا چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تمہیں گدی نشینی کے آداب سے کماحقہٗ آگاہ کرتا جاؤں۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ تم اب تک میری صحبت میں ولایت کے اس درجے تک پہنچ چکے ہو جہاں میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا، اس کے باوجود کچھ کمی کوتاہی ہر انسان میں رہ جاتی ہے چنانچہ اسے دور کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ بیٹے! تم تو جانتے ہو میری بینائی بہت کمزور ہوگئی ہے چنانچہ بیعت کے لیے آنے والوں کو ٹٹول کر دیکھنا پڑتا ہے کہ ان میں سے عورت کون ہے اور مرد کون؟ لہٰذا پیشتر اس کے کہ کسی دن نظر کی یہ کمزوری کسی بڑے سانحہ کا سبب بنے میں تمہیں کچھ نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں تم انہیں میری وصیت سمجھ کر ان پر عمل کرنا!

پیارے بیٹے، ایک بات ہمیشہ یاد رکھو اور وہ یہ کہ ہم صرف پیر نہیں بلکہ روحانی اور دنیاوی طاقت کے سارے سرچشمے ہمارے قبضے میں ہیں یعنی ہم پیر بھی ہیں، سیاستدان بھی ہیں، حکمران بھی ہیں، اس کے علاوہ جاگیریں انگریز کے وقت سے ہمیں ملی ہوئی ہیں۔ یوں اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس ہے بنک بیلنس ہے، ڈھور ڈنگر ہیں، مرید ہیں۔ اس سب نعمتوں کی قدر کرو خصوصاً مریدوں کا خاص خیال رکھو کہ ہماری ساری شان و شوکت ان کے دم سے ہے، اگر وہ تمہارے ہاتھ چومنا چاہیں تو کسی بخل سے کام نہ لو۔ اگر تم اس وقت دوستوں سے مصروف گفتگو ہو تو بھی انہیں مایوس نہ کرو بلکہ اپنا بایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دو، وہ ہاتھ چومتے رہیں! تم باتیں کرتے رہو۔ ایسے مواقع پر تم انہیں لائن بنانے کے لیے کہو، وہ لائن میں آئیں اور ایک ایک کر کے ہاتھ چومتے جائیں، ان کے جانے کے بعد جیب سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ کو اچھی طرح صاف کر لیا کرو اور گھر پہنچتے ہی ڈیٹول سے ہاتھ دھونا بھی نہ بھولو۔ مریدوں کا اظہارِ عقیدت اپنی جگہ اور حفظانِ صحت کے اصول اپنی جگہ، دونوں کو کبھی گڈمڈ نہ کرو!

پیارے بیٹے'' مجھے پتا چلا ہے کہ تم گاؤں میں سکول کھولنے کی مخالفت کر رہے ہو اگر لوگ پڑھ لکھ گئے تو ہمیں کون پوچھے گا۔ بیٹے یہ کام نہ کرو اور یہ خیال بھی دل سے نکال دو کہ تعلیم عام ہونے سے لوگ آستانہ عالیہ ہتھوڑا شریف کا رخ نہیں کریں گے۔ بیٹے! جب تک ملک میں غربت ہے، بے روزگاری ہے، علاج معالجے کی سہولتیں نہیں ہیں، لوگوں کی انصاف تک رسائی نہیں ہے وہ لاکھ پڑھ لکھ جائیں، اپنی پریشانیوں کے ازالے کے لیے وہ بہرصورت ہمارے پاس ہی آئیں گے، ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے حصے کے بے وقوف پیدا کیے ہیں لہٰذا تمہیں اس ضمن میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں البتہ ایک ضروری کام کی طرف فی الفور توجہ دو اور وہ یہ کہ علامہ اقبال کے کلام سے لوگوں کو دور رکھنے کی کوشش کرو! یہ شاعری اگرچہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی عقیدت مند ہے مگر ان کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں:

کرگس کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے، اس نے اس رح کی اور بھی بہت سی باتیں کی ہیں مثلاً:

گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی

یا

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

وغیرہ۔ لہٰذا اپنے خادم خاص خدا بخش کمہار کو بلا کر بریف کرو کہ وہ اقبال کے خلاف مراقبوں اور مکاشفوں کو بنیاد بنا کر اپنی مہم تیز کرے، ویسے تمہارا خادمِ خاص خاصا بے وقوف آدمی ہے، مجھے ڈر ہے کہ کسی بزرگ کے فرضی مراقبے میں اقبال کو ڈانٹ پلانے کی بجائے یہ کوئی ایسی بات اس بزرگ سے منسوب نہ کر دے جس سے لوگوں کو یہ تاثر ملے کہ بزرگان دین بھی اقبال سے محبت کرتے ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ بے وقوف شخص تمہاری اولیائی پکی کرنے کے لیے تمہاری جو کرامتیں لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے ان میں سے بعض کرامتوں سے الٹا تمہارا امیج خراب ہوتا ہے۔ لہٰذا اقبال والا کام اس کے سپرد نہ کرنا۔ یہ کام میں خود کر لوں گا۔

بیٹے! تمہیں پتہ ہے میرے جوڑوں میں درد ہوتا ہے جس کے لیے حکیم نور دین نے موتی اور جواہرات کوٹ کر میرے لیے دوا تیار کی ہے مجھے حکیم صاحب نے بتایا کہ یہ نسخہ مہاراجہ پٹیالہ بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ تمہارے خادم خاص اللہ بخش کمہار نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ سے چوری چھپے تم بھی یہ دوا استعمال کر رہے ہو، بیٹے اس کے استعمال میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کی مقدار دال کے دانے سے بھی کم ہونی چاہیے اور ایک پاؤ مکھن میں لپیٹ کر کھانی چاہیے ورنہ تمہیں دسمبر کا مہینہ جولائی کے برابر محسوس ہوگا۔ مگر بیٹے تمہیں ابھی سے اس کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟

(۲)

پیارے بیٹے!

ایک اور نصیحت جو میں تمہیں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ انگریزوں اور اللہ کا دیا ہوا ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر اس کے باوجود جو مزید آ رہا ہو اسے آنے دینا چاہیے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب پہلی دفعہ بزرگوں کے سالانہ عرس پر تم نے مجھے گھونگھٹ نکالے بیٹھے دیکھا تو تمہیں میری

اس ہیبت کذائی پر بہت ہنسی آئی۔ اس کے بعد جب پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مریدوں نے یہ گھونگھٹ اٹھا کر میرے چہرہ پرنور کا دیدار کرنا شروع کیا اور اپنی محنت مزدوری کی کمائی ’’منہ دکھائی‘‘ کے طور پر میرے قدموں میں رکھنا شروع کی تو مجھے تمہارے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آئے جو الحمدللہ اب کم کم نظر آتے ہیں۔ میرے بیٹے اس قسم کے رحمدلانہ خیالات اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے کھرچ ڈالو، ان غریبوں کے بیمار بچوں کو ہم مفت دم کرتے ہیں، وہ اپنی پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے ہم سے دعا کراتے ہیں۔ جن کا کام ویسے ہی ہونا ہوتا ہے وہ اسے ہماری دعا کا کرشمہ قرار دیتے ہیں اور جن کا کام نہیں ہوتا وہ اسے اپنی کسی غلطی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ایسے بیوقوفوں پر رحم نہیں کرنا چاہیے۔

نورِ نظر میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ جب مریدین میرے چہرے کو چہرہ پرنور قرار دیتے ہیں تو تم بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہو۔ بیٹے! میرے چہرے کی سیاہی مائل رنگت صرف دنیا داروں کو نظر آتی ہے۔ عقیدت مندوں کو تو میرے چہرے کے گرد صرف نور کا ہالہ دکھائی دیتا ہے مگر یہ معرفت کی باتیں ہیں تمہیں آہستہ آہستہ سمجھ آئیں گی! ہاں ایک اور بات یاد آئی تم اپنے بچپن کے حوالے سے کسی کے سامنے اپنی زبان نہ کھولا کرو اور اگر کھولنی ہو تو صرف وہی باتیں بیان کرو جو تمہارے خادم خاص اللہ بخش کمہار نے تمہارے پیدائشی ولی ہونے کے حوالے سے پھیلا رکھی ہیں مثلاً تم یکم ربیع الاول کو پیدا ہوئے تھے اور پیدائش کے وقت تم درود پڑھ رہے تھے، جب تمہارے سونے کا وقت ہوتا تھا تو ایک ملکوتی سا نغمہ فضا میں پھیل جاتا تھا، یہ فرشتے تھے جو نظر نہیں آتے تھے اور اپنی آواز میں تمہیں لوری دے رہے ہوتے تھے۔ تمہاری پہلی سالگرہ پر ان فرشتوں نے ’’ہیپی برتھ ڈے ٹو یو‘‘ کا گیت بھی گایا تھا۔ اس موقع پر عرش معلیٰ سے ایک کیک بھی بھیجا گیا تھا۔ گھر والوں نے دیکھا کہ کیک کے پیس کیے جا رہے ہیں مگر نہ چھری نظر آتی تھی اور نہ کیک کاٹنے والا نظر آتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے خادم خاص اللہ بخش کمہار کو تمہارے بچپن کے حوالے سے کچھ اور روایات بھی یاد کرائی ہیں وہ تمہیں اس حوالے سے جلد بریف کرے گا۔ البتہ تمہارا دوست ناصر تمہارے بچپن کے حوالے سے بہت بے ہودہ باتیں لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، اسے منع کرو اگر وہ اپنا منہ بند نہیں کرتا تو مجھے بتاؤ تا کہ اس کا انتظام کیا جائے۔

خدا کے فضل و کرم سے تمہارے سمیت میری ساری اولاد آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہے۔ تم سب کلین شیو ہو۔ امریکہ اور یورپ کے بہترین فیشن ڈیزائنروں کے ڈیزائن کیے ہوئے سوٹ پہنتے ہو، اور روشن خیال ہو، تمہارے اسلام آباد اور لاہور کے گھروں میں مکسڈ (Mixed) پارٹیاں ہوتی ہیں لیکن میرے لیے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ عرس کے دنوں میں جب تم اپنے آبائی شہر آتے ہو تو لوگ تمہارے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں، برکت کے لیے اپنے سر پر تمہارا ہاتھ پھیرتے ہیں، تم سے دعا کے طالب ہوتے ہیں اور تم ان لمحوں میں ایک بالکل دوسرے روپ میں نظر آتے ہو۔ ان مواقع پر تمہاری آکسفورڈ یونیورسٹی تمہارے رستے میں حائل نہیں ہوتی۔ میرے نورِ نظر، میرے لختِ جگر یہ سلسلہ تمہاری اولاد اور پھر ان کی اولاد میں بھی چلنا چاہیے۔ انہیں بتانا کہ وہ بھی آکسفورڈ یونیورسٹی اور آستانہ عالیہ ہتھوڑا شریف کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھیں۔ آستانہ عالیہ کو آکسفورڈ کی تعلیم کی نذر نہ ہونے دیں۔ آستانۂ عالیہ سونے کی کان ہے اور ہماری بنیادی طاقت ہے، اسے ہاتھ سے کبھی نہ گنوانا!

تم یہی سوچ رہے ہو گے کہ یہ بڈھا کیا نصیحتیں کرنے بیٹھ گیا ہے مگر آخر میں صرف ایک اور نصیحت! گانا روح کی غذا ہے، کبھی سننے کو جی چاہے تو گانے والی کو اپنے ہاں بلا لیا کرو، وہ بھی ہماری عقیدت مند ہیں، وہ اسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہیں مگر مجھے پتہ چلا ہے کہ گزشتہ دنوں تم ایک اجنبی جگہ پر خود چلے گئے اور جب واپس آنے لگے تو اس نے کہا ’’پیسے؟‘‘ تم نے جواب میں کہا ’’اب تم سے پیسے لیتے تو ہم اچھے نہیں لگتے‘‘ اگرچہ تم نے بہت اچھے طریقے سے اسے احساس دلایا کہ ہم لینے والوں میں سے ہیں، دینے والوں میں نہیں، پھر بھی تمہیں ایسے کم ظرف کوٹھے پر نہیں جانا چاہیے تھا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔

تمہارا (بھی) باپ
پیر صاحب ہتھوڑا شریف

’’پورے شہر کی کہانی‘‘

عطاء الحق قاسمی کے مزاح کی اتنی زیادہ باریکیاں ہیں کہ ہم جیسے یک رُخے لوگ اُس کی تہوں کو نہیں سمجھ پاتے لیکن ’’غیر ملکی سیّاح کا سفرنامہ لاہور‘‘ میں ایک امبرسریا عطاء الحق قاسمی ایک لاہوری عطاء الحق قاسمی سے گلے ملا ہے۔ اگرچہ پہلی بار پی ٹی وی پر لاہور کی تہذیب وثقافت کی اندرونی زندگی کے رنگ عطاء الحق قاسمی نے خواجہ اینڈ سنز کے ذریعے اجاگر کیے تھے۔ لیکن اُس سے پہلے اشفاق احمد نے ’’اُچے بُرج لاہور دے‘‘ لکھا تھا۔ خواجہ اینڈ سنز اور اُچے برج لاہور دے کا موازنہ ہرگز مقصود نہیں لیکن فرق ضرور بتاتا ہے کہ اشفاق صاحب صرف ایک خاندان کی کہانی بیان کر رہے تھے جبکہ عطاء الحق قاسمی پورے شہر کی کہانی بتا رہے تھے۔ اُس تجربے کے بعد لاہور کی تہذیب کو محور بنا کر عطاء الحق قاسمی نے پاکستان کی قومی زندگی کے ساٹھ سالوں کے زخموں کو ایک غیر ملکی سیّاح کی نگاہ سے دیکھنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

۔۔۔اصغر ندیم سید

براہِ راست

عطاءالحق قاسمی پاکستانی سیاست، ادب، صحافت، تہذیب، تمدن اور مزاح کا ایسا نام ہے جنہیں ملّا واحدی سے لے کر دورِ جدید کے تمام مزاح نگاروں کے مقابل ترازو کے پلڑے میں تولا جائے تو اپنی گوناگوں خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ عطاءالحق قاسمی کے پلڑے کا وزن نہ صرف زیادہ بلکہ اس قدر زیادہ ہوگا کہ مذکورہ بالا مزاح کے جانباز سپاہی کے بجائے جاں بلب سپاہی نظر آئیں گے۔ آپ کو اختیار ہے آپ عطاءالحق قاسمی کو سو (۱۰۰) میں سے جتنے دل چاہے نمبر دیجیے مگر جب بات عطاء کے مزاح کی آئے گی تو آپ سو فیصد کے بجائے دوسو فیصد ہنسی کو دانتوں سے خارج کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

زیرِ نظر صفحات عطاءالحق قاسمی کی شخصیت کو محفوظ اور مقید کرنے کی قطعی طور پر ناکام کوشش ہے۔ ہر چند اس کوشش کو آخری قرار نہیں دیا جاسکتا بقول شاعر:

ہم نہ ہوں گے تو کوئی ہم سا ہوگا

......گلزار جاوید

☆ آباؤاجداد مسجد میں پیدا ہوئے، وفات بھی مسجد میں پائی اس کے باوجود ہم مولانا عطاءالحق قاسمی کے بجائے مسٹر عطاءالحق قاسمی سے مخاطب ہیں؟

☆☆ بات دراصل یہ ہے کہ میرے والد صاحب اور میں نہ مسجد میں پیدا ہوئے اور نہ ہی مسجد میں وفات پائی۔ میری پرورش دینی ماحول میں ہوئی۔ الحمدللہ میری شخصیت میں اُس کا اثر آج بھی موجود ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آدمی کی ظاہری وضع قطع اُس کی تعلیم، تربیت کے عین مطابق ہو۔

☆ بظاہر ملحد بہ باطن مومن بتلانے والے آپ کو خوش کر رہے ہیں یا زمانے کو مطمئن؟

☆☆ بظاہر ملحد بہ باطن مومن بتلانے والوں سے نہ خوش ہوں نہ ناراض۔ الحمدللہ میرا ظاہر اور باطن ایک ہی ہے۔

☆ کچھ روداد امریکہ سدھارنے کی بتلایئے ازاں بعد اُس امریکی دوشیزہ سے تعارف بھی ضروری ہے جو آپ کو شادی کی پیشکش کر بیٹھی اور بیل منڈھے نہ چڑھنے کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ یہ لمبی کہانی ہے۔ ایک ایک کر کے میرے سارے دوست امریکہ سدھار گئے کیونکہ وہ صاحب حیثیت لوگوں کی اولاد تھے۔ زادِ راہ اور ٹکٹ وغیرہ اُن کے لیے کوئی مسلہ نہ تھا۔ پہلے تو میں گومگو کی کیفیت سے دوچار رہا کیونکہ میرے پاس ٹکٹ خریدنے اور سفری اخراجات کے لیے پیسے نہ تھے۔ پھر ایک دن میں نے کمر کس لی۔ میرے پاس ففٹی سی سی ہنڈا موٹرسائیکل تھی جسے میں نے پندرہ سو روپے میں فروخت کر دیا۔ کچھ پیسے بڑے بھائی اور کچھ والد صاحب سے لیے اس طرح میرے پاس چھ ہزار پاکستانی روپے یعنی چھ سو امریکی ڈالر جمع ہو گئے۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ والد صاحب نے خاصی ردوقدح کے بعد میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے اجازت دی تھی۔ اُس کے بعد میرا ایک دوست استنبول جا رہا تھا کیونکہ وہ وہیں رہتا تھا۔ میرے دوست نے کہا کہ اگر تم پسند کرو تو دونوں ساتھ چلتے ہیں۔ میرے پاس دوسرا کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا ہم دونوں لاہور سے پشاور بس کے ذریعہ اور پشاور سے کابل جہاز کے وسیلے سے پہنچ گئے۔ کابل سے لکسمبرگ تک ہم دونوں نے بس، ٹرک اور ٹرین کے ذریعہ سفر کیا وہاں سے ہم نے ایک سستی ائیرلائن کا ٹکٹ لیا اور نیویارک پہنچ گئے۔ نیویارک پہنچنے کے بعد بھی میری جیب میں ایک سو ڈالر باقی تھے جس سے آپ میری کفایت شعاری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک مختلف طرح کے کام کرنے کے بعد گھر کی یاد ستانے لگی چنانچہ میں نے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے یعنی امریکی دوشیزہ سے شادی کی ہے تو پاکستان سے روانگی کے وقت میں نے اپنی بہنوں سے وعدہ کیا تھا کہ میں پاکستان سے باہر کسی صورت شادی نہیں کروں گا۔ شاید یہ ہی وجہ ہوگی امریکی دوشیزہ سے شادی نہ کرنے کی۔

☆ بقول خالد اختر ''روزن دیوار'' میں بہادری اور جرأت کے جوہر دکھانے والا ہر وقت لیکچرری چھین جانے کے خوف میں بتلا رہا کرتا؟

☆☆ میرے خیال میں محمد خالد اختر نے یہ بات کبھی نہیں کی۔

☆ دوسرے حلقوں کے مطابق آپ کا عمل دانستہ طور پر جیل جانا اور شہرت حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھا؟

☆☆ ایک مرتبہ وزارت تعلیم سے میرے نام خط آیا تھا کہ آپ کالم نگاری بند کر دیں۔ میں نے وہ خط مجید نظامی صاحب کو دکھایا تو نظامی صاحب بولے آپ اس خط کے بعد کالم لکھنے کی صورت میں ردِعمل بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ جواب میں، میں نے نظامی صاحب سے کہا جی بالکل تیار ہوں۔ تو پھر لکھتے رہیے نظامی صاحب نے دوٹوک جواب دے کر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

☆ آپ کی تحریر میں پڑھنے والے کے لیے کشش، کشف اور کرامات بتلانے والے آپ کی کسی مخفی طاقت یا خوبی کی نشاندہی تو نہیں فرمارہے؟

☆☆ میرے خیال میں اس کا جواب دینا ذرا مشکل ہے۔ میں نے کبھی اپنے کسی عمل سے اس طرح کا کوئی تاثر نہیں دیا۔ چونکہ میرا تعلق پیروں کے خانوادے اور تصوف و پیری و مریدی سے ہے اور یہ سلسلہ گذشتہ ایک ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے۔ دوست احباب اُسی کے پیش نظر پیرومرشد، اُستاد محترم کہتے اور کبھی کبھار تو ہاتھ بھی چوم لیتے ہیں۔

☆ پابلو پکاسو نے جیمز جوائس کے بارے کہا تھا کہ وہ ایسا ابہام پسند ہے جس کے لفظ کو کرۂ ارض کا ہر فرد بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اگر اسی سوال کو آپ کی جانب لڑھکا دیا جائے تو بات مکمل نہیں ہو جاتی؟

☆☆ بالکل سہی کہا آپ نے کیونکہ میں جو لکھتا ہوں ابہام تو نہیں کہہ سکتے اُسے البتہ سمبالک ضرور کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بھٹو کے زمانے میں، میں نے بہت سخت کالم لکھے اُن کے خلاف۔ ایک کالم کا عنوان مجھے یاد بھی آرہا ہے ''ہیرو، کامیڈین، ولن'' ساتھ ہی فلمی اداکار اسلم پرویز کی تصویر کے ساتھ ذیلی سرخی بھی لگادی تھی ''فلمی دنیا'' اسلم پرویز ہیرو کے طور پر ناکام ہوئے تو مزاحیہ کردار ادا کرنے لگے۔ وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو ولن بن گئے۔ اسلم پرویز اور اُن کے ساتھی وہ سب کچھ کرتے دکھائی دیتے جو ہمارے ہاں ولن کا خاصا ہے یعنی لڑائی، مارکٹائی، اغوا وغیرہ۔ ایک بار پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر کو ڈنڈے بھی مارے گئے۔ پورے کالم میں ایک بار بھی بھٹو صاحب کا نام نہیں لیا گیا۔ مگر جب دوسرے دن میں دفتر سے باہر آیا تو ایک ریڑھی والے نے کہا ''قاسمی صاحب آج تے تسی پیپلز پارٹی نال بڑی بُری کیتی۔'' یہاں میں پروفیسر وارث میر کی رائے ضرور آپ سے شیئر کرنا چاہوں گا:

''عطاالحق قاسمی کے کالم کی ابتداء میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی نیم روشن راہ داری سے گزر رہے ہوں مگر جب کالم کے اختتام تک پہنچتے ہیں تو ایک ہزار واٹ کا بلب روشن ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ تمام راستے اور راہ داریاں روشن ہو جاتی ہیں جن پر تاریکی کا گمان ہوتا ہے۔''

☆ افلاطون کی محبت میں آپ کب اور کیونکر گرفتار ہوئے اور احباب کو بے لباس کرنے کا شوق کس بنا پر اختیار کیا؟

☆☆ نہ تو میں افلاطون کی محبت میں کبھی گرفتار رہا نہ احباب کو بے لباس کرنے کے شوقِ فضول سے مجھے کوئی دلچسپی ہے بلکہ میرے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی کا قول ہے ''عطاالحق قاسمی کسی شخص کی چمڑی ادھیڑنے پر آمادہ ہوں تو اس قدر نزاکت اور نفاست سے یہ کام کرتے ہیں کہ جس کی چمڑی اُدھڑ رہی ہو تو وہ بھی ان کا شکریہ ادا کرنے لگتا ہے۔''

☆ قاسمی صاحب اُن آنسوؤں کی بابت روشنی ڈالئے جن کا ذکر جاوید چوہدری نے اپنے کالم میں کیا ہے؟

☆☆ میں قطعی طور پر لاعلم ہوں کہ جاوید چودھری صاحب نے اپنے کالم میں میرے کن آنسوؤں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں زندگی میں دوبار دھاڑیں مار کر رویا ہوں ایک عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے دوران اور ایک ابّا جی کی وفات پر۔ جب ابّا جی مرحوم کی یاد آتی ہے تو میرے لیے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ لگے ہاتھوں اُن تراکیب کی بابت بھی باخبر کر دیجیے جو جاوید چوہدری کی سمجھ سے بالاتر ہیں؟

☆☆ بندہ پرور اگر آپ اپنے سوال کے ہمراہ جاوید چودھری صاحب کے مذکورہ کالم کی فوٹو کاپی ارسال کر دیتے تو میرے لیے جواب دینا آسان ہو جاتا۔ اندھیرے میں تیر چلانے کا نہ میں شوقین ہوں اور نہ مجھے یہ کام آتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں مبالغہ انتہاؤں پر نظر آتا ہے۔ بھلا کوئی باپ بیمار اولاد کے لیے کفن، اگربتی، لوبان، پھول اور دیگوں وغیرہ کا اہتمام کیونکر کر سکتا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں یہ سوال حقیقت سے زیادہ مبالغہ پر مبنی ہے۔ میں نے تو کسی محفل میں صرف اتنا کہا تھا کہ میں جب چند ماہ کا تھا، شدید بیمار ہوا اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ یہ بچّہ اب چند گھنٹوں کا مہمان ہے تو ابّا جی مرحوم پریشانی کے عالم میں گورکن کے پاس جا پہنچے تھے۔ ویسے ایک بات ضرور ہے کہ میرے والد صاحب کے مزاج میں عجلت کا عنصر تھا ضرور۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ آپ کے کالموں میں جس قدر پند و نصائح ہوتا ہے عملی زندگی میں آپ اُس سے قطعی برعکس عمل کے مالک ہیں؟

☆☆ جناب والا اگر حوالے کے طور پر آپ چند مثالیں درج کر دیتے تو قاری کے لیے آسانی ہو جاتی۔ آپ مجھے یہ بتلایئے کونسا ادیب، شاعر یا صحافی ایسا ہے جو پند و نصاح نہیں کرتا۔ میں پند و نصائح ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا۔ ایک تو ہوتے ہیں واعظانہ پند و نصاح ایک پند و نصاح آپ فن پارے سے خود اخذ کرتے ہیں۔ سو جناب میرا معاملہ اس سے زیادہ کا قطعی نہیں ہے۔

☆ محمد طفیل مرحوم یہ جاننے کے بہت شائق تھے کہ آپ صحافی ہیں یا ادیب ہم تک پہنچتے پہنچتے شاعر، نقاد، محقق، مزاح نگار بھی اشتیاق میں شامل ہو گئے؟

☆☆ جناب عالی! میں محقق اور نقاد تو قطعی طور پر نہیں ہوں میں شاعر اور مزاح نگار ہوں۔ میرے تمام ڈرامے 'خواجہ اینڈ سنز''، ''شب دیگ''، ''ہر فن مولا'' اور کالم مزاح پر مبنی نہیں ہوتے ہیں اگر غلطی سے کبھی سنجیدہ کالم لکھا بھی جائے تو میں اُسے اپنی کتاب میں شامل نہیں کرتا۔ مجھے علم ہے کہ اخبار کی فقط ایک روزہ زندگی ہوتی ہے۔ اُس کے بعد وہ پکوڑے بیچنے کے کام آتا ہے۔

☆ ڈاکٹر عبداللہ کی رائے کے مطابق آپ شخصیات سے زیادہ کرداری نمو پر کالم لکھنا پسند کرتے ہیں؟

☆☆ ڈاکٹر سید عبداللہ میرے اُستاد تھے اور میرے لیے بے پناہ قابل

احترام ہیں۔ اپنے اُستاد کی رائے سے اختلاف کی جرأت میرے اندر نہیں ہے۔

☆ آپ کے قلم کی کاٹ کو بلیڈ سے تشبیہہ دینے والے محمد طفیل آج زندہ ہوتے تو کتنے بلیڈ، کتنی دھاریں کی سرخی پر زور ضرور دیتے؟

☆☆ طفیل صاحب سہی سمجھے، میں بظاہر کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتا ہوں۔ بلیڈ والی دھار ہی ہوتی ہے کہ آخر چاقو چھریاں بنانے والے شہر وزیر آباد سے میرا تعلق ہے۔

☆ اردو ادب کا قاری آپ کو صحافی اور مزاح نگار کے طور جانتا اور مانتا ہے مگر آپ کے سر سفرنامے کے موجد کا الزام منڈھ کے بہت سے سینئر سفرنامہ نگاروں پر آپ کو فوقیت دینے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے یا کرائی گئی ہے؟

☆☆ برادرِ عزیز اگر آپ اس بات کی نشان دہی کر دیں کہ یہ بات کب، کہاں اور کس نے کہی تو آپ کی بہت عنایت ہوگی اور میری خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ میں نے تو جب احمد ندیم قاسمی صاحب کو اشاعت کی غرض سے سفرنامہ ارسال کیا تو کئی ہفتے اُن کی طرف جانے سے کتراتا رہا۔ مبادا، ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ اُس کے بعد چند دوستوں نے جب اس سفرنامے کے جملے اور واقعات پر پسندیدگی کا اظہار کیا تو میں بہت حیران ہوا۔ میں نے دوستوں سے دریافت کیا کہ ابھی تو میرا سفرنامہ شائع بھی نہیں ہوا پھر آپ تک کیونکر پہنچ گیا۔ دوست بولا آج کل قاسمی صاحب آپ کا سفرنامہ لیے بیٹھے ہوتے ہیں اور آنے جانے والے احباب کو دلچسپی سے سنایا کرتے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد میرا اعتماد بحال ہوا تو میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی قدم بوسی کو گیا۔ قاسمی صاحب نے میری توقع سے بڑھ کر سفرنامے کی تعریف کی تو میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ اُس کے بعد محمد سلیم الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے انگریزی کالموں میں میرے سفرنامے کو سراہا تو ایک طرح سے بطور سفرنامہ نگار میری شناخت ہونے لگی۔

☆ آپ کے کالموں میں اکثر مغرب کے اولڈ ایج ہومز کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے مگر مشرق میں لاکھوں، کروڑوں بزرگوں کا، بیٹوں اور بہوؤں کے ہاتھوں استحصال پر کبھی ایک لفظ نظر سے نہیں گزرا؟

☆☆ اولڈ ایج ہومز کے بارے میں میرے سفرنامے ’’شوقِ آوارگی‘‘ میں مَیں نے تفصیل سے لکھا ہے، اس کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہیں لکھا یا نہیں۔

☆ جب کوئی تحریر کسی سانچے میں نہیں ڈھلتی تو ’’کالم‘‘ بن جاتی ہے۔ یہ رائے تو سراسر بلکہ براہِ راست کالم نگاروں پر دست درازی کے زمرے میں آنی چاہیے؟

☆☆ یہ سوال قطعی طور پر تمام کالم نگاروں پر دست درازی کے زمرے میں آتا ہے۔ کالم لکھا نہیں جاتا بلکہ کالم خود کو لکھواتا ہے۔ میرے خیال میں کالم لکھنا ایک طرح سے دریا کو کوزے میں بند کرنے کے برابر ہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو پیدائشی طور پر کالم نگار ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں کالم بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ کالم کے نام پر تجزیہ ہو سکتا ہے مضمون ہو سکتا ہے کالم نہیں ہوتا۔ کالم ایک ذاتی تاثر ہوتا ہے جس میں کالم نگار کو آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔

☆ اگر کوئی استاد اپنے شاگرد کے بارے رائے دے تو وہ استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ کے اُستاد ڈاکٹر عبداللہ آپ کے بارے اپنی خامیاں چھپانے کی بابت نشان دہی کر رہے ہیں؟

☆☆ گلزار بھائی! معذرت چاہتا ہوں مجھے آپ کا یہ سوال قطعی طور پر سمجھ نہیں آیا۔ اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔ ہوتا بھی تو اُستادِ محترم کی رائے سے کسی بھی طرح کے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

☆ آپ کے قارئین کی معقول تعداد کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ کے کالم، فکاہیے، سفرنامے، انشائیے اور رپورتاژ ایک ہی طرح کے طنز و مزاح کے باعث یکساں معلوم ہوتے ہیں۔

☆☆ دیکھئے جی سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ہونا ضروری ہے کہ میں انشائیہ لکھتا ہوں نہ رپورتاژ وغیرہ میں مزاح لکھتا ہوں چاہے وہ سفرنامے میں ہو یا کالم میں۔ ہر تخلیق کار کا اپنا انداز ہوتا ہے میں بھی اپنے انداز کا مزاح لکھتا ہوں۔ اُس میں مختلف رنگ اور انداز ڈالنا کم از کم میرے بس سے باہر ہے۔

☆ آپ کے ڈراموں میں پسے ہوئے لوگوں کو نمایاں کرنا اچھی بات ہے مگر برائیاں، گھپلے اور گھٹالے تو سب اوپر والے کر رہے ہیں۔ اُن کی بابت آپ کی خاموشی ہر صاحب دل کو بہت کھَلتی ہے؟

☆☆ بھائی اب میں آپ سے کیا کہوں میرے ڈرامے اور کالم میں مزاح کے اندر چھپا طنز آپ کی نذر سے شاید نہیں گزرا ورنہ آپ اس طرح کا سوال نہ اُٹھاتے۔ میری تو پوری زندگی ہی احتجاج کرتے، لکھتے گزری ہے۔ ایوب خان کے دور میں، میں نے لاٹھیاں کھائی، بھٹو کے دور میں مطعون ٹھہرا۔ مشرف کے دور میں نشانے پر رہا۔ گھر والے میرے اس عمل پر اکثر تشویش کا اظہار کرتے اور میری نسبت فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ آپ کی تسلی کے لیے عرض کر دوں کہ حکمرانوں پر جتنی تنقید میں نے کی ہے شاید کسی اور کالم نگار نے نہ کی ہو۔ میں نے تو ’’بارہ سنگھے‘‘ لکھا ہے جس کی تقریب رونمائی کی صدارت مرحوم نواب زادہ نصراللہ خان نے کی تھی۔

☆ اختر حسین جعفری مرحوم نے بجا طور پر جدت پسندوں کی تخلیق اور تنقید کی گرفت کی ہے مگر جب ہم آج کی صورت حال پر نظر دوڑاتے ہیں تو آوے کا آوا ہی بگڑا نظر آتا ہے؟

☆☆ اتنا بھی نہیں بگڑا جتنا اس سوال میں نظر آ رہا ہے۔ میرے خیال میں آج کل کافی بہتر تنقید لکھی جا رہی ہے۔ ادب کی دیگر اصناف میں بھی پہلے کی نسبت کافی ہمہ رنگی موجود ہے لہٰذا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

☆ نظم کے شاعروں کا ہماری نظر سے جب بھی گزر ہوا عطاء الحق قاسمی کبھی دکھائی نہیں دئے مگر اختر حسین جعفری صاحب آپ کو نظم کی سمت درست

کرنے اور منزل تک پہنچانے کا کریڈٹ بڑے اعتماد کے ساتھ دے رہے ہیں؟

☆☆ بات یہ ہے جانِ بردار، میں نے کُل چار یا پانچ نظمیں لکھی ہیں۔ جہاں تک اختر حسین جعفری صاحب کی رائے کا تعلق ہے اگر انہوں نے اس قسم کی رائے دی ہے تو یہ اُن کی محبت ہے میں اس کا بھی اُسی طرح احترام کرتا ہوں جس طرح اختر حسین جعفری صاحب کا کرتا ہوں۔

☆ تھوڑی بہت صوتی رعائتیں اور آزاد تلازمے تن آسانی کے زمرے میں شمار کرنے والے آپ کے دوست ہیں یا بدخواہ؟

☆☆ افسوس صد افسوس، آپ کا یہ سوال بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ جو شخص ایمانداری سے چار یا پانچ نظمیں تحریر کرنے کا اقرار کرتا ہو اُس شخص سے اس طرح کے سوال کی ضرورت نہیں رہتی۔

☆ آپ کے خیال میں اردو شاعری میں کتنے شاعر پانچ غزلوں پر روٹیاں پیٹ رہے ہیں۔ آپ کا شمار کس طرف کیا جانا چاہیے؟

☆☆ میں تو ایک بات اکثر کہا کرتا ہوں کہ بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو عوام اور خواص میں مبتلا ہو۔ اُس کی شاعری معیار کے ساتھ مقدار میں بھی زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اس حوالے سے مولانا روم، شیخ سعدی، اقبال اور میر تقی میر کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اپنی بات کا پس منظر بیان کرنے کے لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں بڑے سے بڑے شاعر کے کلام سے دس غزلیں، دس نظمیں یا افسانہ نگار کے دس افسانے اعلیٰ پایہ کے ہوں تو مذکورہ تخلیق کار اعلیٰ نمبروں سے پاس قرار دیا جائے گا۔ غزل کے حوالے سے میرے خیال میں ٹھہراؤ محسوس کیا جاتا ہے ایک سے مضامین اور ایک سے خیال کے باعث غزل کا سفر کسی قدر سست روی کا شکار ہے۔ آج کل اُس طرح کے شاعر کم کم دستیاب ہیں جو صرف ایک شعر کے حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

دیوار کیا گری میرے کچّے مکان کی
لوگو نے میرے صحن سے رستے بنا لیے

☆ انتظار حسین صاحب نے چوہوں کے درمیان زندگی گزارنے کی بات کسی خاص سمت اشارہ کرنے کی غرض سے تو نہیں کی؟

☆☆ نہیں جناب قطعی نہیں جب کوئی تخلیق کار چوہے کی بات کرتا ہے تو وہ پورے معاشرے کی نسبت کرتا ہے۔ خود میں نے بھی بہت سے تمثالی کالم لکھے ہیں۔

☆ قیام پاکستان کے بعد بہت سے نظریے اور فلسفے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ مثلاً کبھی آپ کو ترقی پسند بتلایا جاتا ہے کبھی جدت پسند اور کبھی اسلام کا سپاہی وغیرہ۔ اس گتھی کو آپ ہی بہتر طریق پر سلجھا سکتے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں، میں آخری آدمی ہوں گا اگر اس گتھی کو سلجھا سکا۔

☆ بلاشبہ نصف صدی سے اوپر قلمی خدمات میں آپ نے کافی کچھ لکھا اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ کے احباب نے بھی آپ کی تحسین میں کمی نہ چھوڑی مگر بات واہ واہ، سبحان اللہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کسی نے کبھی ایک لفظ آپ کے یا آپ کی تحریر کے رد میں نہیں لکھا؟

☆☆ جانِ برادر! آپ سے اس بے خبری کی کم از کم مجھے اُمید نہ تھی۔ حضور میرے اور میرے فن کے بارے پانچ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک صاحب میری شخصیت و فن پر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور دوسرے صاحب کر رہے ہیں۔ کوئی مواد دستیاب ہوگا تبھی پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں جتنا میرے بارے لکھا گیا کم کم لوگوں کے بارے لکھا جاتا ہے۔

☆ آپ جیسے ہمہ جہت قلم کار کم کم پیدا ہوتے ہیں مگر تاریخ ادب میں یاد بھی کم کم ہی رکھے جاتے ہیں۔ بات اگر بڑے ادب کی، کی جائے تو آپ کے کس وصف اور صنف کو تاریخ بڑے ادب میں شمار کرے گی یا کرنا چاہیے؟

☆☆ بطور مزاح نگار مجھے کسی حلقے سے قطعاً کوئی شکایت نہیں۔ مشتاق احمد یوسفی صاب سے بڑا مزاح نگار کون ہو سکتا ہے۔ یوسفی صاحب نے کہا کہ آج کے دور کا سب سے بڑا مزاح نگار عطاالحق قاسمی ہے۔ یوسفی صاحب کا ایک واقعہ سُن لیجیے!

ایک بار میں نے یوسفی صاحب سے کہا کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یوسفی صاحب ’’آپ ذرا توقف کیجیے‘‘ کہہ کر اندر گئے اور جب واپس تشریف لائے تو اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کے بے شمار صفحات پر جگہ جگہ جملے نشان زد کیے گئے تھے۔ آپ جانتے ہیں وہ کون سی کتاب تھی؟ جناب وہ اس بندۂ ناچیز عطاالحق قاسمی کی کتاب ’’کالم تمام‘‘ دکھاتے ہوئے گویا ہوئے ’’اس کیفیت میں، میں یہ کتاب پڑھتا ہوں‘‘۔

☆ بہت سے لوگ سفر اور حضر میں آپ کی ناسازی طبع کی نسبت بھی کچھ کہے اَن کہے قصے سنا کر مضحکہ خیز صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟

☆☆ ’’ایک مرتبہ میرے ایک مداح بیرون ملک سے تشریف لائے تو اپنے سفری بیگ سے ولایتی شراب کی بوتل نکال کر میری طرف بڑھانے لگے۔ میں نے کہا ’’یہ کیا ہے‘‘ بولے ’’شراب‘‘ میں پھر گویا ہوا ’’اس کا کیا کروں‘‘ بولے ’’جو سب کرتے ہیں‘‘ میں نے عرض کیا ’’جناب میں شراب نہیں پیتا‘‘ مشکوک نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولے ’’نہیں پیتے تو نا پیجیۓ کسی پینے والے دوست کو تحفے میں دے دیجیۓ گا۔‘‘

مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے دوست کو ابھی بھی میرے اوپر شک ہے۔ اُن کے خیال میں اُن کے سامنے میں شرما رہا ہوں۔ اُن کے جانے کے بعد اطمینان سے شغل کروں گا۔ خیر جناب اُن کے جانے کے بعد میں نے پورے شہر پر نظر دوڑائی تو مجھے منیر نیازی سے زیادہ مستحق کوئی نظر نہ آیا۔ اُس وقت میرے پاس ہنڈا موٹر سائیکل تھی۔ میں نے بوتل کو دبیز کاغذ میں لپیٹا اور ایک دوست کو بلا کر بوتل ہاتھ میں تھمائی اور منیر نیازی کی طرف چل دیئے۔ پسینے میں شرابور جب

میں منیر نیازی کے گھر پہنچا تو میرے ہاتھ میں شراب کی بوتل دیکھ کر منیر نیازی نے اپنا مخصوص جملہ کہا ''عطاتم طبیب ہو'' منیر نیازی فوراً گھر کے اندر سے گلاس لائے اور جلدی سے شراب اُنڈیل کر پینا شروع کر دی۔ میرے ساتھ جو دوست گیا تھا اُس نے بھی پینے کی فرمائش کی تو میں نے کہا ''منیر صاحب یہ صاحب بھی پینا چاہتے ہیں ایک گلاس اور لے آیئے۔ منیر نیازی جھٹ بولے ''یار تُو آوندے سار منگ پادتی'' (یار تم نے آتے ہی مانگنا شروع کر دیا) شاید آپ کے سوال کا جواب اس واقعہ کی صورت میں آ گیا ہو۔

☆ ایک صاحب یو۔ کے سے آئے تو کراچی کے اُستاد شاعر سے بولے ہماری کتاب پر مضمون لکھا دیجیے۔ معاوضہ جو ہو گا وہ ہم ادا کر دیں گے۔ بزرگ اُستاد بولے پانچ سو والا، ہزار والا یا پانچ ہزار والا۔ یو۔ کے والے صاحب کا لفظ پانچ ہزار پر منہ کھلے کا کھلا رہ گیا سامنے بیٹھے لاہور کے ایک دوست بولے ہن دس ہزار میں بھی لکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے آپ کی اطلاعات اور تجربات کس نوعیت کے ہیں؟

☆☆ یہ صحیح بات ہے۔ ایک صاحب اُستاد شاعر تھے جن کی میں بہت عزت کرتا ہوں وہ لکھتے بھی نہیں تھے۔ کہتے تھے خود لکھ لاؤ پانچ ہزار ساتھ لیتے آنا اور جب وہ صاحب اپنا لکھا فلیپ یا دیباچہ معہ پانچ ہزار کی رقم لاتے تو وہ اُستاد شاعر بلا دیکھے اُس تحریر پر دستخط کرتے اور پانچ ہزار جیب میں ڈال لیتے۔

☆ زیادہ پرانی بات نہیں چند عاقبت نااندیشوں نے لاہور کے دو بلند قامت شاعروں کے حوالے سے منیر اور فراز کا خلا پُر کرنے کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ آپ کے ایک شاگردِ عزیز نے غالب سے عطاء الحق قاسمی تک فکاہیہ شاعری لکھ کر مذکورہ بالا ہر دو عزیزوں سے کئی ہاتھ آگے نکل گئے ہیں؟

☆☆ ابھی تک کتاب مذکور میری نظر سے نہیں گزری ممکن ہو تو یہ کتاب مجھے ضرور بھجوایئے گا۔

☆ جب ایک شخص درست طور پر خدا کے دیئے ہوئے وصف کو کام میں لاتے ہوئے عوام کی خدمت کرنے میں مشغول ہو تو اُسے وزارت اور سفارت میں دلچسپی کا کیا جواز ہے؟

☆☆ پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ جب امریکہ میں حکومت تبدیل ہوتی ہے تو تمام حکومتی مشینری میں اُکھاڑ پچھاڑ ہوتا ہے۔ ہر آنے والی حکومت پرانے لوگوں کو ہٹا کر اپنی مرضی یا یوں کہہ لیجیے اپنے نظریات سے اتفاق رکھنے والوں کو اہم عہدوں پر لگاتی ہے۔ جب میاں نواز شریف کی حکومت آئی تو میاں صاحب نے خود فون کر کے مجھ سے گلہ کیا۔ ''قاسمی صاحب آپ کو تو فرصت نہیں ملی ہمیں مبارک باد دینے کی میں نے سوچا خود ہی فون کر کے مبارک باد وصول کر لوں''

میں نے عرض کیا ''میاں صاحب میرے مبارک دینے نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے پاکستان کے لاکھوں لوگ آپ کو مبارک دے رہے ہیں۔ ویسے بھی میں قلمکار ہوں اپنی طرف سے جو بہتر سمجھا آپ اور آپ کی پارٹی کے حق میں لکھتا رہا۔ جواب میں میاں صاحب بولے ''چلیں چھوڑیں یہ بتائیں ملنے کب آ رہے ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''جلد ہی حاضری دوں گا۔'' میاں صاحب نے جواب میں کہا ''پھر وِر نہیں، یہ بتلایئے کل آپ کس وقت تشریف لا سکتے ہیں'' شرمندگی مٹاتے ہوئے میں نے عرض کیا ''آپ وزیر اعظم ہیں جب کہیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔'' ''نہیں نہیں آپ بتلایئے کل کس وقت تشریف لا سکتے ہیں۔'' میاں صاحب کے اسرار پر میں نے آمدہ کل گیارہ بجے آنے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے میں مسلم لیگ ن کے سیکریٹریٹ پہنچا تو میاں صاحب کئی دوستوں کے ساتھ کسی اہم مسئلہ پر تبادلہ خیال میں مصروف تھے۔ میں نے باآوازِ بلند میاں صاحب کو انتخاب میں کامیابی پر مبارک باد دی تو میاں صاحب بولے: ''اصل مبارک باد کے حقدار تو آپ ہیں۔ آپ نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے'' اس کے بعد میاں صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر سامنے خالی میز پر لے گئے۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میاں صاحب نے فرمایا ''میری خواہش ہے کہ آپ کی خدمات کا دائرہ وسیع کیا جائے۔'' میں نے عرض کیا ''میاں صاحب! میری خدمات کا دائرہ پہلے ہی خاصا وسیع ہے۔'' میاں صاحب مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئے ''نہیں نہیں ہرگز نہیں، آپ میری بات کا سنجیدگی سے جواب دیجیے۔'' ''میاں صاحب! آپ کو یاد ہو گا، پچھلے دورِ حکومت میں جکارتہ کے دورے کے دوران آپ نے یہ ہی فرمایا تھا اور میں نے بھی یہی عرض کیا تھا جواب کر رہا ہوں۔'' میاں صاحب نے میرا جملہ مکمل ہوتے ہی فرمایا ''پچھلی بار میں آپ کی باتوں میں آ گیا تھا، اس بار نہیں آؤں گا'' غرض میں نے جان چھڑانے کی اپنی سے کوشش کی مگر میاں صاحب نے میری کسی بات پر توجہ دینے کے بجائے صرف یہ کہا ''آپ کے پاس پندرہ منٹ کا وقت ہے، میں ضروری میٹنگ میں ہوں، اس وقفے میں آپ سوچ کر بتایئے کہ ہم آپ کی خدمات سے کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔''

میاں صاحب کے جانے کے بعد میں نے چاروں جانب سوچ کے گھوڑے دوڑائے مگر نتیجہ صفر۔ اتنے میں میاں صاحب دوبارہ تشریف لے آئے۔ ''جی قاسمی صاحب کیا سوچا آپ نے؟'' چند لمحے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد خود بہ خود میرے منہ سے نکل گیا ''کچھ نہیں۔'' میاں صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اندرونِ ملک بیرونِ ملک کوئی جگہ بھی آپ کو پسند نہیں آئی۔'' لفظ بیرونِ ملک پر میرے اندر کا سیّاح جاگ اُٹھا۔ میں نے کہا ''چلیئے بیرونِ ملک ٹھیک ہے'' ''بیرونِ ملک کہاں جانا پسند کریں گے۔'' چونکہ مشاعروں کے سلسلے میں میرا ناروے بہت آنا جانا تھا اس لیے میرے منہ سے فوری طور پر ناروے نکل گیا۔ میاں صاحب کی محبت کے زیرِ اثر سفیر بننے کی حامی تو بھر لی تھی مگر باہر آ کر میں پریشان بہت تھا۔ گھر والے بھی یہ خبر سُن کر پریشان ہو گئے اور سب نے بہ یک زبان کہا ''نہیں جانا'' سو میں دوسری صبح اپنے دوست تسنیم درانی صاحب سیکرٹری

تعلیم کے پاس گیا اور اپنی پریشانی کا ذکر کر کے اُن کی مدد چاہی۔ نورانی صاحب بھی میرے ہم خیال نکلے اور میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولے بالکل نہیں جانا چاہیے۔ ساتھ ہی میں نے نورانی صاحب سے کہا کہ میں پڑھا پڑھا کر تنگ آ چکا ہوں اگر آپ کی وزارت میں کوئی شعبہ ہو تو مجھے وہاں لگا دیجیے۔ نورانی صاحب نے فوری طور پر چلڈرن اکادمی کے ڈائریکٹر کے طور پر میری تقرری کر دی۔ میں خوشی خوشی مجیب الرحمٰن شامی صاحب کو یہ خبر سنانے اُن کے دفتر پہنچا۔

شامی صاحب کے ساتھ قریب ایک گھنٹے کی نشست رہی۔ چائے کے بھی کئی دور چلے۔ مگر ان کی رائے تھی کہ مجھے ناروے ضرور جانا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم لوگ اپنے سفارت خانوں کی کارکردگی پہ تنقید کرتے رہتے ہیں۔ اب کام کا وقت آیا ہے تو انکار کیا جا رہا ہے۔ ان کی اس رائے سے میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہاں سے سیدھا مجید نظامی کے پاس پہنچا اور سارا قصہ سنا کر میں نے کہا ’’میں آپ کی رائے نہیں فیصلہ سننے آیا ہوں‘‘ نظامی صاحب بھی میرے ہم خیال نکلے اُن کا فیصلہ سنتے ہی میں نے نظامی صاحب کے فون سے وزیر اعظم ہاؤس فون ملانا شروع کیا۔ ابھی چار ڈیجٹ ہی ملے ہوں گے کہ نظامی صاحب نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے فون کاٹتے ہوئے کہا ’’اتنی جلدی کیا ہے کر دینا فون آرام سے‘‘ بس جناب میں گھر آ گیا شام ہو چکی تھی۔ دوسرے دن کے اخباروں میں میرے سفیر بننے کی دو کالمی خبریں لگ چکی تھیں۔ مبارک باد کے ٹیلی فون اور گل دستوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اہل خانہ اور دوستوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اب تم نہیں گئے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ تو جانِ برادر! یہ کہانی تھی سفیر بننے کی۔

☆ چلیئے! سفیر بننے کی ذمہ داری تو آپ نے اپنے لیڈر کے کھاتے میں ڈال دی مگر گورنر پنجاب بننے کے لیے آپ نے جو پاپڑ بیلے وہ بات تو پرانی نہیں؟

☆☆ جناب کون سے پاپڑ بیلے۔ میں نے تو پیغام لانے والے سے اسی وقت معذرت کر لی تھی کہ گورنر ہاؤس کی دیواروں میں میرا دم گھٹ جاتا:

☆ پاکستان ٹیلی ویژن کے حوالے سے جس قسم کے تبصرے اور قیاس آرائیاں پچھلے دنوں سننے میں آئیں اُس میں سچائی کا تناسب کیا ہے؟

☆☆ جانِ برادر! جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ تنقید کیا کرتے ہیں۔ اچھا ہوتا میرے احباب پی ٹی وی کے قواعد و ضوابط اور اس گناہگار سے قبل اس منصب پر فائز رہنے والی شخصیات کی بابت مطالعہ کر لیتے تو شاید اس سوال کی نوبت نہ آتی۔

☆ تعلق، نیازمندی اور احترام اپنی جگہ مگر ایک سیدھے سادھے دنیادار شخص کو آپ نے قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ سے نہ صرف تشبیہہ دی بلکہ اشاروں کنایوں میں بانیٔ پاکستان پر فوقیت بھی دے ڈالی؟

☆☆ گلزار بھائی! میرے جس کالم کو بنیاد بنا کر آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے میری آپ سے درخواست ہے کہ ایک بار پھر میری اُس تحریر کو غور سے پڑھیے ممکن ہو تو چند صاحب الرائے احباب کو بھی شریک مطالعہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے اس کے بعد بین السطور جو کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے آپ یقیناً مطمئن ہو جائیں گے۔

☆ جس وقت آپ کو بہترین صحافی کے ایوارڈ سے نوازا گیا اُس زمانے میں بے شمار صحافی آپ سے سینئر، بڑے اور زیادہ بلند مقام کے حامل تھے پھر بھی آپ نے یہ ایوارڈ قبول کیا؟

☆☆ آج کل ٹی وی چینلز کا دور ہے جس میں ایک لفظ ’’ریٹنگ‘‘ کا شدّ و مد سے ذکر ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں فیصلہ قاری کی تعداد کو بنیاد بنا کر کیا جاتا تھا۔ جس وقت مجھے یہ ایوارڈ دیا گیا اُس وقت بھی میں نے اپنے بڑوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی یہ ایوارڈ قبول کیا تھا۔

☆ ایک جانب آپ گوروں کے ملک میں شہریوں کے یکساں حقوق سے متاثر ہو کر وطن عزیز میں لوٹ مار کرنے والوں کی گرفت کرنے سے نہیں چوکتے دوسری جانب اُنہیں لوگوں کے ساتھ شریک اقتدار ہو جاتے ہیں؟

☆☆ یہ سوال پڑھ کر مجھے آپ کی سادگی پر ہنسی آ رہی ہے۔ بھائی! جس دن آپ فرشتے ڈھونڈ کر لے آئیں گے میں نہ صرف اُس پر ایمان لے آؤں گا بلکہ اُن کی تابعداری میں بھی قطعاً کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔

☆ وطنِ عزیز میں ہر گزرنے والے دن کے ساتھ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔ سیاست دانوں کی بے عملی اور بد اعمالی کے ساتھ سول اور خاکی کشمکش نے سنگین صورت حال اختیار کر لی ہے۔ اس حوالے سے آپ کا نقطۂ نظر ریکارڈ پر آنا بہت اہمیت کا حامل ہے؟

☆☆ ضیاء الحق مرحوم نے نوّے دن کا چولا اُتار کے جب باقاعدہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی تو ملک سو (۱۰۰) نمائندہ دانشور، ادیب، سیاست دان اور بیوروکریٹس پر مشتمل ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کی ذمہ داری ملک کا مسئلہ نمبر ایک تجویز کرنا تھا۔ صبح سے رات گئے تک طویل مشاورت کے بعد اتفاقِ رائے سے کانفرنس کے شرکاء نے صرف ایک تجویز بامعنی تعلیم اور بلا امتیاز تعلیم پیش کی۔ اب آپ ہی بتلائیے اس کے بعد کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔

☆ پوسٹ کرونا ورلڈ کی بابت بہت سے اندیشے، وسوسے اور طرح طرح کے خوف انسانوں کے ذہنوں میں جگہ پا رہے ہیں آپ کا ویژن، آپ کا استدلال اور تجربہ تیسری دنیا بالخصوص پاکستان کے حوالے سے کس طرح کے نتائج اخذ کر رہا ہے؟

☆☆ جس طرح آپ کا سوال بامعنی ہے اُسی طرح جواب دینے والے کے پاس بھی فلسفہ بگھارنے کا بے پناہ اسکوپ ہے مگر مرزا اسد اللہ خاں غالب مدت مدید پہلے میری مشکل آسان کر گئے ہیں:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

☆

''عقیدوں کے پجاری''

(عطاء الحق قاسمی صاحب کے کلام سے بصد اختصار)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

سمندر بیچ دیتے ہیں، فضا بیچ دیتے ہیں
ہمارے پر کٹے ساری اڑانیں بیچ دیتے ہیں
یہ بیوپاری عقیدوں کے، پجاری ہیں فقط زر کے
یہ مندر، مسجدیں، گرجے، گپھائیں بیچ دیتے ہیں
ہمارے شہر کے سارے درختوں کے یہ بیری ہیں
ہمارے شہر کی تازہ ہوائیں بیچ دیتے ہیں
انہیں کیا معلوم غیرت حمیت نام ہے کس کا
جو دھرتی بیچ دیتے ہیں جو مائیں بیچ دیتے ہیں
بہت سفاک لوگوں میں عطاؔر رہنا پڑا مجھ کو
جو نغمے بیچ دیتے ہیں جو تانیں بیچ دیتے ہیں

……○……

☆

عاشقی نہیں کرنی شاعری نہیں کرنی
ظاہری نہیں کرنی باطنی نہیں کرنی
عاشقی سے توبہ کی بات کیوں غلط سمجھے
میں نے کب کہا کہ اب دل لگی نہیں کرنی
درد کیا ہے راحت کیا جانتا ہوں میں صاحب
واہمے ہیں، دونوں کی بندگی نہیں کرنی
گُل کرو یہ سب شمعیں اِن سے خوف آتا ہے
اب تو زندہ رہنا ہے زندگی نہیں کرنی
صبحیں ہوں کہ راتیں ہوں دونوں کتنی واضح ہیں
شام کے دھندلکوں سے دوستی نہیں کرنی
عشق کر کے سیکھا ہے ہم نے یہ عطاؔء صاحب
ہیلو ہیلو رکھنی ہے عاشقی نہیں کرنی

○

☆

وہ مجھ سے جب کبھی مانوس ہونے لگتا ہے
مجھے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے
کبھی امید کی کوئی کرن نظر آئے
یہ دل اسی گھڑی مایوس ہونے لگتا ہے
عجیب حال ہے مِرا بہار آنے تک
خزاں سے دل مِرا مانوس ہونے لگتا ہے
میں رشک کرتا ہوں اپنی ہی خوش لباسی پر
وہ جب کبھی مِرا ملبوس ہونے لگتا ہے
وہ کوئی اور تھا جس سے کبھی ملا تھا میں؟
کبھی کبھی یہی محسوس ہونے لگتا ہے
انا کی جنگ میں ہارا نہیں ہوں، یاد رکھو
مِرا تو عشق بھی معکوس ہونے لگتا ہے

○

☆

ساتھ ساتھ چلتی تھیں   راستہ مہربان ہوتا تھا
شہر لاہور تیری گلیوں میں   اک سنہری مکان ہوتا تھا
ایک مہماں وہاں پہ ٹھہرا تھا   جس کا میں میزبان ہوتا تھا
حسُن ہوتا تھا سامنے میرے   اور حُسنِ بیان ہوتا تھا
وہ سمجھتا تھا ان کہی میری   وہ میرا ترجمان ہوتا تھا
غم کی گھڑیوں میں بھی اسے مل کر   دل میرا شادمان ہوتا تھا
ہے کوئی فائدہ بتانے کا   میں کبھی نوجوان ہوتا تھا

...... ○ ......

☆

وہ گرد ہے کہ وقت سے اوجھل تو میں بھی ہوں
پھر بھی غبار جیسا کوئی پل تو میں بھی ہوں
خواہش کی وحشتوں کا یہ جنگل ہے پُر خطر
مجھ سے بھی احتیاط کہ جنگل تو میں بھی ہوں
بنجر زمیں کی زرد رُتوں سے نکل کے وہ
آئے گا میرے پاس کہ بادل تو میں بھی ہوں
لگتا نہیں کہ اس سے مراسم بحال ہوں
میں کیا کروں کہ تھوڑا سا پاگل تو میں بھی ہوں
وہ میرے دل کے گوشے میں موجود ہے کہیں
اور اس کے دل میں تھوڑی سی ہلچل تو میں بھی ہوں
نکلے ہو قطرہ قطرہ محبت تلاشنے
دیکھو ادھر کہ پیار کی چھاگل تو میں بھی ہوں
کیسے اسے نکالوں میں زندانِ ذات سے
زندانِ ذات ہی میں مقفلِ تو میں بھی ہوں
ماضی کے آئینے میں عطؔا کوئی خوش ادا
شکوہ کناں تھا کہتا تھا سانول تو میں بھی ہوں

○

☆

جب سے ایک دشت کو خوشخبریاں سنائی گئیں
پھر اس زمین سے فصلیں نئی اگائی گئیں
میں جانتا ہوں کہ اس ایک شخص کی خاطر
کہاں کہاں سے یہ آسانیاں ہیں لائی گئیں
خدا کے نام پہ ہم نے بسائی جو بستی
خدا کے نام پہ واں بستیاں جلائی گئیں
بنا کے کشتیاں کاغذ کی شاہزادوں نے
ہمارے واسطے طغیانیوں میں لائی گئیں
ہماری دنیا کو دوزخ بنا دیا اور پھر
زمین پہ اپنے لیے جنتیں بنائی گئیں
مجھے تو یاد نہیں شکل اپنے منصف کی
مجھے تو یاد سزائیں ہیں جو سنائی گئیں
ہمارے بچوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا
ہماری یاد میں شمعیں بہت جلائی گئیں
حقیقتوں کو چھپانے کی کاوشوں میں عطؔا
کہانیاں ہمیں کیا کیا نئی سنائی گئیں

○

⁂

وہ ستارا جو آسمان میں تھا   ایک دن میرے بادبان میں تھا
اک جزیرہ تھا میرے خوابوں کا   اک سمندر بھی درمیان میں تھا
میں تو تھا قریہ جمال میں گم   وہ کسی اور ہی گمان میں تھا
جسم پھولوں کی اِک کیاری تھی   اور کانٹا کوئی زبان میں تھا
تیر آیا تھا کس طرف سے عطؔا   میں تو بیٹھا ہوا مچان میں تھا

……

⁂

میں کڑی رات کی کمان میں ہوں
ایک دنیائے بے امان میں ہوں
لوگ اپنے ہی عشق میں پاگل
میں مریضوں کے درمیان میں ہوں
کوئی کیسے مجھے پڑھے، سمجھے
میں کسی اور ہی زبان میں ہوں
اپنا کردار تو نبھانا ہے
میں محبت کی داستان میں ہوں
اور اسی میں اماں ملی ہے مجھے
میں ترِے حسنِ بے امان میں ہوں
کیسے بے دخل کر سکو گے مجھے
میں تو کب سے اسی مکان میں ہوں
کٹ گیا ہوں زمین والوں سے
جب سے میں تیرے آسمان میں ہوں
اپنے ہونے کا کب یقیں ہے مجھے
اپنے ہونے کے میں گمان میں ہوں
میں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا تجھے
میں تو گُم صُم ترِے جہان میں ہوں
میں کہ ہوں خوش گمانیوں کا اسیر
اور خود چشمِ بدگمان میں ہوں
دھوپ میں بھی مجھے ملے راحت
اس کی رحمت کے سائبان میں ہوں
جس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے عطاءؔ
وہ سمجھتا ہے کُن فکان میں ہوں

……

دھوپ کا راز دان ہوتا تھا
میں کبھی سائبان ہوتا تھا
پاؤں کے نیچے زمین ہوتی تھی
ساتھ ہی ساتھ آسمان ہوتا تھا
چھب دکھاتے تھے مہ جبیں اپنی
دل کہاں مہربان ہوتا تھا
اس قدر ساتھ تھیں گھروں کی چھتیں
اک چھت کا گمان ہوتا تھا
گرمیوں میں چھتوں پہ سوتے تھے
پاسباں آسمان ہوتا تھا
شب کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں
ساحلوں کا گمان ہوتا تھا
رات پھولوں کی سیج ہوتی تھی
دن اگر قہرمان ہوتا تھا
شادیاں جب گلی میں ہوتی تھیں
ہر کوئی میزبان ہوتا تھا
کوئی خوشحال تھا یا کوئی غریب
ہر کوئی شادمان ہوتا تھا
ہر کوئی دوسرے کی کشتی تھا
ہر کوئی بادبان ہوتا تھا
نتھو بابا ہمارے کوچے کا
سارے بچوں کی جان ہوتا تھا
گاؤں سادہ دلوں کے مسکن تھے
شہر، شہر اماں ہوتا تھا
چاند تاروں سے دوستی کے سبب
سارا روشن مکان ہوتا تھا

* * *

خوشبوؤں کا اک نگر آباد ہونا چاہیے   اس نظام زر کو اب برباد ہونا چاہیے
ان اندھیروں میں بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں ہم   جگنوؤں کو راستہ تو یاد ہونا چاہیے
جس کی زد میں ہوں ستم گر کے سبھی تیر و کماں   کوئی ایسا بھی ستم ایجاد ہونا چاہیے
خواہشوں کو خوبصورت شکل دینے کے لیے   خواہشوں کی قید سے آزاد ہونا چاہیے
ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں   عدل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے
عرض کرتے عمر گزار دی ہے عطا صاحب جہاں   آج اس محفل میں کچھ ارشاد ہونا چاہیے

……

* * *

جو چاہتا تھا اسے میں نے وہ ملال دیا
بٹھا کے دل میں اُسے، دل سے پھر نکال دیا
کہاں رہا ہوں میں محرومِ لذت آزار
کسی نے ہجر کسی نے مجھے وصال دیا
مجھے یقین نہیں تھا نکل سکے گا کبھی
یہ میں نے کعبۂ دل سے وہ بت نکال دیا
وہ میری دشت نوردی کو جانے کیا سمجھا؟
فضا میں دشت کو میں نے یونہی اچھال دیا
وہ مجھ سے حل نہ ہوا جب، تو اس کو چھوڑ دیا
خود اپنی ذات سے مشکل مجھے سوال دیا
کتابِ عشق میں یہ باب ہے انوکھا سا
جدائیوں نے مجھے نشۂ وصال دیا
خدا نے تم کو عطا کیں یہ نعمتیں کیسی
جمال رکھا طبیعت میں اور جلال دیا

……

* * *

آنکھوں میں باقی رہ گئے اب تیرے خد و خال سے
لب پہ ہیں کچھ سوال سے دل میں ہیں کچھ ملال سے
تو جو گیا تو یوں لگا تنہا ہوں کائنات میں
راتیں تھکی تھکی مری، دن بھی مرے نڈھال سے
جھانکوں کسی کی آنکھ میں، اتروں کسی بدن میں میں
فرصت اگر کبھی ملے مجھ کو ترے خیال سے
اتنا قریب ہوں ترے، رستہ نہ وہم کو ملے
سوؤں ترے حصار میں، جاگوں ترے جمال سے
کام ہیں اور بھی مجھے کچھ تو کرو مرا خیال
آتے ہو جب خیال میں، جاتے نہیں خیال سے
تجھ سے حسین غزل کوئی مجھ سا غزل سرا کوئی
دنیا میں ہو اگر کہیں واضح کرو مثال سے
اس سے گلہ عطا مجھے، اتنا سا ہے کہ وہ مجھے
سمجھا نہیں ہے آج تک، غافل ہے میرے حال سے

……

روزنِ دیوار سے

(ایک کالم نگار جو اپنا کتھارسس کرتا ہے اور سکھ کی نیند سوتا ہے)

ڈاکٹر سید عبداللہ

(●)

اردو میں کالم نگاری کی روایت مغربی طرز کی صحافت کے ساتھ پیدا ہوئی۔ اس میں مختلف حالات میں مختلف رنگ اور ذائقے پیدا ہوتے رہے اور اسے اب صحافت کا ایک شعبہ قرار دینے کے بجائے ایک مستقل ادبی فن قرار دینے میں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا۔

(بعض اہل نظر اسے محض ایک مخصوص طرز ادا تک محدود سمجھتے ہیں لیکن کالم نگاری کی تاریخ پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کالم صرف طرز ادا کا نام نہیں بلکہ ایک طرز احساس اور ایک نقطۂ نظر بھی ہے۔ شگفتگی اور شوخی اس کی روح ہے اور چونکہ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں اس لیے اس آزادی کی وجہ سے دیگر ادبی اصناف (خصوصاً مزاحیہ انشائیہ نگاری) کے مقابلے میں تنوع اور وسعت اس میں زیادہ ہے۔ البتہ اس سے متعلق ایک قید ایسی ہے جسے میں اس کے بنیادی خصائص میں شمار کرتا ہوں اور وہ ہے اس کا اختصار، اور یہ اختصار اس لیے ناگزیر ہے کہ اسے کسی اخبار یا جریدے کے دوسرے سنجیدہ موضوعات کی گرانباری، متانت اور ثقل کو دور کرنے کے لیے خود کو ہلکا پھلکا اور اس حد تک لطیف اور سبک رکھنا ہوتا ہے کہ سنجیدہ مواد کے مطالعہ کے بعد اس سے منہ کا مزہ بدلنے کا کام لیا جا سکے۔ یہ اس لطیفے کی مانند ہے جو کہانی یا حکایت نہ بن جائے۔ ایک کالم اس وقت تک کالم رہتا ہے جب تک اس کی ساخت میں اختصار کی صفت موجود رہتی ہے۔ اگر کالم نے اپنی یہ لطافت کھو ڈالی تو کالم کالم نہیں رہتا، انشائیہ کی حد میں داخل ہو جاتا ہے جسے پڑھنے کے لیے کچھ فرصت و فراغت کی ضرورت ہے اور کالم نظر سے خوش گزرے سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن کالم نگاری محض لطیفہ گوئی بھی نہیں۔ اس میں لطیفہ شامل ہو سکتا ہے مگر یہ بے تعلق شے نہیں۔

اس میں ایک نقطہ نظر بھی ہوتا ہے اور اس کا سامنے کی زندگی کے کسی واقعہ یا شخص یا حالت سے متعلق ہونا بھی اہم ہے اور اس کے لیے قدرتی طور سے ایک تقابل یا اختلاف یا تعجب کی فضا بھی درکار ہوتی ہے کیونکہ ہر واقعہ یا حالت تبھی قاری کے انعطاف توجہ کا ذریعہ بنتی ہے جب اس میں چونکا دینے والی کچھ کیفیت بھی موجود ہو۔ شخص یا اشخاص توجہ خیزی کے عمل میں کسی شخص کی بوالعجبی، ستم ظریفی، فکر کی بے ربطی، بے ڈھنگا پن، تضاد مضحک کی صورتیں کالم کے لیے عمدہ میدان تیار کرتی ہیں، جس میں کالم نگار کبھی چٹکی لیتا ہے، کبھی محض گدگدی کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی اذیت آفرینی بھی کر گزرتا ہے، لیکن بے ربطی یا بوالعجبی کا وہ ''سنیپ شاٹ'' جو کالم نگار اپنے قلم سے لیتا ہے، معصوم شوخی طفلانہ دل سے مشابہت رکھتا ہے جو نوک خار ملائم سی جراحت سے آگے بڑھنے نہیں پائے تو اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کالم اپنا مقام کھو بیٹھتے ہیں جن میں نوک خار کی ملائم خلش، زخم سوزن کی جارحیت اختیار کر جاتی ہے، خصوصاً جبکہ اس میں کالم نگار کا اپنا کوئی ناملائم جذبہ بھی شامل ہو جائے اور اس کا مقصد موضوع کی بوالعجبی کے اظہار کے پردے میں شخص موضوع کو بدنما اور بدرنگ کرنا یا کسی کش مکش حریفانہ میں شریک ہو کر کسی خارجی غرض کی تکمیل بھی ہو۔ اسی لیے معیاری کالم صرف وہی ہو سکتا ہے جو کسی غلط نقطہ نظر کو بدلنے کا وسیلہ بننے کے علاوہ خود اس شخص کو بھی محفوظ کرے جس کے وہ خلاف ہو۔ کالم سے بہر حال دشنہ و خنجر کا کام لینا زیادتی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ کسی ڈاکٹر کے نشتر کے مماثل ہو سکتا ہے ورنہ عموماً اس کا نصب یہ ہے کہ ہلکی سی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ شگفتگی کا سامان مہیا کرے۔ صحافتی واقعات کی تخلیوں اور حوادث کے شکن تاثرات کی تھکا دینے والی فضا میں کالم کڑکتی دھوپ کے اندر ایسے مختصر سے سائے کی حیثیت رکھتا ہے جو دوست اور دشمن دونوں کے لیے یکساں سامان آسودگی پیدا کر سکے۔ کالم کوئی تنقیدی مقالہ نہیں ہوتا، وہ تو محض ایک نقطہ نظر ہے جس سے بانداز خوش اختلاف کے کسی رنگ کی نمود ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کالم کا تعلق چونکہ کسی نہ کسی سیاسی اخبار یا جریدے سے ہوتا ہے اس لیے اسے لازماً متعلقہ جریدے کے مقاصد کے لیے تائیدی ہتھیار بن جانا چاہیے لیکن کسی معیاری کالم کا اصل منصب یہ نہیں۔ اگرچہ اکثر حالات میں عمل اسی پر ہوتا ہے۔ ایک اچھے انشائیہ کی طرح اچھا کالم وہی ہونا چاہیے جو محظوظ کرے، خواہ اس کا مواد ان بوالعجبیوں سے ہی وجود میں آیا ہو جو اپنی فطرت کے لحاظ سے خندہ آور ہوتی ہیں۔ کالم نگاری کے مشغلے یا صنف میں روحانی اذیت کا عمل تو خاصا بے جواز طریق کار ہے۔ کالم کی صنف، ہجو اور تمسخر کی ضد ہے۔ ایک کالم نگار بہر حال ایک ایسا مشفق دوست ہوتا ہے جو کبھی کبھی اپنے دوست سے بھی چھیڑ چھاڑ کر گزرتا ہے اور اس کا مقصد بجز ازدیاد راحت اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کا اگر کوئی سنجیدہ مقصد ہے تو فقط اتنا کہ یہ کسی بے ربطی کی نشاندہی کا ایک حسین طریقہ ہے۔ اس مختصر سے شذرے میں تاثیر پیدا کرنے والے وسائل پر کچھ زیادہ ایمائی کیفیتوں کی آگاہی بھی کالم کی تاثیر میں بڑا اضافہ کرتی ہے۔ کالم چونکہ شرافتوں کی پاسدار صنف ہے اس لیے اس میں لفظوں کی پردہ داری کنایہ کے استعمال کی سفارش کرتی ہے۔

اردو صفحات میں بیسیوں کالم نگار ظہور میں آئے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے مزاج کے مطابق گُل کاریاں اور گِل کاریاں کیں۔۔۔ یہ انہیں کی سخن آفرینیاں تھیں جن کی بدولت بالآخر ہم اس صنف کو محض اخبار نویسانہ تحریر (جرنلزم) سے الگ کر کے اسے ادبی اصناف میں جگہ دے رہے ہیں۔

اس شذرے کا مقصد اردو کالم نگاری کی تاریخ قلم بند کرنا نہیں۔ میں کچھ باتیں عطا قاسمی کی کتاب ''روزن دیوار'' کے متعلق لکھنے بیٹھا تھا، لیکن قلم اٹھاتے ہی یہ محسوس ہوا کہ بس اسی تک خود کو محدود کر کے کچھ لکھنا میرے لیے خاصا دشوار ہے لہٰذا تمہید لکھ ڈالی جو نفسِ مضمون سے طویل تو ہو گئی ہے۔

میری مشکل ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اپنے سے بڑوں کی تخلیقات پر لکھنے کی جرأت کرتے ہوئے پاس ادب مانع ہوتا ہے اور اپنے سے چھوٹوں کی نگارشات کے سلسلے میں شفقت کے تقاضے اُبھر آتے ہیں اور ڈر یہ ہوتا ہے کہ یہی

شفقت کے رشتے کل مجھ پر باعث الزام نہ بن جائیں کہ میں اپنے عزیزوں کے معاملے میں بہت نرم دل اور فیاض ہو جاتا ہوں، لیکن ایسا نہیں۔ کچھ کچھ معیار شناسی بھی رکھتا ہوں۔ اس لیے قدرے بھٹک جانے کے باوجود گم راہ نہیں ہو جاتا۔ اچھے برے کا امتیاز کر ہی لیتا ہوں۔

مدت سے ایک کتابچہ (روزن دیوار سے) کتابوں میں رکھا ہوا تھا۔ میں اسے ٹالتا رہا کہ یہیں کہیں خانہ زنبور بھی نہ ہو۔۔۔ کیونکہ مرزا غالب کو بھی یہ اندیشے ستاتے رہے تھے۔ کبھی مجھے اپنے عزیزوں کے بارے اس شکایت نے روکا کہ یہ لوگ اپنا حق ادا نہیں کرتے اور اردو کی تحریک میں میرا ساتھ نہیں دیتے اور باتوں میں لگے رہتے ہیں۔ انگریزی کی بالا دستی کے خلاف ایک لفظ ان میں سے کسی نے نہیں لکھا۔ اس لیے کتابچے کے خلاف ایک انتقامی رویہ رکھا، پھر ایک دن میں نے روزن دیوار کے ایک دو کالم پڑھ ڈالے۔ پھر اور آگے بڑھا اور آگے بڑھا تو محسوس ہونے لگا کہ میرا غصہ دھیما پڑتا جاتا ہے اور مکمل کتاب کو دیکھنے کا شوق غالب آتا جا رہا ہے۔ اب میں کتابچے کو پڑھ چکا ہوں اور یہ سطریں لکھ رہا ہوں مگر یاد رہے کہ یہ سطریں بھی کالم کے مانند تھوڑی ہی ہوں گی۔

’’روزن دیوار سے‘‘ کے بارے میں پہلی بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ ان کالموں میں ایک خاص قسم کی بے غرضی پائی جاتی ہے۔ بے غرضی کے معنی یہ ہیں کہ کالم نگار ایک طرز احساس تو رکھتا ہے اور اس کا ایک نقطہ نظر بھی ہے مگر اس سے غرض نہیں کہ کوئی قاری ضرور اس کے نقطہ نظر سے اتفاق کرے۔ عطا قاسمی کے یہاں مجھے دعویٰ یا ادعا کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ نہ مصلح ہے، نہ نقاد، نہ واعظ، نہ مفکر۔۔۔ وہ زندگی کے بے ربط یا تعجب خیز پہلوؤں کا ایک بے غرض تماشائی ہے جو بوالعجبیوں کی مصوری کرتا ہے تا کہ جس طرح وہ خود محظوظ ہوا ہے دوسرے لوگ بھی محظوظ ہوں۔

عطا قاسمی کے کالموں میں ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی کہ وہ ذاتیاتی کم ہیں او عمومی غیر شخصی زیادہ۔۔۔ ذاتیاتی سے میری مراد یہ ہے کہ معین جانے پہچانے اشخاص اس کے کالم کا موضوع بہت کم بنتے ہیں، وہ اشخاص سے زیادہ کرداری نمونوں (ٹائپ) پر زیادہ لکھتا ہے اور عمدہ لکھتا ہے۔ وہ جب کبھی شخصیہ بھی لکھتا ہے تو لفظوں کے انتخاب میں اسے خاصی دشواری پیش آتی ہے اور تعجب خیز کرداری پہلوؤں کے متعلق بھی اس کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ خبردار۔۔۔ کہیں اس شخص کا دل نہ دکھ جائے، اسی لیے میں نے کہا کہ اس کے کالم میں معین اشخاص کے بجائے عمومی نمونوں کے تضادات و عجائبات شخصی کی مصوری میں بہت اچھے رہتے ہیں۔

پھر عطا قاسمی نے یہ بھی کہا کہ میں ان کالموں کے ذریعے ہلکے پھلکے انداز میں کچھ باتیں کہہ کر اپنا کتھارسس کر لیتا ہوں۔

کالم نگار نے یہ بڑی مزے کی بات کہی۔ بالعموم فن کا مقصد قاری یا ناظر یا سامع کا کتھارسس ہوتا ہے لیکن جو فن کار اپنے فن کو خود اپنے کتھارسس کا ذریعہ بنا لے وہ واقعی عجیب شخص ہے۔

یہاں کتھارسس سے مراد اپنے آپ کو جان لینا یا سمجھ لینا بھی ہے، کیوں کہ بنی آدم جب تک خود کے بارے میں غفلتوں میں مبتلا رہتا ہے وہ اکثر اپنے اور دوسروں سے انصاف کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور جو شخص اتنا حوصلہ رکھتا ہو کہ خود اپنی بوالعجبیوں کی نشاندہی بھی کر سکتا ہو وہ واقعی عرفان سے بہرہ مند شخص ہوتا ہے۔

ہم عطاء الحق قاسمی میں دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی شخصیت کی کسی خامی کو نہیں چھپایا اگرچہ وہ دوسروں کی شخصیت کی اکثر خامیوں کو چھپا جاتا ہے، صرف نظرے خوش گزرے کے انداز میں کج اندیشی کی بھی ایک آدھ جھلک دکھا دیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی سیاسی اور ادبی کش مکشوں میں گزرتا ضرور ہے، لیکن ان میں بہت کم الجھتا ہے۔ وہ اپنے کالم کو سب کے لیے قابل مطالعہ بناتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس کی مجبوری ہو لیکن میری رائے میں یہ ایک خوش گوار مجبوری ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ عطاء قاسمی کے کالم وسعت طلبی کے آرزومند رہتے ہیں۔ ایما اور کنایہ سے اس کے کالم گھبراتے ہیں۔ اگر اخبار کا قالب (یا کالم) مانع نہ ہو تو شاید اس کے اصل مزاج کا تقاضا یہی ہو کہ اس تنگنا سے نکل کر کچھ اور پھیل جاؤ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ طبعاً ڈسکرپشن کا میلان رکھتا ہے اور ڈسکرپشن کا استعاری طرزِ بیان سے حق ادا نہیں ہو سکتا۔

عطاء قاسمی نے کہا کہ اس کی جو تحریریں کسی معروف ادبی سانچے میں فٹ نہیں ہوتیں وہ کالم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، لیکن اگر مجھ سے کوئی اس کی کالمی نگارشات کی ذات کا تعارف کرے تو میں یہ کہوں گا کہ یہ کالم سے زیادہ مختصر مضامین لطیف ہیں۔ یا کوئی پسند کرے تو انہیں مختصر انشائیہ یا مختصر افسانے کے درمیان کی کوئی صنف کہہ سکتا ہے۔

اور اگر واقعی میں ٹھیک سمجھ سکا ہوں تو اب یہ کہنے کی بھی مجھے اجازت ہونی چاہیے کہ عطاء قاسمی ایک نئی صنف کا مخترع ہے جس کی اس نے ابتداء کی ہے اور بعد میں اگر کوئی اس کی تقلید کر سکا اور کرتا رہا تو یہ ہمارے ادب کا ایک علیحدہ شعبہ ہو گا جسے کالم نہ کہا جائے اس کا نام کچھ اس طرح کا ہو گا جیسا میں نے اوپر لکھا ہے، مختصر انشائی افسانہ یا انشائیہ کالم وغیرہ وغیرہ۔

عطاء قاسمی زبان کے چٹخارے اور فقروں کی کاٹ سے زیادہ کرداری یا صورت حال کی مزاحیہ کیفیتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔۔۔ زبان کے نشتر تو بہت کام آتے ہیں جب کالم نگار کا موضوع وہ شخص خاص ہو۔ عمومی وصف نگاری میں بیان پھیلاؤ چاہتا ہے، پھر اسی پھیلاؤ میں ایسی جھلک بھی نمایاں ہو رہتی ہے جو قاری کے لیے سامان تفریح مہیا کرتی ہے۔

’’روزن دیوار سے‘‘ سایہ دیوار تک پہنچتے پہنچتے عطا قاسمی معلوم نہیں کیا بن جائے گا۔ اس کی تحریر کی عمر بظاہر یک روزہ ہی ہے مگر کچھ اولادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں والدین چاہیں یا نہ چاہیں طویل عمر تک جا پہنچتی ہیں اور نیک نامی کا باعث ہوتی ہیں۔

فی الحال اتنا ہی کافی ہے آئندہ جب آرام طلب عطاء قاسمی سایہ دیوار میں بیٹھ کر مزید کچھ لکھے گا تو باقی اس وقت رقم ہو جائے گا:

اب تو جاتے ہیں مَے کدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

موثر و پیٹنٹ قلمکار

کرنل محمد خان

(●)

ایک خاتون نے مجھ سے یہ قصہ بیان کیا کہنے لگی ایک روز میں نے عطاء الحق قاسمی کو نوائے وقت کے دفتر میں فون کیا اور ایک شخص کے متعلق چند سوال پوچھنا چاہیے۔ عطاء بولے:

’’ٹیلی فون پر تو یہ ساری باتیں نہیں ہوسکتیں کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ میرے دفتر تشریف لے آئیں۔‘‘

خاتون بولی: ’’مگر وہاں تو بہت سے آدمی ہوں گے میں آپ کو کیسے ڈھونڈوں گی یا پہچانوں گی؟‘‘

عطاء بولے: ’’یہ کوئی مشکل کام نہیں یہاں کل پندرہ بیس آدمی کام کرتے ہیں آپ آئیں۔ سب کو غور سے دیکھیں۔ جو شخص آپ کو سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ سمارٹ اور سب سے زیادہ دلربا نظر آئے۔۔۔ وہی عطاء الحق قاسمی ہوگا۔‘‘

لیکن پچھلے دنوں جب ’’روزن دیوار‘‘ چھپی اور عطاء نے مجھے اپنی ایک کتاب بھیجی تو معلوم ہے اس نے کن لفظوں میں کتاب پیش کی؟ لکھا تھا:

اپنے پیارے ’’بزرگ‘‘ کرنل محمد خان کے نام۔۔۔ سنا آپ نے؟

بزرگ! ہر چند کہ میری بزرگی کے آگے پیچھے اُلٹے کامے ڈال کر اسے کسی قدر پیاری کر دیا تھا کہ تھوڑا سا شک کا فائدہ اٹھا سکوں تا ہم اس لفظ سے یوں محسوس ہوا جیسے چشم زدن میں دس سال اور بوڑھا ہو گیا ہوں اور بوڑھے کو بوڑھا کہنا ایک ایسا اخلاقی جرم ہے جو اگر قابل دست اندازی پولیس نہیں۔ تو ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے، فیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم لوگ یہ تو برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی نابالغ لڑکا یا لڑکی ہمیں انکل کہہ کر بلائے لیکن یہی حرکت کوئی اردو میں کرے، یعنی ہمیں چچا یا چاچا کہہ کر پکارے تو خون کھول اُٹھتا ہے۔

اگلے روز، خدا جانے مجھ سے قتل کیوں نہ سرزد ہو گیا۔۔۔ بازار میں کھڑا تھا۔ ایک لونڈا تیر کی سیدھ میں میری طرف آیا مجھ سے کہنے لگا۔

’’بڑے میاں تمہاری گھڑی میں کیا وقت ہے‘‘

غضب خدا کا میں اور ’’بڑے میاں‘‘ کیا میرے علم کے بغیر چہرے پر چگی داڑھی اتر آئی تھی؟ کیا میرے سر پر دو پلی تھی اور منہ میں پان؟ کیا میں نے تنگ پاجامہ اور بدرنگ اچکن پہن رکھی تھی؟۔۔۔ مگر صدمہ اس قدر اچانک اور گھمبیر تھا کہ ذرا سنبھلا تو لونڈا جا چکا تھا۔۔۔ چنانچہ اسے تو قتل نہ کر سکا مگر جا کر گھڑی اتار کر دیوار سے دے ماری اور یوں طبیعت کو جزوی طور پر بحال کر لیا۔۔۔ اب کون بتائے عطاء کو اور اس وقت پوچھنے والے لونڈے کو کہ غالب اور ہم پر بزرگی کی تہمتیں قبل از وقت ہیں۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مِرے آگے

دوستو، عطا کی زبان درازی نے ہمارے باہمی تعلقات خاصے کشیدہ کر دیئے تھے لیکن محمد منشا یاد اور رخسانہ صولت نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ دونوں نے کہا ’’عطاء بچہ ہے۔ پھر ایسی غلطی نہیں کرے گا۔‘‘ دراصل قصور اس کا بھی نہیں کہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق اسے بزرگوں کی ٹانگ کھینچنے میں خاص مزہ آتا ہے ورنہ دل کا برا نہیں۔‘‘

دراصل ہم خود بھی اندر خانے عطاء کی شوخیوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ رنجش بھول کر اسے گلے سے لگا لیا اور شیر و شکر ہو گئے بلکہ شیر اور شکر دونوں عطاء ہی نے مہیا کیے اور ملک شیک بھی اسی نے تیار کیا۔ ہم تو فقط ڈیک لگا کر پی گئے۔

جن لوگوں نے عطاء الحق قاسمی کو دیکھا نہیں فقط پڑھا ہے ان کا تصور ایک گول مٹول، گورے سے لٹورے سے بچے کا ہے جو ایک سفید ریش بزرگ کی گود میں بیٹھا اپنے ننھے منے ہاتھ ان کی داڑھی پر پھیر رہا ہے اور جناب بزرگ کو بھی اس معصومانہ ریش بازی میں مزا آ رہا ہے تا آنکہ یہ بچہ بابا جی کو غافل پا کر ان کی داڑھی کا ایک بال اس زور سے نوچتا ہے کہ بزرگ کی چیخ نکل جاتی ہے اور ناظرین و سامعین کی ہنسی پھر دفعتاً بچہ بزرگ کی گود سے نکل کر دوسروں سے کہتا ہے:

کسی اور بزرگ کو کوئی اعتراض

اور عجیب بات ہے کہ جلد ہی ایک اور بزرگ اسے گود میں اٹھا لیتا ہے اور یوں اس پُرکشش بچے کی شوخی کی مار کھا جاتا ہے۔

آیئے، ذرا عطاء کے روزنِ دیوار سے جھانکیں۔

عطاء کی چھیڑ اکثر سیاسی، ادبی اور صحافتی وڈیروں سے رہتی ہے مگر بالکل اسی انداز سے جیسے غالب کی چھیڑ اپنے خوباں سے رہا کرتی تھی عطاء کی چھیڑ میں بیشتر گدگداہٹ سے اگرچہ کہیں کہیں ایک آدھ بے پناہ چٹکی بھی استعمال میں لاتا ہے مگر اس کی چٹکی میں بھی تلخی سے زیادہ شیر ہوتی ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ جب عطا نے اپنے ایک کالم۔۔۔ چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے کہ بہت سے مطالب بیان کرنے کے بعد آخر یہ معانی لکھے کہ Reach Imm Deiately, Breznev! تو خود فیض پھڑک اٹھے ہوں گے یہ ہے طنز کی ترشی میں مزاح کی رنگینی کی آمیزش وہ غالب نے اپنے معشوق کے لبوں کی شیرینی پر ناز کرتے ہوئے کہا تھا کہ رقیبِ گالیاں کھا کر بھی بے مزانہ ہوا تو یہی ناز عطاء اپنے لبوں کی شیرینی پر کر سکتا ہے اگر یوں نہ ہوتا تو عطاء کا چور فقط ایک کالم پڑھ کر بصد ندامت، اس کا موٹر سائیکل واپس نہ کر جاتا۔ اگر یہی کالم ہم آپ لکھتے اور اپنے

احساسات کو انہی لفظوں میں بیان کرتے جو چوروں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں تو موٹر سائیکل واپس آنے کی بجائے سرحد پار کر چکا ہوتا اور چور ہمارے کالم کے جواب میں ہمارے سر کی تلاش میں ہوتا۔

عطاء کی تحریر کی ایک نہایت دلکش جہت اس کی معنی آفرینی ہے۔ اس نے روحی کنجاہی کے اس مراد سے مصرع

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

کو وہ معانی عطا کیے ہیں جو روحی کنجاہی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوں گے اور اس ’’بظاہر بے ضرر‘‘ مصرع سے بیک کف بردنِ صد دل کا کام لیا ہے یعنی ایک ہی وار میں احمد ندیم قاسمی، فیض اور غالب کے علاوہ رامے، کھر اور مفتی محمود کو شکار کیا ہے۔ بلکہ عطا نے اس مصرع کو وہ قبول بخشا ہے کہ اب ہر گھر اور دفتر میں استعمال ہو رہا ہے۔ اور جس کا جی چاہے اس مصرع کے ساتھ بڑے سے بڑے فرعون کی پھونک نکال سکتا ہے۔ اگلے روز ایک ستر سالہ نواب صاحب نے اپنی تیسری بیگم سے کہا: دیکھو بیگم، ہماری شادی کو دس سال ہونے کو آئے لیکن اولاد سے محروم ہیں۔ اگر برا نہ مانو تو ایک اور نکاح کر لوں۔ عطاء کے کالموں کی دلدادہ بیگم نے انہیں ایک بار سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا:

’’کر لیجیے حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی‘‘

سامعین، مجھے تبصرہ وتنقید کا سلیقہ نہیں بس اتنا جانتا ہوں کہ عطاء اپنی تحریروں اور طبیعت کی وجہ سے ہمارا ایک انمول سرمایہ ہے بلکہ میں اسے پاکستان کے بیش بہا قدرتی وسائل میں سے ایک وسیلہ سمجھتا ہوں۔۔۔ دوسرے ملکوں میں مشہور سائنس دانوں نے چند خطرناک مؤثر پٹینٹ دوائیں ایجاد کی ہیں۔ ہمارے ملک میں یہی کام عطا کے کالم سماجی اور سیاسی بیماریوں، یعنی ظلم، منافقت اور بے ایمانی کے خلاف کر رہے ہیں۔ سائنسدانوں کی پٹینٹ دواؤں کے تو بعض اوقات تکلیف دہ Side Effects بھی ہوتے ہیں مثلاً خارش، درد، بخار وغیرہ مگر عطا کے کالموں کا فقط ایک ہی سائیڈ ایفکٹ ہے اور وہ ہے خالص حظ۔ یا انگریزی لفظوں میں Hunderd Percent Pleasure

اور آخر میں اس سدا بہار مزاح نگار کی ایک اور خوبی جو مجھے خاص طور پر مرغوب ہے۔ عطاء ابھی جوان ہے مگر اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکا ہے کہ پاکستان کے کونے کونے میں پہچانا جاتا ہے، تو وہ چاہے تو بادشاہ سے نخرے سے بات کرے بلکہ نہ بھی کرے لیکن اس نے سچے فنکاروں کی طرح حلم اور انکسار کا دامن نہیں چھوڑا اور یہی حقیقی عظمت کا قرینہ ہے۔ ورنہ ایسے بھی لوگ ہیں جو تھوڑی سی شہرت بھی مل جائے تو جب تک ان کی سیکرٹری کے Through نہ گزارا جائے، کسی انسان سے بات نہیں کرتے۔ بلکہ وہ کسی مجبوری کے تحت مسجد میں نماز کو بھی جائیں تو کالا چشمہ پہن کر جاتے ہیں کہ ایسا نہ ہو، اللہ میاں انہیں پہچان لے اور ان سے آٹوگراف کا تقاضا کرنے لگے۔

اگر آج کوئی نوائے وقت کے دفتر کو جاتے ہوئے مجھ سے پوچھے کہ عطاء الحق قاسمی کی پہچان کیا ہوگی تو میں کہوں گا۔

’’سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ سمارٹ اور سب سے زیادہ دلربا۔‘‘

چوکیدار

مزاح ایک ایسی سواری کا نام ہے جس کے آگے دُلکی چلنے والا گھوڑا جُتا ہوا ہو اور اس میں جُتے گھوڑے کی ٹاپوں کا ردھم اس قدر مدھم اور دل آویز ہو کہ اس سواری میں بیٹھے مسافر کو کچھ ایسا لطف آئے جو چمپی، مالش اور مساج میں آتا ہے۔ شرط اس میں بگھی، ٹم ٹم اور تانگہ کی نہیں صرف ایک منچلے گھوڑے کی ہے جو اپنی سواریوں کو دنیاوی معاملات سے لاتعلق کر کے اپنی تھپکیوں سے سُلا دے۔ اور جب وہ مسافر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچیں تو خود کو پہلے ہلکا اور خوش باش محسوس کریں۔

کام عطاء الحق قاسمی بھی کچھ اسی انداز میں کرنے کا حامی ہے مگر طریقۂ کار عطاء کا اپنا ہے۔ اُس کا گھوڑا دُلکی چلنے کے بجائے میلے کے گھوڑے کی مانند چونچال کرتا ہوا کبھی دائیں تو کبھی بائیں اور کبھی اُوپر تو کبھی نیچے، کبھی تیز تو کبھی مدھم چل کر سواریوں کو چوکنّا رکھتا ہے۔ عین اُس چوکیدار کی طرح جو گرمی، سردی اور برسات میں اپنی راتوں کی نیند قربان کر کے امانت داروں کو ہوشیار رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

اس طرح آپ عطاء الحق قاسمی کو ایک مزاح نگار کے ساتھ قوم کے بیدار دل اور بیدار مغز چوکیدار بھی گردان سکتے ہیں جو اپنی چٹک تحریروں کے ذریعے ہر وقت آپ کو چوکنّا رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کوشش میں عطاء کو کیا کچھ سہنا اور برداشت کرنا پڑ رہا ہے اُس کا بیان کرنا ایک طرح سے عطاء کی عبادت میں خلل ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

---سید ضمیر جعفری

عطا کا سفر نامہ

احمد ندیم قاسمی

(●)

میں نے تو ابھی دو چار برس کی مدت میں پاکستان سے باہر دو چار ملکوں میں دو دو چار چار دن گزارے ہیں اور عطاء الحق قاسمی کی مسافرت کے قدموں تلے تو براعظم بچھتے چلے گئے ہیں مگر اس کے باوجود عطا کا یہ سفر نامہ ایک طرح سے میرا بھی سفر نامہ ہے۔ حیرت اور مسرت کی بات یہ ہے کہ عطاء کو بھی اس اس کا اعتراف ہے حالانکہ اس دور میں اس نوعیت کے اعتراف کو یار لوگ اپنی نفی سمجھ کر ان کے مینار کی چوٹی پر جا بیٹھے ہیں اور وہاں سے پتھراؤ شروع کر دیتے ہیں عطاء کے فن میں جو متنوع حسن ہے وہ تو سراسر اس کی اپنی ذات اور اپنے مزاج اور اپنی توانائیوں کا حسن ہے۔ مجھ سے اگر اس نے کچھ اکتساب کیا ہے تو اس کا حد ودار بعہ صرف اتنا سا ہے کہ میں عمر میں اس سے سینئر ہونے مگر ایک ہم رتبہ دوست کی حیثیت سے اسے مختلف اور استقامت کے مشورے دیتا رہا ہوں اور میں نے جب بھی اس کی سست روی پر اسے ایک نرم سی، محبت بھری سرزنش کی ہے تو وہ اتنا چونکا اور شرمایا اور گھبرایا ہے جیسے میں نے اسے چابک دے مارا ہے۔ ویسے اگر میں اسے پے در پے پیار کے چابک نہ مارتا رہتا اور اس کی فنی غیرت کو بیدار نہ کرتا رہتا اور ''فنون'' میں ''شوقِ آوارگی'' کی نئی قسط شامل کرنے کے لیے واویلا نہ مچاتا رہتا تو یہ سفر نامہ شاید ابھی تک تشنۂ تکمیل ہوتا یوں عطاء کا یہ سفر نامہ بالواسطہ طور پر میرا بھی سفر نامہ ہے اور کیا عجب کہ آئندہ صدی کا کوئی بقراط محقق یہ سفر میرے نام ہی سے منسوب کر ڈالے کہ آخر یہ میرے ہی رسالے میں چھپتا رہا اور پھر ''قاسمی'' ہم دونوں کے ناموں کا مشترکہ لاحقہ ہے اور یاد رکھئے کہ جب میر حسن لکھنو میں اپنی مشہور مثنوی لکھ رہا تھا تو ایک اور میر حسن بھی لکھنو میں ایک مثنوی ہی لکھ رہا تھا یقین نہ آئے تو کسی محقق سے پوچھ لیجیے۔

آئندہ صدی کا ذکر تو الگ رہا یہ کوئی پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے کہ میں ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے سیالکوٹ کے قریب ایک قصبے میں پہنچا تو دلہن کے بھائی نے مجھے ایک شامیانے تلے لا کر بٹھایا وہاں قصبے کے پندرہ بیس معززین جمع تھے اور علاقائی سیاست پر گفتگو کر رہے تھے۔ دلہن کا بھائی میرے لیے مشروب لایا اور پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا آپ لوگ اپنی گپ شپ میں مگن ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ آپ کے سامنے کون شخصیت تشریف فرما ہے سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر سبھی نے معذرت کی کہ ان کے لیے اس شخصیت کی پہچان مشکل ہے میرے میزبان نے کہا۔ آپ لوگ ٹیلی ویژن بھی دیکھتے ہوں گے۔ اخبار بھی پڑھتے ہوں گے غور کیجیے لگ کر غور کیجیے۔ سب لوگ مجھ پر غور کرنے لگے اور میں گھبرا سا گیا کہ اکٹھا چالیس آنکھیں مجھے مسلسل گھورے جا رہی تھیں آخر ان لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تب میرے میزبان نے میری طرف اشارہ کر کے فخریہ انداز میں اعلان کیا۔ یہ عطاء الحق قاسمی صاحب ہیں۔

تو صاحبو اس طرح کا مغالطہ جب اس صدی میں پیدا ہو سکتا ہے تو آئندہ صدی تک گنجائشیں ہی گنجائشیں ہیں۔

اور سچی بات ہے ''شوقِ آوارگی'' کو اپنے نام سے منسوب ہوتے دیکھ کر میری روح کو بے انتہا مسرت ہوگی کہ اتنا ہمہ رنگ اور ہمہ گیر۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنا سچا اور اتنا کھرا سفر نامہ کوئی سچا اور کھرا ادیب ہی لکھ سکتا ہے اب تک اہل ادب حضرات اس سفر نامے کی متعدد خوبیاں اُجاگر کر چکے ہیں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ''شوقِ آوارگی'' کا مصنف ایک ایسا مسافر ہے جس نے اپنے طویل سفر میں اپنی روشن مسکراہٹ کو کسی بھی مقام پر بجھنے نہیں دیا اس کا زادِ سفر اس کی شگفتہ طبعی، بے تکلفی اور انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ رہا ہے اور ایک عجیب اور انتہائی خوشگوار بات یہ ہے کہ اس سفر میں اس کی پاکستانیت نے جگہ جگہ نہایت خوبصورتی سے اظہار پایا ہے۔ اس ازلی وادبی مسکراہٹ اور اس بے لوث اور بے داغ پاکستانیت نے عطا کے سفر نامے کو اتنی واضح انفرادیت بخشی ہے کہ اس کے اسلوب کو دوسرے سفر نامہ نگاروں سے الگ پہچاننا کسی بھی اہلِ ذوق کے لیے مشکل نہیں ہے۔

''شوقِ آوارگی'' سفر نامہ نگاری کی صنف میں زندگی سے چھلکتا ہوا بھرپور اضافہ ہے۔ عطا کی کالم نویسی اور خاکہ نگاری کی اہمیت تو مسلمہ تھی ہی مگر اب ''شوقِ آوارگی'' کی اشاعت نے اسے ان ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جنہیں مولانا محمد حسین آزاد نے بقائے دوام کی خلعت عطا کی تھی۔

''پروٹوکول''

ہمارے اپنے اصلی عطاء الحق قاسمی صاحب ایمبسیڈر بننے سے پہلے ادبی محفلوں کی ''جانِ خصوصی'' تھے، ایمبسیڈر بننے کے بعد ''مہمانِ خصوصی'' بننا شروع ہو گئے۔ ایمبسیڈر بننے سے پہلے لوگ ان کی تحریریں شوق سے پڑھتے تھے ان کی ایمبسیڈری کے دوران ''پروٹوکول'' سے پڑھنے لگ گئے۔ کچھ لوگوں کا ذاتی خیال ہے کہ اب عطاء الحق قاسمی صاحب کی تحریروں میں ''مہارت'' کے ساتھ ساتھ ''سفارت'' کا عنصر بھی ملے گا۔ عطا صاحب جب سفیر تھے تو ان کی پاکستان آمد پہ ان کے مداح ان سے آٹو گراف لیتے وقت ان سے ان کی نئی کتاب کا کم اور ناروے کا ویزہ حاصل کرنے کا طریقہ زیادہ پوچھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی ادبی ''لطافت'' سے زیادہ ان کی سیاسی سفارت کا تذکرہ ہونے لگا جس کی بدولت ان کے بہت سے قریبی دوستوں، جنہوں نے نارووال بھی نہیں دیکھا تھا، ناروے تک دیکھ لیا۔

۔۔۔فاروق قیصر

''لایا ہے تیرا شوق''

مشتاق احمد یوسفی

(●)

افسانوی زبان میں ایک گرم ایشائی دوپہر کی بات ہے، جب چیل انڈا اور کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن ٹرانسفارمر چھوڑ دیتی ہے۔ ایک خاتون افسانہ نگار کا جن کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ آنے والا ہے، ایک مدت بعد فون آیا۔ میں نے عرض کیا، میں یوسفی بول رہا ہوں۔ بولیں، مگر آواز آپ کی نہیں لگ رہی۔ میں نے کہا ''رات ایک نجی اور منی مشاعرے میں سات آٹھ غزلیں ترنم سے سننے سے میرے گلے میں خراش ہوگئی ہے جس کی ٹکور عطاء الحق قاسمی کی نثر سے کر رہا ہوں۔'' میں اس وقت ان کا کالم پڑھ رہا تھا جو کراچی کے نوائے وقت میں باقاعدگی سے چھپتا ہے اور اسی انداز سے اپنے مداحوں سے قبول عام و طلب مدام کی سند پاتا ہے۔

بعد دعائے روانی قلم بولیں ''مجھے آپ سے ایک فرمائش کرنی ہے، بشرطیکہ آپ وعدہ کریں کہ پوری کریں گے۔'' میں نے جواب دیا کہ ''فرمائش اگر فضول اور مہمل ہے تو ضرور پوری کروں گا''۔ فرمایا ''میں سیریس ہوں۔ آپ پکا وعدہ کیجیے کہ فرمائش پوری کریں گے۔'' میں نے عرض کیا ''اپنی بیگم کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ ہر قابل اشاعت فرمائش پوری کروں گا بشرطیکہ میری ان مجبوریوں کو ملحوظ رکھا جائے:

۱۔ کسی ادبی جلسے یا مشاعرے کی صدارت نہیں کروں گا۔
۲۔ انٹرویو نہیں دوں گا۔
۳۔ مہمان خصوصی نہیں بنوں گا۔
۴۔ کسی شاعر یا ادیب کی شام یا کسی کتاب کی رسم اجراء میں مضمون نہیں پڑھوں گا۔

بے ساختہ بولیں ''یوسفی صاحب، پھر آپ میں رہ کیا گیا؟ اور فون بند کر دیا کہ کہنے کو کچھ رہا نہیں تھا۔ میر کی زبان میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں

تم تو کرو ہو صاحبی، بندے میں کچھ رہا نہیں

اپنے منہ سے کہتے حیا آتی ہے مگر مرزا کہتے ہیں کہ تم ایک شرمیلے آدمی ہو۔ جب تک دو تین سو کا مجمع نہ ہو، کھلتے نہیں۔ کسی نے محمود ایاز مرحوم کو یہ خبر دی کہ مشتاق احمد یوسفی پردہ نشین ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنے رسالے ''سوغات'' کے اداریے میں مجھے مخاطب کر کے مومن خاں کا شعر نقل کیا:

ہے ہے تمیز عشق و ہوس آج تک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر

اور آخر میں یہ فقرہ کسا کہ ہم اس پردہ نشین کو مومن خاں کو سونپتے ہیں!

یہ تمہید دلنشین اس لیے باندھنی پڑی کہ ضیاء الحق قاسمی صاحب، بردار بزرگ (بزرگ بلحاظ سن و سال) جناب عطاء الحق قاسمی کے حکم دلپذیر کی تعمیل میں حاضر خدمت ہوا ہوں۔ اور انہیں مخاطب کر کے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا تھا:

لایا ہے ترا شوق مجھے پردے سے باہر

ان کا حکم سر آنکھوں اور قلم توصیف رقم پر۔ ضیاء الحق صاحب اپنے نام کے تاریخی ہینڈی کیپ کے باوجود کراچی کی ادبی تقریبوں کے روح و رواں ہیں۔ ان کے حکم سے یوں بھی سرتابی ممکن نہیں کہ وہ عرصہ دراز سے بے وقت مرنے کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ اپنے اشعار میں بھی فرمائش وصل اس طور کرتے ہیں جیسے وصیت کر رہے ہوں۔ اور کبھی اس طرح جیسے بینکوں کے نادہندگان سے ڈوبی ہوئی رقمیں وصول کرنے کی دھمکی دے رہے ہوں۔ کل جب اس تقریب سے متعلق ان کا فون آیا میں نے پوچھا طبیعت کیسی ہے؟ گھبرائے گھبرائے بولے، پیٹ بہت بڑھ گیا ہے! میں نے کہا، یہ خوشخبری آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟ ایک قہقہے کے بعد فرمایا کہ ''وزن بھی دل کے آپریشن کے بعد بیس کلو بڑھ گیا ہے! اسی حساب سے کمزوری بڑھتی جا رہی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے ٹانگیں صہبا لکھنوی کی لگا دی ہیں!'' تم تو پندرہ سال سے۔۔۔ کہ یہی ہماری نیازمندی بنتی ہے۔۔۔ دیکھتے آئے ہیں کہ جب بھی نصیب دشمناں ان کی طبیعت ناساز ہوتی ہے، وزن دو تین کلو بڑھ جاتا ہے مطلب یہ کہ موجودہ جثہ و جسامت بیماریوں کا تعمیر کردہ ہے۔ ہم ان کے نجی کوائف سے مجرمانہ واقفیت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کے کمربند کی ادوائن بنا کر بڑی سے بڑی چارپائی کی پائتی کسی جا سکتی ہے۔

صاحبو، دل کا آپریشن ہمارا بھی ہوا ہے۔ مگر اس کے بعد
وہ لہر نہ پھر دل میں جاگی، وہ رن نہ لوٹ کے پھر آیا۔

ہمارے برعکس ضیاء الحق صاحب کے چہرے کی شادابی اور چونچالی کو دیکھ کر خواتین اپنے سر وغیرہ دوپٹے سے اس طرح ڈھانک لیتی ہیں جیسے اذان ہو رہی ہو۔ ایک دن میں نے ضیاء صاب سے کہا کہ مجھے بلڈ پریشر کبھی نہیں ہوا۔ سگریٹ نہیں پیتا۔ شراب کبھی نہیں چکھی۔ عشاء پڑھ کر جلدی سو جاتا ہوں اور فجر کی اذان سے پہلے اٹھ بیٹھتا ہوں۔ تین چار میل روز ٹہلتا ہوں۔ مرغن غذا اور غزل سے پرہیز کرتا ہوں۔ پاکیزہ ادب پڑھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے انہی تمام وجوہات کی بناء پر دل کا آپریشن کرانا پڑا۔

مسکرائے۔ فرمایا ''اپنا کیس اس کے بالکل الٹ ہے''

اب آپ خود ہمارے اطوار و عادات کو الٹا کر دیکھئے کہ ضیاء الحق صاحب کی کیا تصویر بنتی ہے زیادہ وضاحت کرنے سے ڈرتا ہوں کہ ہم دونوں بے تکلف ہیں، نہ ایک دوسرے کو بہت زیادہ قریب سے جانتے ہیں۔ شاید اسی لیے ایک دوسرے کا اتنا احترام کرتے ہیں۔

یہ انتہائی فخر و مسرت کا مقام ہے کہ جناب عطاء الحق قاسمی نے جنہیں عزت مآب کہتے ہوئے ایک عمر کی اپنائیت مانع ہے، کلام و طعام کو تھکا دینے والی مصروفیات کے باوجود کراچی کے احباب کے لیے ایک شام نکالی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک مدت کے لیے ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ کبھی آئے تو ان کا تمام تر وقت شہر بادشاہ گراں۔۔۔ اسلام آباد کی پر پیچ غلام گردشوں کے طواف منصبی میں گزرے گا۔ تاہم یہ شام رخصت و وداع نہیں، جشن ملاقات ہے۔ میر کیا خوب کہہ گئے ہیں:

روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی آتی ہے

خدا نے ان کے قلم کو اسی طرح رواں دواں اور جواں رکھے۔ ان کے کالم کے جھروکے سے ان کے درشن ہوتے رہیں گے۔ مجھے امید ہی نہیں، یقین ہے کہ ان کے کالم ’’روزن دیوار سے‘‘ کا سلسلہ جاری رہے گا۔۔۔ نئے موضوعات اور تازہ منظر نامے کے ساتھ وہ کم و بیش تیس برس سے ایک ہی اخبار نوائے وقت سے وابستہ رہے ہیں۔ اتنی مدت تک تو آج کل میاں بیوی کا رشتہ بھی قائم نہیں رہتا۔ اخباری دنیا میں ’’وفاداری بشرط استواری‘‘ کی ایسی مثالیں ذرا مشکل سے ملیں گی۔

طنز و مزاح کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی شگفتہ نگار کو سفارت سے نوازا گیا اور سفارت کی تاریخ میں بھی یہ پہلی مثال ہے کہ اسے ایک شگفتہ نگار کے تقرر سے سرفراز کیا گیا۔ ہم ان کے پروقار تقرر پر اتنے ہی خوش ہیں، جتنے کہ ہم خود ضیاء الحق صاحب کے ہم نام کی حکومت کی ملازمت ۱۹۷۸ء میں چھوڑنے پر ہوئے تھے۔ ع:

اس کا بھی مزہ یاد ہے، اس کا بھی مزہ یاد

ماضی کی ملاوٹ ہو جائے تو پھر ہر مزہ اچھا اور ہر رنگ چوکھا لگنے لگتا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ گزشتہ پندرہ برسوں میں ان سے بہتر زیادہ شگفتہ اور Readable کالم اس تسلسل اور اعتماد کے ساتھ کسی نے نہیں لکھے۔ ریڈایبل کا موزوں مترادف اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے رجوع کرنا چاہیے کہ جو بات ہمارے ذہن میں نہیں آتی وہ ان کی زبان پر ہوتی ہے۔ مثلاً مقتدرہ، یہ جو پندرہ سال کی قید میں نے لگائی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے پہلے کے کالموں میں خدانخواستہ کوئی کمی یا خامی پاتا ہوں۔ بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ عمر کے اس مرحلے میں میرا حافظہ اس سے آگے کام نہیں کرتا۔ شگفتگی، برجستگی، تیر بہدف طنز، لطیفوں کے برمحل استعمال، تحریر اور محاورے کی سوندھی سوندھی ’’زمینیت‘‘۔۔۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن ’’طنز‘‘؟

بہترین طنزیہ کالم نگار کا اگر کوئی اعلیٰ ترین ادبی انعام ہوتا تو مصنفین کو ان کے حق میں فیصلہ کرنے میں بس اتنی ہی دیر لگے گی جتنی کہ ان کے نام کے تمام حروف کو۔۔۔ تکلیف دہ ہمزہ سمیت۔۔۔ املا کرنے میں لگتی ہے۔ یہ بات بھی ہم بلا خوف و خطر کہہ رہے ہیں۔ بے خوف ہونے کی ایک ضمنی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کچھ ایسی ریت چلی ہے کہ اگر آپ کسی شاعر سے نئی پرانی دشمنی نکالنا چاہتے ہیں تو کسی انٹرویو میں یہ بیان دیجیے کہ فلاں شخص کو میں اس عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ پھر تماشا دیکھئے۔ لوگ آپ کو تو یہ کہہ کر معاف کر دیں گے:

جا چھوڑ دیا حافظ دیوان سمجھ کر

لیکن اس غریب کے کلام میں ایسی ایسی جوئیں نکالیں گے کہ ایک ایک جوں کا وزن اس کے دیوان کے برابر! وہ بیچارہ ساری عمر منہ چھپائے پھرے گا۔ مطلب یہ کہ صرف ٹی وی پر نظر آئے گا۔

ان کے تقرر، ترقی اور تعیناتی سے ہمیں خوشی تو بہت ہوئی، لیکن کچھ اندیشہ ہائے دور دراز بھی ہیں۔ مثلاً یہی کہ جب انہیں ان کی موجودگی میں اور منہ در منہ غیر حاضر کہا جائے گا تو یہ کیسا محسوس کریں گے؟ یعنی جب دس میں سے نو ہم وطن یور ایکسی لینسی کی بجائے ان کو ہز ایکسی لینسی کہہ کر مخاطب کریں گے تو یہ ان کی اصلاح یا اپنی ہنسی کیسے ضبط کریں گے؟ دوسرا دکھ یہ ہے کہ ہمارے ادب میں ط ظ کی جوڑی ٹوٹ رہی ہے۔ عارضی طور پر ہی سہی۔ ناممکن ہے کہ عطاء الحق قاسمی کا نام آئے تو ذہن معاً امجد اسلام امجد کی طرف نہ جائے۔ فیض صاحب کی وفات کے بعد سید سبط حسن صاحب نے بیگم سرفراز اقبال کو تعزیتی خط میں لکھا تھا کہ تم خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ اب مجھ کو مرحوم کا نعم البدل سمجھو۔ اگر ہم کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ عطاء اس جسارت پر اپنے کالم میں ہمارے چیتھڑے بکھیر دیں گے تو ہم امجد کو یہی حقیر پیشکش کرتے۔ لیکن کہاں لاہور کہاں کراچی۔ کہاں قاسمی کہاں یوسفی۔ چہ نسبت خاک را بہ خاکسار۔

ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں یار حائل ہیں

محفل یاراں میں اب کون ایک دوسرے کو کبھی فرمائش کبھی فہمائش کر کے، کبھی مہمیز کبھی لقمہ دے کے، ایک سے ایک لطیفہ سنوائے گا۔ کیا اچھا ہو کہ سب لوگ بھاگ دوڑ کر کے ان جڑواں ہم جلسیوں کی یکجائی کا انتظام کریں۔ یعنی امجد کو ناروے کے جڑواں ملک سویڈن کا سفیر و ہم صفیر بنوا دیں۔

خیر۔ ہماری دعا ہے کہ دونوں جہاں رہیں، خود خوش رہیں نہ رہیں، دوسروں کو خوش رکھیں کہ یہی شگفتہ نگاروں کا شعار اور مقسوم ہے۔

ایک خوشی اس بات کی بھی ہے کہ ناروے میں مستقل پوسٹنگ کی وجہ سے وہ سفر نامہ نہیں لکھ پائیں گے۔ یہ بات بھی ہم تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ ہم بارہ سال لندن میں رہے۔ گھاٹ گھاٹ گئے اور پیاسے کے پیاسے لوٹے۔ مگر سفر نامہ نہیں لکھا۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر سفر نامے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دروغ کو جتنا فروغ سفر ناموں سے پہنچ رہا ہے اتنا سیاستدانوں کے بیان سے بھی نہیں۔ چند برس ہوئے، ہم نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ بیرون ملک جانے

والے ادیبوں سے ایک حلف نامہ لینا چاہیے کہ وہ واپسی پر سفر نامہ نہیں لکھیں گے۔ ہم گنہگار ہیں شاید ہماری بخشش محض اس وجہ سے ہو جائے کہ ہم نے سفر نامہ نہیں لکھا۔ میموں کے خود پر فریفتہ ہونے کی فرضی داستانوں سے اہل وطن کو آتش رشک میں نہیں جلایا۔ ورنہ صاحبو، ہونے کو کیا نہیں ہوا۔ کرسمس سیل کے اژدہام میں ہم نے بھی میموں کے گداز دھکے کھائے ہیں اور ہر دھکے پر ”Sorry“ کی بجائے زبان سے ”تھینک یوٗ“ کہا ہے اور آنکھوں سے ”مکرر“ ”پھر عنایت ہوٗ“ مگر ہم نے فنکارانہ ضبط سے کام لیا اور زبان قلم سے ایک لفظ ایسا نہ نکلنے دیا جس سے ان قربتوں کی تشہیر یا ان عفیفاؤں کی رسوائی ہو۔ اس ضمن میں ہم نے اپنی ممکنہ بدنامی کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ایک عمر ایسی بھی آتی ہے کہ کوئی تہمت بھی لگا دے تو خوشی ہوتی ہے۔

دوسری وجہ، اصل وجہ، سفر نامہ نہ لکھنے کی یہ ہم قاسمی جیسا شگفتہ، چلبلا اور بھرا پڑا سفر نامہ نہیں لکھ سکتے۔ اس کے اول تک آخر دلچسپ اور ہمارا سفر حرام کر دینے والے سفر نامے میں تازگی، شگفتگی اور طنز و مزاح کی آمیزش کے علاوہ جوانی کی چاشنی بھی ہے۔

ایک اور بھی غم ہمیں ستا رہا ہے۔ ناروے کے شمالی علاقوں میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ دن اور ارت کا پتہ صرف ریڈیو، ٹی وی، اخبار اور حوائج ضروری کے مقررہ اوقات سے لگتا ہے۔ اس کے تصور سے ہی جی اوبنے لگتا ہے۔ مثلاً عید کا سورج طلوع ہوا تو پانچ چھ مہینے تک غروب نہیں ہو رہا۔ شاعر ہمیشہ سے شب وصل کے مختصر ہونے اور مؤذن کے اتاؤلے پن کی شکایت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ناروے کی شب وصل شروع ہوتی ہے تو چھ مہینے سے پہلے ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ خدا ہر مسلمان شاعر کو ایسی شب وصل سے محفوظ رکھے۔

اتنا وقت ہے نہ اس کا محل کہ اس محفل میں ان کے کالموں کے ادبی محاسن پر گفتگو کی جائے۔ میتھیو آرنلڈ نے جرنلزم کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی:

"Journalism is literature in a hurry"

یعنی صحافت عجلت میں لکھا ہوا ادب ہے۔ قاسمی کے کالموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے قاسمی کا دل رکھنا مقصود ہے نہ کسی اور کالم نویس کی دل آزاری، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جتنے ادب پارے ابن انشاء اور قاسمی کے کالموں میں ملتے ہیں، وہ کسی اور کے ہاں اس افراط سے نظر نہیں آتے۔

پچھلے چند برسوں میں سیاسی قطبی اختلاف کا پہلا شکار کالم نگار ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حالات حاضرہ پر زبان، لہجہ اور منہ بگاڑے بغیر گفتگو کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ مرزا اکثر کہتے ہیں کہ جو شخص حالات حاضرہ پر، گالی دیئے بغیر گفتگو کر سکے وہ یا تو ولی اللہ ہو گا یا وہ باسٹرڈ خود حالات حاضرہ کا ذمہ دار ہو گا۔ ہمارے حالات حاضرہ کی مثال اس بچے کی سی ہے جسے کوئی رات کے اندھیرے میں ایدھی سینٹر کے گھوارے میں ڈال جائے۔ کوئی اس کی ولدیت قبول نہیں کرتا۔ سب حکومتوں کو اس بچے میں ایک دوسرے کی شباہتیں نظر آتی ہیں۔

”خوشبودار قلم“

لاہور آپ نے بھی دیکھا ہے اور میں نے بھی لیکن جو لاہور عطاء الحق قاسمی نے دیکھا ہے اور جسے وہ جس زاویے سے پینٹ کرتے ہیں، وہ لاہور آپ نے دیکھا اور نہ ہی میں نے اور ہم لوگ وہ لاہور دیکھ بھی نہیں سکتے کیونکہ دیکھنے کے لیے عطاء الحق قاسمی کی آنکھ اور عطاء الحق قاسمی کا مشاہدہ چاہیے اس لاہور کو پینٹ کرنے کے لیے اور عطاء الحق قاسمی کا خوشبودار قلم چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آنکھ، وہ مشاہدہ اور وہ قلم بنایا ہی ایک تھا۔ جس کا حق تھا حق نے وہ حق سونپ دیا اور پر مطمئن ہو کر رخ موڑ لیا۔ لہٰذا آپ اور میں لاہور دیکھ سکتے ہیں لیکن ہمیں پتنگوں کو کنی دیتے وہ نازک ہاتھ نظر نہیں آ سکتے جنہیں عطاء الحق قاسمی سکرین آرٹ کرتے ہیں ہمیں ان کے کنوں کی آواز سنائی نہیں دے سکتی جسے عطاء الحق قاسمی کے کان جذب کرتے ہیں۔ آپ اور میں لاہور کھانے تو کھا سکتے ہیں لیکن ہمیں شب دیگوں کے ذائقے وہ محسوس نہیں ہو سکتے جنہیں عطاء الحق قاسمی کی نظر چکھتی اور لمس سونگھتا ہے، سو باتوں کی ایک ہی بات ہے جو کچھ عطاء الحق قاسمی صاحب دیکھتے، محسوس کرتے اور پیش کرتے ہیں وہ ہم دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے اور نہ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ آپ نے زندگی میں قہقہہ لگوانے والے لوگ دیکھے ہوں گے، آپ نے مجمعوں کو رُلا دینے والے فنکاروں کا مشاہدہ بھی کیا ہو گا لیکن آپ نے زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا ہو گا جسے سننے اور جسے پڑھنے والوں کی آنکھوں میں تو آنسو ہوں لیکن ان کے ہونٹ ہنس رہے ہوں یہ شخص عطاء الحق قاسمی ہے۔

---۔جاوید چودھری

کالم اور بالم!

اشفاق احمد

(●)

جب عطاء الحق قاسمی کو اس ملک کا بہترین کالم نگار ہونے کا ایوارڈ ملا تو مجھے دلی مسرت ہوئی کیونکہ ایوارڈ دینے والوں سے پہلے خود میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن میرے خیال کی تائید نہیں ہو پائی تھی۔ اب جب میں نے عطا سے بلا واسطہ طور پر اس بات کی تحقیق کر لی کہ ایوارڈ دینے والا ادارہ ملک کا واحد صحافتی ادارہ ہے اور اس کا فرمایا ہوا کل جہاں میں مستند ٹھہرتا ہے تو مجھے اپنے اس اعلان پر اور بھی خوشی ہوئی جس کا میں نے احتیاطاً اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔ مجھ میں شروع ہی سے یہ عیب ہے کہ اپنے جاننے والوں اور اپنے لکتوں کی عزت افزائی پر خوش ہوتا ہوں اور ان کی تعریف سن کر دل ہی دل میں جھومتا ہوں۔ میرے والد صاحب میں بھی یہ ہی عیب تھا اور وہ چونکہ اس عمل میں پختہ ہو چکے تھے اس لیے لوگوں کے سمجھانے اور عقل مندوں کے بار بار اشارے کے باوجود آخری وقت تک اس بدعت سے برآمد نہ ہو سکے اور اسی طرح اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے دوسرے بہن بھائی جو علم و دانش اور تجربے میں مجھ سے بہت آگے ہیں پس فصل شفیع کو کافی حد تک ترک کر چکے ہیں لیکن مجھ میں ابا جی کی طرح یہ ٹیڑھ اب تک باقی ہے۔ یعنی اگر اس محفل کی بات اسی محفل میں رہے اور میرا راز غیروں پر نہ کھلے تو میں آپ کے سامنے ایمانداری سے اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے عمران خان پسند ہے، نور جہاں سے عقیدت ہے۔ خوبصورت شعر کہنے والے سے عشق ہے اور پاکستان اپنی تمام تر رشوت خوری، بے ایمانی، لوڈ شیڈنگ اور بے جمہوریت ہونے کے وصف اچھا لگتا ہے مجھے جب ان پر پیار آتا ہے تو میں ایک مرتبہ تو کھل کے کہہ دیتا ہوں ''یشکے تیرے'' گو میرے پاس بیٹھنے والے ہمیشہ پوچھا کرتے ہیں کہ کس کو کہہ رہے ہو!

اس ''یشکے تیرے'' میں عطا بھی کئی برس سے شامل ہے گو میں نے اس کو سر نہیں ہونے دیا اور یہ کچھ اس کے کالموں ہی کی بدولت نہیں اس کے بالموں کی وجہ سے بھی ہے۔ دراصل عطا کے اور میرے بالم ایک ہیں اور چونکہ ان بالموں کا طبقہ اناث سے تعلق نہیں اس لیے ہمارے درمیان رقابت کے بجائے محبت کا رشتہ کارفرما ہے اور ہم ایک دوسرے کے پیر بھائی ہیں یا ایک ہی مٹھ کے پجاری۔ اور ایک ہی بت کے سیس نوا ہیں ہمارا سب سے بڑا بُت یہی ہمارا وطن ہمارا پاکستان ہے۔

عطا کو بات کرنے کا اور بات بنانے کا بڑا اچھا ڈھنگ آتا ہے۔ اس نے جگت اور ٹھٹھول کے درمیان ایک نہایت ہی خوشگوار، غمناک، سرسبز، ٹھنڈی ٹھنڈی پگڈنڈی تلاش کی ہے بڑی سڑک اور چھوٹی شاہراہ پر معزز گروہوں اور نجیب الطرفین کنبوں کو گزرتے دیکھ کر یہ اپنی چور پگڈنڈی سے لمحہ بھر کے لیے سر نکالتا ہے اور ''بلے اوئے'' کے انداز میں ایک چونی پھینک کر پھر اپنے رستوں کے اندر ہر نوٹے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی بات پرانے کوزے کی وہ ببری ہے جو وقت کی ساکن سطح پر سات سات گرداب پیدا کر کے پھر بھی ڈوبتی نہیں دوسرے کنارے پر اُتر جاتی ہے۔ اُس کنارے پر جہاں اس کا وجود اسی طرح موجود ہوتا ہے جیسے اس کنارے پر تھا۔

میری دعا ہے کہ اللہ عطا کو اور آسانیاں عطا فرمائے اور انہیں لوگوں میں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین)

☆

تازہ کاری کے انبار

عطاء الحق قاسمی ہمارے موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں کی صف میں شامل ہیں ادب کی یہ صنف جتنی خوبصورت نظر آتی ہے اتنی پرفریب بھی ہے۔ اس صنف کی شاہراہ پر چلنے والے نے جہاں کہیں بھی کھلے راستے کو چھوڑ کر کسی تنگ راہ پر قدم رکھا تو پھر اس کے لیے لوٹ کر حقیقی راستے پر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مزاح نگاری کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ بعض زندہ دل اپنا ساز و سامان لے کر چلے تو بڑے عزم سے تھے اور ایک مدت تک رواں دواں بھی رہے مگر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے ساز و سامان پر تازہ کاری کی بجائے تکرار کا گرد و غبار چھا گیا اور وہ اپنی شاہراہ سے ہٹ کر فرسودگی کی پگڈنڈی پر جا کر سستانے لگے اور اب تک سستا رہے ہیں۔

''میں نے گوروں کے دیس میں'' کا مطالعہ کیا تو مجھے ایسی بہت ساری باتوں کا خیال آیا۔ پہلی بات جو میں بہر صورت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قاسمی سالہا سال کے تخلیقی سفر کے بعد بھی بدستور تازہ دم ہیں اور ہر روز زاویے بدل کر تازہ کاری کے انبار لگاتے جا رہے ہیں۔

۔۔۔میرزا ادیب

شوقِ آوارگی

ڈاکٹر سلیم اختر

(●)

جب عطاء الحق قاسمی نے اپنے کالموں کی پہلی کتاب ''روزنِ دیوار'' مجھے دی تو میں نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا کہ میرے نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اشاعت غلط ہے۔

کیا مطلب؟ اس نے پوچھا تھا۔

مطلب یہ کہ میں تمہیں محض ایک کالم نگار کے برعکس تخلیقی ادیب سمجھتا ہوں۔ ''روزنِ دیوار'' کی اشاعت کے بعد تمہاری وجہ شہرت صرف کالم قرار پائیں گے۔ جب کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کالموں کے برعکس تمہارا سفرنامہ پہلے طبع ہونا چاہیے تھا تمہاری تخلیقی نثر کی ذائقہ شناسی کے بعد قارئین جب کالموں کا مطالعہ کرتے تو انہیں یہ بھی یاد رہتا کہ تم محض کالم نگار نہیں ہو۔ مجھے یاد ہے اس پر ہماری خاصی بحث بھی ہوئی تھی اس ضمن میں اس کی اپنی منطق تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ منطق کم اور سستی زیادہ تھی بہرحال وقت گزرتا رہا وہ سفرنامہ مکمل کرنے کے برعکس سفر کرتا رہا کالم لکھتا رہا اور کالموں کی کتابیں بھی شائع کراتا رہا حتیٰ کہ بطور کالم نگار قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کر لیا APNS کا اعزاز حاصل کیا بعض کالم ایسے کالم بھی لکھے جن میں افسانے کا رچاؤ تھا تو بعض میں ڈرامائی کشمکش کا تناؤ اور یوں عطاء الحق قاسمی کالم کو بھی تخلیق کی سطح تک لے آیا۔

جب آج سے بیس برس قبل وہ سفرنامہ قلم بند کر رہا تھا تو بقول ایک راز دار اس کا دل مومن دماغ چینی اور کرتوتیں امریکی تھیں اب بھی تقریباً یہی کیفیت ہے کہ پاکستان کی حدود سے نکلتے ہی آرڈی نینس کی حد شروع ہو جاتی ہے البتہ اب امریکی کرتوتوں کے لیے امریکہ کی بجائے ناروے جانا پڑتا ہے امتدادِ زمانہ نے اب اسے مردِ شریف عاقبت نا اندیش پروفیسر اور تابعدار شوہر بنا دیا ہے لہٰذا بیرون ملک واپسی پر احتساب کے عمل سے بچنے کے لیے احتیاطاً بطور گواہی حسن کا حامل ناول یوں تو سمجھئے کہ عطاء الحق قاسمی نے شوقِ آوارگی کی صورت میں اپنا جداگانہ قسم کا ایک ''فسانہ آزاد'' تخلیق کیا ہے وہ طبعاً مرد آزاد ہے اور رتن ناتھ سرشار کے میاں آزاد کی مانند باتونی، حاضر جواب اور فقرہ باز بھی ہے نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

تمہارا نام کیا ہے؟

پیرزادہ محمد عطاء الحق قاسمی۔

ویٹ اے منٹ ویٹ اے منٹ۔ یہ سارے کا سارا نام تمہارا اپنا ہی ہے مسٹر۔

یہ تو نام کا ایک حصہ ہے ابھی تک قاسمی کے بعد امرتسری، ثم لاہوری اور عفی عنہ وغیرہ جیسے حصے چھوڑ گیا ہوں۔

یہ مسٹر کیا ہوا صرف کس می کہو میں تکلفات کا قائل نہیں۔

نہ بابا، ذولا شرارت سے مسکرائی میں یہ رسک نہیں لے سکتی، یو مسٹ بی جوکنگ۔

اس میں مذاق کی کون سی بات ہے کیا تم نے اپنی فلموں میں شیخوں کے حرم نہیں دیکھے۔

کِس می کا مطلب نہیں سمجھتے؟ میں نے پوچھا:

ہم فرانسیسیوں سے زیادہ اس کا مطلب کون جانتا ہوگا ذولا نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے اسے نام کا حصہ کیوں بنایا۔

وہ یوں کہ لڑکیوں میں بہت پاپولر ہوں جدھر سے گزر جاؤں کِس می، کِس می کی آوازیں آتی ہیں اب تو یہ نام کا حصہ بن گیا ہے۔

میں ابھی حفاظتی بیلٹ کھول ہی رہا تھا کہ میریلین نے ذولا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری طرف جھک کر پوچھا By the way تمہاری کتنی بیویاں ہیں۔

یہ سوال چونکا دینے والا ضرور تھا مگر میرے لیے نیا نہیں چنانچہ میں نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا ''آٹھ سو؟''

آٹھ سو؟

تم دو سال گھر سے باہر رہے ہو اپنی بیویوں کو مس نہیں کرتے میریلین نے ایک سوال اور پوچھا:

نہیں البتہ جب گھر لوٹوں گا ان میں سے کچھ ضرور مس ہو رہی ہوں گی۔

دیکھئے میں نے تبھی تو یہ سوال پوچھا تھا اور بچے؟

گیارہ سو۔

اوہ خدایا تم ان کے نام کیسے یاد رکھتے ہو۔

یہ تو ممکن نہیں میں انہیں نمبروں سے پکارتا ہوں ۸۲۲ نمبر بڑا پیارا ہے۔

ان کی آنکھوں میں شدید استعجاب ابھی تک موجزن تھا چنانچہ کرۂ ارض کے اس عجیب و غریب باشندے میں ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

آئی وانٹ بلیم ویم فور ڈیٹ! میریلین نے ہنستے ہوئے کہا تمہارے پاس تو بہت اچھی نسل کے اونٹ بھی ہوں گے۔

ایک اور متوقع سوال پوچھا گیا۔

اونٹ اچھی نسل کا ہو یا بُری نسل کا بہرحال اونٹ ہوتا ہے۔

کیا مطلب؟

مطلب یہی اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی چلتا ہے تو یوں کہ فلک

کج رفتار کو پسینہ آ جائے ہمارے ہاں تو بیک وقت دو افراد کا اونٹ پر بیٹھنا غیر اخلاقی حرکت سمجھا جاتا ہے۔

میریلین اور ذولا حیرت سے اپنی نشستوں سے اچھل پڑیں۔ ان کی آنکھیں استعجاب سے پھٹی جا رہی تھیں۔

وہ کیسے؟

وہ ایسے کہ غریب آدمی ہوں زیادہ کی استطاعت نہیں۔

عطاء الحق قاسمی اور بعض دیگر مسافر ادیبوں میں یہ فرق ملتا ہے کہ اس نے امریکہ میں چند یوم قیام نہ کیا بلکہ باقاعدہ رہائش اختیار کر کے دو برس تک ملازمت کی جن کے نتیجے میں وہاں کی زندگی کے تضادات کو سمجھنے کا موقع ملا اسی لیے عام پاکستانیوں کے برعکس اس کی آنکھیں تیز روشنی سے چندھیا جاتیں بلکہ وہ چراغ تلے اندھیرا بھی دیکھ سکتا ہے اس نے متعدد مواقع پر اپنی معاشرتی اقدار کا مغرب سے موازنہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پُر اثر بلکہ درد انگیز ’’اولڈ پیپل ہوم‘‘ کا بیان ہے جہاں وہ ذولا کے ساتھ اس کی ماں سے ملنے جاتا ہے ہم نانیوں، دادیوں کی گود میں پلتے ہیں اور چچیاں، پھوپھیاں، تائیاں ہمیں پیار دیتی ہیں یوں ہم زندگی رشتے ناتوں کے حوالے سے بسر کرتے ہیں اور یہی رشتے ہماری پہچان بھی بنتے ہیں ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بڑھاپے میں اپنے بزرگوں کو دودھ نہ دینے والی بھینس کی طرح کسی کونجی ہاؤس میں چھوڑ دیا جائے۔

جب وہ خوبصورت ذولا کے ساتھ بوڑھوں کے گھر میں اس کی ماں اور دیگر لاوارث بوڑھوں کو تنہا اور بے کسی کے صحرا میں اُجاڑ کھنڈر کی مانند دیکھتا ہے تو وہ ہنستے کھلکھلاتے شریر بچے سے ایک جذباتی پاکستانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس پھلجھڑی جیسے سفر نامہ میں یہی ایک ایسا مقام ہے جو قاری کو اداس کر دیتا ہے بالخصوص اگر وہ قاری خود میری مانند بڑھاپے کی چاپ سن رہا ہو بوڑھوں کے گھر میں ایک فرانسیسی بوڑھے نے یہ بہت خوبصورت بات کہی تھی۔ بالخصوص اگر وہ قاری خود میری مانند بڑھاپے کی چاپ سن رہا ہو۔

اگر تم لوگ بھی صنعتی ترقی کے دور سے گزرو تو اس کی نعمتوں سے ضرور بہرہ ور ہونا لیکن اس کے لیے اُن نعمتوں کی قربانی نہ دینا جن کا کوئی بدل نہیں۔

ہم میں سے اکثریت نافرمان بیٹوں کی ہے کبھی ہم نے جوانی دیوانی کے ہاتھوں ماں کو دُکھ دیئے تو کبھی بیوی کی خوشنودی کی خاطر۔ ہم مانیں یا نہ مانیں مگر کبھی نہ کبھی اپنے کیے پر نادم بھی ہونا پڑتا ہے تاہم، ہم خوبصورت فرانسیسی دوشیزہ ذولا کی مانند نہیں ہیں۔

میں نے ذولا کا بازو پکڑا اور اُٹھ کر باہر آ گیا اس کی ماں دروازے تک چھوڑنے آئی اس کے چہرے پر بے بسی اور عاجزی تھی ذولا کو بار بار یاد دلا رہی تھی کہ اگلے ہفتے یہاں سے اُسے اپنے فلیٹ میں لے جانا نہ بھولے وہ اس کے سٹور روم میں پڑی رہے گی نہ صرف یہ کہ اس کے پروگراموں میں حائل نہیں ہوگی بلکہ اس کے لئے بازار سے سودا سلف بھی لایا کرے گی۔ وہ بھکاریوں کی طرح پیچھے پیچھے چلتی آ رہی تھی۔ ذولا نے بیزاری سے اُس کی طرف دیکھا اور میرا بازو تھام کر باہر نکل گئی۔

ایک دن جب یہ بے حد خوش تھا لطیفے سنا رہا تھا اور قہقہہ پر قہقہہ لگا رہا تھا تو میں نے کہا یار عطاء! میں تمہارا محلّہ دار ہوں تمہارا دوست ہوں تم ایسا کرو کہ اپنے مجموعہ کلام میں سے صرف پانچ غزلیں مجھے بھی عطا کر دو تا کہ میں بھی اسی بہانے دنیا دیکھ لوں اور سفر نامے لکھ لوں یہ سن کر عطا بہت ناراض ہوا۔ اور آنکھیں نکال کر بولا ’’یار ڈاکٹر! تم کیسے یار مار ہو تمہیں پتہ نہیں کہ پانچ غزلوں پر تو ہم شاعروں کا کاروبار چل رہا ہے۔‘‘

اصل بات یہ ہے کہ بیس برس تاخیر سے ’’شوقِ آوارگی‘‘ کی طباعت پر بس سوچ رہا ہوں کہ اس طویل عرصے میں عطا نے جتنے سفر کیے اگر وہ فی برس یا فی سفر ایک کتاب بھی لکھتا تو آج وہ سب سے زیادہ فعال مسافر ادیب کے ساتھ ساتھ تیز قلم سفر نامہ نگار بھی ثابت ہوتا لیکن نہ جانے کیوں وہ سفر نامے چھپوانے سے گریزاں رہا ’’شوقِ آوارگی‘‘ کا دیباچہ بھی اس گریز کی حکایت سناتا ہے لیکن یہ عجیب ادبی وقوعہ ہے کہ یہ سفر نامہ جو متفرق عنوانات کے تحت مختلف جرائد میں بکھرا رہا بیس برس تک عطاء الحق قاسمی کو سفر نامہ نگار بنائے رکھتا ہے اس دوران سفر نامے کے فن پر جتنا بھی تنقیدی کام ہوا۔ اس میں عطاء الحق قاسمی کا بطور سفر نامہ نگار بھرپور ذکر ہوتا رہا ہے حالانکہ تمام حالات میں تو ادبی شہرت میں بیس برس تک استواری ہی نہیں ملتی۔ اب یہی دیکھ لیں کہ جن لوگوں نے بیس برس قبل دھوم مچائیں ان کے غباروں سے اب ہوا نکلتی جا رہی ہے۔

’’شوقِ آوارگی‘‘ کا مطالعہ کرنے پر مجھے تو اس میں ایک ناول جیسی کیفیت نظر آئی مربوط پلاٹ اور باضابطہ کرداروں والا ناول نہیں بلکہ سیال کلینک ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ عطاء الحق قاسمی نے صرف مغرب ہی کا تاریک رُخ دکھایا اس سلسلے میں اس نے اپنے وطن کو بھی نہیں بخشا ہمارے ہاں منافقت اور بالخصوص مذہب کے نام پر منافقت کا یہ عالم ہے کہ اب اس پاکستانی قوم کا ٹریڈ مارک قرار دیا جا سکتا ہے سفر کے اختتام پر راسپوٹین کا استعارہ بنا کر عطاء نے ایک ایسے ہی پاکستانی کا تذکرہ کیا ہے جو رات کو شراب پی کر پہلے ڈانس دیکھتا اور صبح کو مسجد میں آ کر گرجتا اس راسپوٹین کے بقول یہ مرید بھی بڑے احمق ہوتے ہیں میرا جلال دیکھنا ہو تو کبھی مسجد میں آئیں میں نے سبز رنگ کا عمامہ باندھا ہوتا ہے اور مریدوں کے حلقے میں بیٹھا ہوتا ہوں جو میرے ہاتھ پاؤں چوم رہے ہوتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کا ’’شوقِ آوارگی‘‘ درحقیقت زندہ کرداروں کا ایک میلہ ہے ایسے کردار جو امریکہ اور یورپ میں بستے ہیں ان میں خوبصورت لڑکیاں ہیں جو بے تکلف ہونے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں وہ دوشیزائیں ہیں جو فوراً بتاتی ہیں یہاں شرابی بھی ملیں گے اور تین مہینے کمرہ میں بند رہ کر یہاں شاعری کرنے

باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ کیجیے

عرضِ حال

محمد خالد اختر

(●)

بڑھیا مئے ناب کو عشق پیچے کے گچھے کی حاجت نہیں ہوتی اور عطاء الحق قاسمی کی یہ تحریریں کسی کی تعریف کی محتاج نہیں۔ کہنے کو تو یہ سب کی سب اخباری کالم نویسی کی صف میں آتی ہیں۔ ایک دن کی زندگی پانے والی تحریریں، مگر ان میں اتنی شگفتگی اتنی انبساط انگیزی ہے، ان کا اسلوب اتنا قدرتی، اتنا روشن ہے کہ میری رائے میں (اور اس کے دوسرے پڑھنے والوں کی رائے میں) وہ ادب کے قریب آ جاتی ہیں ان میں سے چند ایک تو ادب پارے ہیں۔ اعلیٰ معیار کی طنز اور ظرافت کے نثری ٹکڑے جنہیں آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ بہت سے لوگوں کو اس کے ''روزن دیوار سے'' کے کالم ''طوطے ای طوطے''، ''ہیرو، کامیڈین اور اب ولن'' ابھی تک یاد ہیں اور اس کی نگارش بالعموم اتنی یکسانی سے اچھی اور مسرت بخش ہے کہ اس کے بہت سے کالم جن کے عنوان اب یاد نہیں رہے اس لائق ہیں کہ انہیں محفوظ کر لیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے یہ اخباری کالم جنہیں دوسرے دن پرانا اور باسی ہو جانا چاہیے اس لیے کھلے اور تر و تازہ ہیں اور ان کی آب و تاب اس لیے باقی ہے کہ ان کے لکھنے میں اس نے اپنی ذہن اور جذباتی کاوش کا رنگ بھرا ہے اس کے کم ہی کالم ایسے ہوں گے جن کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ انہیں رواداری میں گھسیٹا گیا ہے یا الفاظ جگہ بھرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں ان کے کالموں میں سلجھی ہوئی شوخ، پُرظرافت باتوں کا مزہ ملتا ہے اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تحریر کا لکھنا آسان ہے ذرا اس طرز پر لکھ کر تو دیکھیں صاف اور سچا فقرہ لکھنا آسان کام نہیں اور کاوش کے بغیر کوئی ایسا فقرہ نہیں لکھ سکتا اور پھر عطا کے کئی کالم پڑھنے کے بعد ہم کچھ دیر سوچ میں پڑ جاتے ہیں یہ نہیں کہ وہ محض ہنسی مذاق کی باتیں ہیں، اس کا دل گداز ہے، انسانیت کے لیے دھڑکتا ہوا اور یہ دھڑکن جھوٹا پوز نہیں۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ کالم نگار ہے تو وہ عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور ہمارے دوسرے بڑے اردو کے کالم نگاروں کی روایت کو نہایت امتیاز سے نبھائے ہوئے ہے اور اس میدان میں اس کے پیشرو اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت جو اردو نثر کا بادشاہ تھا زندہ ہوتا تو اس کی پیٹھ ٹھونکتا اور خوش ہوتا۔

میں عطاء سے پہلے پہل ایک سفرنامہ نگار کی حیثیت سے روشناس ہوا۔ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ فکاہیہ کالم بھی لکھتا ہے اور اس کے اخبار ''نوائے وقت'' کے مخصوص بناوٹی حیاداری کے لب و لہجہ سے مجھے چڑ تھی۔ ''نوائے وقت'' میرا اخبار نہیں تھا کوئی چھ برس ہوئے ہیں (میں ان دنوں ملتان میں تعینات تھا) کہ میں نے اس کا نام ''فنون'' میں ایک سفری مضمون ''شوق آوارگی'' تلے دیکھا۔ اس سفرنامے نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی قدرتی شوخی، بیان کی سچائی اور دل بستگی، کھلنڈرے پن کے انداز نے میرا دل موہ لیا، عطاء الحق قاسمی جو کوئی بھی وہ تھا، لکھنا جانتا تھا۔ وہ ہے کون؟ اور اتنی مدت وہ کہاں چھپا رہا؟ مجھے یاد ہے کہ میں نے لاہور میں کسی کو لکھا کہ یہ عطاء الحق قاسمی کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ مجھے اتنا ہی پتہ چل سکا کہ وہ لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار ہے اور امریکہ سے ہو آیا ہے۔ ایک سال بعد لاہور کسی سرکاری کام پر آنے کا اتفاق ہوا تو عطاء سے پہلی بار ملا اور اب جب میں لاہور ہی میں ہوں ہماری ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی صحبت مزے کی ہوتی ہے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو تمہیں ہنستے ہنساتے ہیں اور کچھ عرصہ کے لیے تمہیں اپنی تاریک مایوسانہ سوچوں سے رہائی دلا دیتے ہیں وہ لوگ جن کے بارے میں سٹیونسن نے کہا ہے کہ جب وہ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو گویا ایک بتی اور روشن ہو جاتی ہے۔

مگر میں اس کی فکاہیہ نگاری سے لاہور آنے پر بھی بے تعلق رہا کیونکہ میں اس کا اخبار ''نوائے وقت'' نہیں پڑھتا تھا ویسے بھی میں اخباروں کے ان تھک اور سنجیدہ پڑھنے والوں میں سے نہیں۔ عطاء نے ایک آدھ بار مجھے اپنے کالم پڑھنے کی جانب رغبت دی مگر میرے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اسے کچھ مایوسی ہوئی اور میں اس کا سایہ اس کے چہرے پر دیکھ سکتا تھا۔ دراصل مجھے کچھ ایسا خیال تھا کہ عطاء جیسا سچا ادیب ایک اچھا فکاہیہ کالم نگار نہیں ہو سکتا۔ فکاہیہ کالم ہوتا بھی کیا ہے زبردستی کی لطیفہ گوئی، سیاسی چوٹیں اِدھر اُدھر کی خفیف پھبتی بازی اور جگت کی پوٹ، اگر میں عطا کے فکاہیے نہیں پڑھ رہا تھا تو اس محرومی سے کچھ نہیں کھو رہا تھا!

پھر مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات ہوئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پہلے سے ترتیب شدہ فیک نتائج، سرکاری پریس کی شرمناک ہرزہ سرائی اور فتحیابی کے شادیانے ہم میں سے بہت سے جو جاندار ذوالفقار علی بھٹو کو اب تک چاہتے اور اس کے بارے میں فریب نظری میں مبتلا تھے اس کھلم کھلا ڈھونگ پر برہم ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہم میں سے ہر ایک نے اس طرح محسوس کیا جیسے اس کی ذاتی تذلیل کی گئی ہو اور ہمارا خون کھولنے لگا کیا ہم اتنے ہی بے ضمیر اور خودداری سے محروم تھے کہ ہر جاہ پرست، مہم باز مذہب اور حب الوطنی کے نام پر اور اپنی شوکت و حشمت برقرار رکھنے کی خاطر ہم پر ستم ڈھاتا رہے آمر اپنے اصل رنگوں میں سامنے آ گیا اور ہم ٹیلی ویژن پر اس کی دو تین کرتب بازیوں کے بعد یہ جاننے لگے کہ وہ ایک تیسرے درجے کے دل و دماغ رکھنے والا بے اصول شخص ہے جسے خلعت و کلاہ سے ماسوا کوئی اور چیز عزیز نہیں۔ سانپ کی طرح فریبی اور قطعی ناقابل اعتبار ہم اس سے نفرت کرنے لگے۔ ایک دو لوگوں نے اپنے ٹی وی سیٹ کے سکرین پھوڑ دیئے۔

ہمارے قومی پریس نے حسب دستور حاکمِ وقت کے کلمے پڑھنے کی

روایت قائم رکھی میں جانتا ہوں کہ صحافیوں کے بھی بیوی بچے ہوتے ہیں اور فاقے سے مرنا اچھی چیز نہیں مگر کیا میراثیوں کی طرز کی اتنی مسلسل قصیدہ خوانی ملازمت کے تحفظ کے لیے ضروری تھی؟ ان دنوں تم اخباروں کو ان کی خبروں یا اداریوں یا رایوں کے لیے نہیں پڑھ سکتے تھے اور پاکستان ٹائمز جیسے چند اخبار تو ناقابلِ برداشت چیتھڑے بن کر رہ گئے۔ بہت سے دوسروں کی طرح میں نے بھی اپنا اخبار بدل کر ''نوائے وقت'' پڑھنا شروع کیا ''نوائے وقت'' کم از کم خبریں تو دیتا تھا اور اس کے اداریے بھی اپنے مخصوص اسلامی اجارہ داری کے مزاج کے باوجود جچے تلے اور متوازن ہوتے تھے تب ہی حیرت اور مسرت سے فکاہیہ نگار عطاء الحق قاسمی سے اصل متعارف ہوا۔

اس نامور اخبار میں عطا کے فکاہیے جو ''روزن دیوار سے'' کے عنوان سے اس کی تصویر کے ساتھ چھپتے تھے، بہترین چیز ہوتے تھے اور بہت سے اخبار پڑھنے والے سب سے پہلے انہی کا ورق الٹتے بعض دفعہ وہ فکاہیہ وہاں ہوتا تھا اور بعض دفعہ نہیں کیونکہ عطاء روزانہ کچھ نہ کچھ گھسیٹنے والا کالم نگار نہیں۔ اکثر جب اس کا وار سیدھا پڑتا تھا وہ پر امتیاز خوبی سے لکھتا۔ وہ بڑی سلیس اور صاف زبان لکھتا ہے۔ قدرتی شوخی اور بے تکلفی سے معمور، بذلہ سنجی اور ظرافت سے دمکتی ہوئی۔ اس دور کی سیاست اور معاشرت کے ناہموار پہلو اس کی نگاہوں سے نہ بچ پاتے اور وہ انہیں بڑی خوش ذوقی اور سلیقے سے مگر لگی لپٹی رکھے بغیر بے نقاب کرنے سے نہ چوکتا۔ اس نے جرأت اور دلیری سے کہ محتسب حرف نہ رکھ سکیں وہ کچھ کچھ ڈرتا تھا کہ کہیں اسے اپنے لیکچررشپ سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں اور میرا خیال تھا کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لیے تیار تھا۔ میں اس کی سفرنامہ نگاری کا مداح تو تھا ہی، اب ان کالموں میں اس کی ذہانت اور طباعی کا قائل بھی ہو گیا۔ وہ ایک حقیقی لکھنے والا تھا اس کا دل صحیح جگہ پر تھا اور میں ان انوکھے اجلے کالم لکھنے والے سے قلبی یگانگت محسوس کرنے لگا۔ ہم ایک ہی ہوا میں سانس لیتے تھے ایک ہی ڈگر پر سوچتے تھے! اس کے کم ہی کالم میری نظر سے گزرے جن کا رنگ پھیکا ہو۔ جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ محض تفننِ طبع یا تمسخر کے لیے لکھے گئے ہیں۔

اس کے ان کالموں کی دھوم ہو گئی اور پڑھے لکھے لوگ ان کا ذکر کرنے لگے۔ نوائے وقت کی اشاعت لاکھوں تک جا پہنچی تھی کیونکہ اس کا رویہ دونوں فریقوں کی متوازن خبریں دینے کا تھا۔ جبکہ پریس ٹرسٹ کے اخبار محض آمر کی مدحت سرائی کی ترولیاں اور نرسنگے پھونک رہے تھے۔ عطاء کا ''روزنِ دیوار سے'' وسعت سے پڑھا جانے لگا۔ شہرت اس کے دروازے تک آ پہنچی اور اس کا نام ''نوائے وقت'' کے ساتھ اس طرح مربوط ہو گیا جیسے اس کے ایڈیٹر مجید نظامی کا۔ اتنی شہرت کسی کا بھی سر پھیر دیتی ہے اور اگر اس سے عطاء کا سر پھر گیا (میں حقیقتاً نہیں جانتا) تو میں اسے الزام نہیں دوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ان پرشورش ایام میں آمر کو گرانے میں ایک باعزت لائق تعریف پارٹ ادا کیا جس پر کوئی بھی اخبار نویس فخر کر سکتا ہے۔ میں نے ہی اسے یہ سمجھایا کہ اس کے بعض کالم اپنی وقتی موضوعیت کے باوجود اپنی ایک زندگی رکھتے ہیں اور انہیں ضائع نہیں ہونا چاہیے اگر انہیں منتخب صورت میں کتابی شکل دے دی جائے تو وہ کئی پڑھنے والوں کو مسرت دیتے رہیں گے۔ عطاء کو میری بات سے خوشی ہوئی اور اس نے کہا کہ یہی بات اس کے اپنے دل میں تھی۔

''مگر سر میرے کالموں کا انتخاب آپ کو کرنا ہو گا اور آپ ہی اس کا دیباچہ یا تعارف لکھیں گے۔'' اس نے مجھے نوٹس دیا۔

عطاء مجھے ایک بزرگ سینئر ادیب کا رتبہ دیتے ہوئے ہمیشہ ''سر'' سے خطاب کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ میں اس کو نہیں ٹوکتا۔ اس کے ''سر'' سے میں اپنی نظروں میں کافی معزز اور پر منزلت ہو جاتا ہوں۔ عطاء طبعاً جلد باز اور بے صبرا ہے اور آج کے کام کو کل پر ٹالنے پر (جو میرا سنہری اصولِ حیات ہے) یقین نہیں رکھتا۔ اگلے دن ہی مجھے اس کے پچھلے تین سالوں میں لکھے ہوئے کوئی ڈیڑھ سو، دو سو فکاہیوں کے تراشے سونپ دیے گئے اس ہدایت کے ساتھ کہ دو تین روز میں ان سے چالیس پچاس بہترین فکاہیوں کو چُن دوں جو فی الواقع کھلتے ہوئے چمکتے دمکتے ہوں اور جن سے ایک معقول ضخامت کی کتاب بن سکے۔

میں ایک نہایت سست الوجود شخص ہوں اور ان دنوں کسی قسم کی چیز لکھنے سے میری جان جاتی ہے مگر میرے سر پر ڈیماکلیز کی تلوار لٹک رہی تھی اور میں نے یہ کام مقررہ وقت پر لیا اور سچ مچ یہ کوئی کام نہ تھا بلکہ ایک مسرت بخش مشغلہ وہ تراشے جو میری نظر میں وقتیت سے آگے ادبی حیثیت رکھتے تھے ان کے حاشیے میں میں نے تین کراس لگا دیے دوسروں میں اپنی پرکھ کے مطابق دو اور ایک کراس، کئی فکاہیے میں نے کراس دیئے بغیر چھوڑ دیے۔ یہ نہیں کہ ان میں خوبی نہ تھی بلکہ محض اس لیے کہ میں نے یہ سب تراشے کراسوں سے مزین اور وہ جن پر کراس نہیں لگے تھے، عطاء کے حوالے کیے۔ جس نے وقت ضائع کیے بغیر اسی شام انہیں اپنے ایک مرید کاتب کے حوالے کر دیا (یہ کاتب میں اسے ملنا چاہوں گا کتاب کی اُجرت کتاب چھپ جانے اور فروخت ہونے پر لیتا ہے) میں بھول گیا کہ میں نے کتاب کو ایک مبسوط سیر حاصل دیباچہ یا پیش لفظ بھی مہیا کرنا ہے اور ابھی اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ کتابت تو تین دن میں تو ہونے سے رہی عطا مجھے مستقلاً ورغلاتا رہا کہ کتابت کے مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر میں دیباچہ لکھ ڈالوں اس کا خیال تھا کہ کتابت کے مرحلے کے دوران ہی میرے چل بسنے کے امکانات روشن ہیں اور اس کی کتاب انتخاب کرنے والے دیباچے سے کوری رہ جائے گی۔

کتابت ہو چکی (اس میں تین چار مہینے لگ گئے کیونکہ کتاب کی اشاعت پر اُجرت لینے والا کاتب اس دوران میں ناساز ہو گیا) اور ایک اچھی صبح مجھے مطلع کیا گیا کہ کتاب چھپنے کے لیے تیار ہے اور اب دیر میرے دیباچے کی ہے میں نہیں سمجھتا کہ دیباچہ کتاب کے لیے کیوں ضروری ہے اور کتابیں دیباچوں کے بغیر کیوں نہیں چھپ سکتیں۔ میں نے دبے لہجے میں مصنف کو اپنے نظریے سے

آ گاہ کیا۔ اس کا نظریہ مختلف تھا۔ دیباچہ مجھے لکھنا ہوگا۔ قول سے پھرنا مردوں کا شیوہ نہیں۔ میرے پاس اب کوئی عذر نہ تھا اور دیباچہ نگاری کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود میں قدرے اوٹ پٹانگ عرض حال لکھنے بیٹھ گیا جسے اب تم پڑھ رہے ہو (یعنی اگر تم واقعی اسے پڑھ رہے ہو)

ایک انتخاب لازمی طور پر مکمل اور ذاتی ہوتا ہے اور اگر تمہیں اس میں اپنی پسند کا کوئی فکاہیہ نہ نظر آئے تو اس میں قصور نہ مصنف کا ہے نہ انتخاب کرنے والے کا۔ میں نے اس انتخاب کو گوناگوں اور رنگارنگ بنانے کی ایماندانہ کوشش کی ہے تاکہ یہ مختلف مذاق کے پڑھنے والوں کو دلنشین ہو سکے۔ وہ جن کا مزاج سیاسی نہیں ہے اور جو گزشتہ ملکی سیاست اور اس کے پیشوروں سے پوری طرح بیزار ہو چکے ہیں سوشل اور فکری فکاہیوں میں اپنی مسرت ڈھونڈ سکتے ہیں۔ انتخاب اچھا ہے یا برا۔ یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک چمکدار بستر میں پڑھنے کی کتاب ہے جو بہت سوں کو خوشی دے گی۔

میں تمہیں اس کتاب کے بارے میں اور کیا بتا سکتا ہوں۔ یہ عرض حال یا دیباچہ میں ڈرتا ہوں کافی طوالت پکڑ گیا ہے اور ہے بھی کچھ الول جلول۔ مجھے اس خیال میں عافیت نظر آتی ہے کہ بیشتر سمجھدار پڑھنے والے عرضِ حال یا دیباچہ وغیرہ کے پڑھنے پر اصل کتاب کے پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں (اگرچہ میں ان لوگوں کو بھی کافی تعداد میں جانتا ہوں جن میں ایک میں بھی ہوں جو کتاب کے گردپوش کی تعریفی عبارت پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے) میں اُمید کرتا ہوں کہ کوئی اس عرضِ حال کو نہیں پڑھے گا اور ہوشمند قاری فوراً اس فرحت اور مسرت کی طرف لپکیں گے جو آنے والے صفحات میں ان کی منتظر ہے۔

☆

چبھی ہوئی بات

عطاء الحق قاسمی بات چبھتی ہوئی کرتے ہیں مگر اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ویسے کبھی کبھی اس عزیز کی لاٹھی ٹوٹتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ وصیت ناموں میں ایک وصیت نامہ ہے ’’ادیب نازک خیال کا وصیت نامہ‘‘۔ اسے پڑھتے ہوئے پہلے تو مجھے یہ گمان ہوا کہ یہ سوویت روس کے کسی ادیب کے وصیت نامے کا ترجمہ ہے۔ الٹا پلٹا مگر پتہ چلا کہ یہ تو خود قاسمی کی تحریر ہے۔ میں نے ماتھا پیٹ لیا کہ ارے یہی تو ایک دانہ بچا تھا یہ بھی ترقی پسند ہو گیا۔

یادش بخیر جب سوویت روس میں سٹالین کا دور چل رہا تھا اور ہمارے ادب میں بھی ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا تو ایسے بیانات جن میں غیر جانبداری کی بہت مذمت ہوتی تھی بہت سننے اور پڑھنے میں آتے تھے۔ اسی زمانے میں علی سردار جعفری کی ایک دھوم کی نظم شائع ہوئی جس میں ادیبوں سے یوں خطاب کیا گیا تھا۔ اے ادیبو ایک طرف گورکی ہے، ایلیں اہرن برگ ہے۔ دوسری طرف زوال پسند شاعر بادیلیئر ہے، ٹی ایس ایلیٹ ہے، ایذرا پاؤنڈ ہے۔ اے ادیبو، بتاؤ فیصلہ کرو کہ تم کس طرف ہو۔ شب سیاہ کی طرف، یا طلوع ہوتے سورج کی طرف۔

ارے ارے کہیں میری لاٹھی بھی تو نہیں ٹوٹنے لگی ہے تو آخر میں یہ وصیت نامے واہ واہ سبحان اللہ۔ اور اس کے بعد السلام علیکم۔

۔۔۔انتظار حسین

شاعری میں حرفِ سادہ کا ہُنر

اختر حسین جعفری

(●)

پابلو پکاسو نے جیمز جوائس کے بارے میں کہیں ایک فقرہ لکھا ہے کہ وہ ایک ایسا ابہام پسند (Obscurantist) ہے جس کے لفظ کو پورے کرۂ ارض میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ فقرہ اپنی ذات میں بہت بڑا معنوی تضاد رکھتا ہے کہ اگر ابہام کو بسہولت سمجھا جا سکتا ہو تو پھر اس میں اور ابلاغ میں حدِ فاصل کون سی ہے؟ بعض یورپین نقادوں نے پکاسو کی متذکرہ صدر رائے کو خود اس کے اپنے فنِ مصوری کا غیر سائنسی جواز قرار دیا ہے ان کے خیال میں لسانیات کی موجودہ ارتقاء یافتہ تحقیقی صورتِ احوال میں اس فقرے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ زبان اور بالخصوص وہ زبان جو ادبی اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہے اس کا بنیادی کردار لفظ کو ابلاغ کے حوالے سے اس کے آخری امکان کی حد تک تلاش کرنے کا عملِ مسلسل ہے۔ لکیر، داغ، اور رنگ، کاغذ، سنگ، دھات یا پلاسٹک کینوس پر ظہور میں آ کر کسی عہد میں اس منظر کے دیکھنے والوں سے کیا مکالمہ کرتے ہیں اس کا مکمل شعور قرن با قرن کے انسانی سفر کے ارتقاء کے باوجود انسان کا مقدر نہیں بن سکا کیونکہ ہر مکالمہ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق اپنی ذات میں نامکمل ہے اور ہر بسری ملاقات ادھوری ہوتی ہے۔ پکاسو کی آڑی ترچھی لکیریں، اس کے غیر روایتی رنگ، شکلیں اور ڈھانچے اپنے اندرون میں مفاہیم اور معانی کی ہزار ہا کائناتیں رکھتے ہیں۔ جن کی دریافت کا عمل مصوری کی دنیا میں اب تک جاری ہے اسی طرح کلاسیکل مصوری کے مقلدین کے ہاں بآسانی گرفت میں آنے والے منظر نامے یا شخصی عکس پر تیرتے ہوئے مفہوم کے رنگ کے علاوہ کیا کچھ اور بھی موجود ہے یہ عملِ تجسس بھی اسی طرح جاری وساری ہے جس کا پکاسو کی تجریدی تصاویر کے متعلق اوپر ذکر کیا گیا ہے پس اصل مسئلہ تخلیقی عمل میں طریقِ اظہار کا نہیں، بلکہ قوت اظہار کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بات کرنے والا بات کرنے کے ہنر سے کہاں تک آگاہ ہے اگر اسے بات کرنے کی قدرت حاصل ہے تو پھر تخلیق میں مطالب ومعانی کی ترسیل کے لیے ”حرفِ سادہ“ کی سلاست بھی اتنی ہی معاون اور کارآمد ہے جتنی کہ علامت یا پھر رمزیّت یا تجریدیت۔

ہماری اردو شاعری بھی اپنے سفر کی تاریخ میں محولہ بالا تحریکات کے اثرات سے آزاد نہیں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں مصوری سے لے کر شعر وافسانہ تک جو کچھ معرض وجود میں آیا اس میں سے بہت قلیل حصہ بڑی مصوری یا پھر بڑا ادب کہلانے کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ جدیدت، وجودیت اور تجریدیت کے نام پر جو کچھ یہاں شعروادب میں تخلیق ہوا وہ فکری اور ہیئتی سطح پر ان تجربات سے مطابقت اور مماثلت نہیں رکھتا جو ان تحریکوں کے حوالے سے غیر ملکی ادب میں بہت اہمیت کا حامل متصور ہوتا ہے اس صدی کی چھٹی دہائی فنّی اور فکری تجربات کے اردو شعروادب میں احیاء کی مساعی کے حوالے سے بہت اہم ہے اسی دہائی کے اواخر میں عطاء الحق قاسمی نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ اس آغاز سفر پر اس کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ شعری اظہار کے مروجہ عصری اسالیب نظم وغزل میں سے کون سی ایسی ہیئت کا انتخاب کرے جو اس کے تخلیقی مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ جدید اردو نظم کے جو نمونے اور ماڈل اس کے سامنے تھے ان پر ہیئتی اور معنوی سطح پر جدیدیت اور وجودیت کی چھاپ اور مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ان نظموں کے لکھنے والوں کے پیش نظر شاید انہیں زندہ رہنے والی دستاویزات کی شکل عطا کرنے کی تمنا نہیں تھی۔ وہ انہیں محض علامتی سوانحی اشکال کی صورت میں دیکھنا اور قارئین تک انہیں پہنچانا پسند کرتے تھے۔ یہ شاعر خواتین و حضرات اس نوع کے تخلیقی عمل کو نئ شعری روایت (Neo Contemporary Tradition) قرار دینے پر مُصر تھے۔ اس ضمن میں ان کا اصرار اتنا پُر شور اور اس قدر بلند آہنگ تھا کہ ان کی تخلیقات کے بارے میں ان کا کوئی دوسرا ہمعصر یا پھر اس گروہ سے غیر وابستہ کوئی اور نقاد یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہو کہ ان کی تخلیق کردہ نظم کی کوئی سطر یا مصرع ابلاغی قوت سے عاری ہے یا پھر یہ کہ کسی نظم کے لفظی پیرہن کی آستین کی لمبائی نظم کے بازو کی لمبائی سے آگے نکل رہی ہے۔ جدید نظم کے اس گروہ کی حمایت میں لکھی جانے والی تنقید کہیں تو نئ لسانیات کی مدعی تھی اور کہیں اس کا یہ دعویٰ تھا کہ نئ نظم جو جدیدیت کے نام پر لکھی جا رہی تھی ایک صوتی ساختیاتی ترتیب کا نام ہے اور یہ کہ اس کا کسی کشف یا تنقیحاتی عمل یا پھر اسی طرح کے کسی اور غیر سائنسی تخلیقی منطقے سے کوئی رشتہ نہیں۔ اسی عہد میں ترقی پسند تحریک کے فکری تسلسل میں چلنے والی ایک متوازی لہر بدستور رواں تھی جس کے سائے سائے چلنے والے بعض تخلیق کاروں جن میں کچھ ایسے شاعر بھی شامل تھے جو ترقی پسند فکر کی نظریاتی بنیاد سے اختلاف رکھتے تھے ان سب نے اپنے تخلیقی عمل سے یہ واضح کیا کہ ادب دانشِ محض کے اظہار کا وسیلہ نہیں اور یہ کہ فرزانگی یا پھر تعقل تخلیقی مواد کا جُزو ہے کُل نہیں۔ تخلیقی عمل کی تکمیل کے لیے کچھ اجزاء جنوں کے بھی درکار ہوتے ہیں ان شعراء کے نزدیک شعری اظہار کا سب سے بڑا موضوعاتی کُرہ انسانیات ہے اور پھر اس کائنات کے اندر دوسرا بڑا ادبی منطقہ انسانی جذبوں کا ہے ان شعراء کے نزدیک تخلیق کے اس صدق کے دعوے کے ثبوت میں کسی پیچیدہ استدلال کی احتیاج نہیں۔ انسانی جذبوں کا یہ علاقہ اتنا معنی خیز ہے کہ اس میں چھپے ہوئے تخلیق کے زر کے دریافت کا عمل غیر مختتم اور لا انتہا ہے فکری سفر کے لیے اس علاقے کو جس افق تک چاہیں استعمال کریں کہ خود انسانی خواہشات کی طرح اس کی زمینیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔ ان رقبوں پر پھر جائز یا ناجائز گزر یا استحصال بھی جائز استعمال کی تعریف اور خواص رکھتا ہے۔ اس انسانی حُسن کو جس قدر چاہیں خوب تر بناتے رہیں کہ اس خوبی کی کوئی اخری شکل یا کوئی

آخری مماثلت نہیں۔ اور پھر یہ کہ اس حسن سادہ کے اظہار کے لیے جس حرف یا نقش کی ضرورت ہوتی ہے اسے تنقید کی زبان میں ہم حرفِ سادہ کے نام سے پہچانتے ہیں۔ چنانچہ عطاء الحق قاسمی نے شعری اظہار کے لیے نظم کے مروجہ ہیئتی نظام کو رد کر کے اپنا رشتہ اسی مؤخر الذکر ہیئت سے استوار کیا جسے ہم نے ''حرفِ سادہ'' کا نام دیا ہے۔ اس نے اس طرزِ سخن میں چھپی ہوئی سچائی کی گفتگو کو بہت فاصلے سے سُنا اور جو شخص اس آواز میں بول رہا تھا اسے یوں صدادی:

''تمہارا خط مجھ کو مل گیا ہے
ابھی پڑھا ہے
مجھے تو بس اتنا پوچھنا ہے
اُداس کیوں ہو؟ اُداس کیوں ہو؟
تمہاری آواز اتنی مدھم ہے ایسے لگتا ہے جیسے
اپنے ہی کان میں کوئی بات کہہ کر سمجھ رہے ہو
کہ بات مجھ تک پہنچ گئی ہے
تمہاری آواز راستوں کی مسافتوں میں بھٹک رہی ہے۔''

(ایک لانگ ڈس ٹینس کال)

عطاء الحق قاسمی نے بہت دُور سے صدا دینے والے اس جذبے کو شعری اظہار کے لیے ایک ایسی حسّی نظامِ سماعت کے حوالے سے سُنا جو پیچیدگیوں سے پاک اور قوتِ رسا سے پُر تھا اس طرح اس نے نظم کو جو ایک مدّت سے خود اپنے تخلیق کار سے جُدا ہو چکی تھی واپسی کا راستہ سجھایا کہ شاعر کو خود اپنی ذات، خود اپنی نظم سے دوبارہ وصال نصیب ہو۔ اس اسلوبِ سخن کے چلاؤ کا فیصلہ عطاء الحق قاسمی کے تخلیقی مزاج کے حوالے سے موزوں اور بروقت بھی تھا کہ اس کے آغازِ سفر کے عہد تک آتے آتے نیم تجریدی یا پھر کُلّی طور پر علامتی شعری اظہار خود مغرب میں زوال آشنا ہو چکا تھا اور پھر اس کے اس سفر کے چند برس بعد ٹی ایس ایلیٹ کا بسترِ مرگ پر یہ اعتراف کہ اب جیسے ایلفر ٹ پرفراک کی شعری نمائندگی کا دور حسیّت کے حوالے سے قریب الاختتام ہے اور یہ کہ اس سمبل کو اب قصّہ پارینہ سمجھا جائے۔ اس اعتراف نے علامتی شاعری کے محلسرا کو اگر مکمل طور پر زمیں بوس نہیں کیا تو اس کے نیچے موجود فکری زمین میں ایک ہلچل اور زلزلے کی سی کیفیت ضرور پیدا کر دی کہ اس کے بعد مغرب میں شائع ہونے والی کسی بھی زبان کی شاعری کے سرسری مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شعراء کے طرزِ اظہار میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

عطاء الحق قاسمی کی نظم ٹریفک سگنل میں پرانے لفظ اور شعری فرہنگ کے درمیاں مسلسل آویزش یا پھر نئے اور پرانے رویوں میں مجادلے کی صورت احوال کچھ اس طرح اظہار پاتی ہے:

''مری زباں پر ہیں صبحِ نو کے نئے اُفق کے
نئے جہاں کے نئے ترانے
پُرانی قبریں چیخ رہی ہیں
دیئے بجھاؤ کہ سرخ سورج ابھر رہا ہے
نئے پرانے ہیں لفظ میری زباں پہ لیکن
میں ان کی لذت سے بے خبر ہوں
میں بے خبر ہوں
میں بے ہُنر ہوں
''مَیں'' سُرخ بھی ہوں میں سبز بھی ہوں
''مَیں'' کچھ نہیں ہوں۔''

یہ کچھ نہ ہونے کا نتیجہ اس کے ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے ان دلائل و براہین کا وجودیت کے بڑے فلسفے سے کوئی رشتہ و پیوند نہیں جہاں تک انسانی جبلت میں جذبے کی فکری تشریح کا تعلق ہے وہ جانتا ہے کہ یہ منطقہ جہاں کیفِ سرمدی کے چشمے پھوٹتے ہیں سیر و سیاحت کے عمل میں بہت احتیاط کا طالب ہوتا ہے۔ اس جہاں میں سروں سے آسمانوں کے سائباں کھینچ لیے جانے کا خوف ہر دم لگا رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہی جذبہ جو فنِ مصوری موسیقی یا پھر سخنوری کی بنیادی قدر ہے۔ بعض حالات میں یہی جذبہ اتنا گرم ہوتا ہے کہ اسے احساس کی پوروں سے چھوا نہیں جا سکتا۔ بعض حالات میں یہی جذبہ اس قدر کثیف اتنا گدلا اور اس قدر میلا ہوتا ہے کہ اس کی نمود و نمائش سرِ عام نہیں ہو سکتی۔ بعض صورتوں میں درونِ ذات میں چھپا ہوا یہ طوفان اتنی ہوس اور گرسنگی کا حامل ہوتا ہے کہ کوئی بھی خوانِ نعمت اسے سیر یاب نہیں کر سکتا:

''دنیا میں ایک درد کا رشتہ ہے لازوال
لیکن یہ کیا کہ درد کا رشتہ عبث بھی ہے
وہ بازوؤں میں یُوں ہے جُوں جلد میں کتاب
شامل نصابِ عشق میں بابِ ہوس بھی ہے''

تاہم یہ جذبہ جو درویشی کے خواص یا عیّاری کے عوامل بھی رکھتا ہے اپنے تمام تر حُسن اور اپنی مکمل ترتیب اور بے ترتیبی الغرض اپنی پوری شخصی کائنات کے ساتھ اس کے شعری اظہار کے لیے خام مال فراہم کرتا ہے جسے وہ مروّجہ اصوات و عریض کا پابند کر کے غزل کی شکل عطا کرتا ہے یا پھر اس میں تھوڑی بہت صورتی رعائتیں شامل کر کے آزاد تلازمے کے حوالے سے کوئی نظم مرتب کرتا ہے۔ اس کے تخلیقی سفر کے آغاز میں اس کی غزل کے مقابل ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کے طلسماتی شعری نمونے تھے چنانچہ اپنی شعری شخصیت کو اس سحر سے محفوظ کرنے کی سعی میں وہ بالآخر ایک نئی طرزِ سخن ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خواہش و کاہش کے دوران بعض اوقات ایسے لمحات بھی آئے جہاں وہ شکستہ دلی اور اضمحلال کا شکار نظر آتا ہے:

''تری زباں پہ وہی حرفِ انجمن آرا
مِری زبان پہ وہی حرفِ رائیگاں پھر سے

ابھی حجاب سا حائل ہے درمیاں میں عطّا
ابھی تو ہوں گے لب وحرف راز داں پھر سے“

حرف ولب کے درمیاں وہ جو ایک راز ہے ہر سچے شاعر کی طرح عطاء الحق قاسمی بھی سا راز کی تہہ میں اُترنے کا خواہاں ہے۔ یہ کیسا بھید ہے جو شش جہت سے اُٹھنے والے سوالوں سے پیدا کردہ فکری ہیجانات سے منزلوں دُور ہے۔ وہ اس تشفی سے بھی ماورا ہے جو ہمیں ہمارا شعور کشف یا وجدان جوابات کی صورت میں فراہم کرتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ہماری وجودی حیثیت اپنی کلیت میں کوئی تنازعہ فیہ چیز ہے مگر اس امر سے کیسے انکار ہو کہ ہمارا زیست کرنے کا عمل خود کو تبدیلی اور تغیر سے وقوع پذیر ہونے والی واقعاتی سطح پر اس طرح ہویدا کرتا ہے کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان وہ جو ایک خطِ مفارقت ہے بعض اوقات بہت مٹا مٹا اور بُجھا بُجھا دکھائی دینے لگتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی شاعری اپنی مجموعی حیثیت میں اور بطور خاص غزلیہ اظہار میں ان تبدیلیوں سے رونما ہونے والے واقعاتی تسلسل کی معاملہ بندی کو نہایت خوبصورت طریقے سے بروئے کار لاتی ہے۔

”میں سزاوارِ تعزیر تو ہُوں مگر!
جو مجھے دے رہا ہے سزا کون ہے
ایک شک کی نظر منظروں کی طرف
یہ دیا کون ہے یہ ہوا کون ہے
کیا خبر ان صداؤں کے گرداب میں
کس کی آواز میں بولتا کون ہے“

تو کیا ہم اس تغیر کے تسلسل میں زندہ ہیں جس کی نشاندہی عطاء الحق قاسمی کی شاعری کر رہی ہے۔ ہاں ہم اس تغیر کے زیرِ اثر رونما ہونے والے واقعات کے حُسن اور بدصورتی، ان کی ترتیب اور بے ترتیبی، ان واقعات کے اندر چھپے ہوئے جَور اور جَور کے خلاف اُٹھنے والی آوازوں کے شور میں زندہ ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اس تمام آویزش کار کو ان تمام تضادات کو اپنی نظموں اور غزلوں میں ڈھالتا ہے ان کے اسباب وعلل کے اندر بیٹھ کر گفتگو کرتا ہے اور پھر حرفِ سادہ کے توسط سے اپنی شعری تعمیر کا سلسلہ سچائی کی بنیادوں پر اٹھاتا ہے کہ سچائی اور بڑائی میں معنوی فرق کے باوجود حسیاتی سطح پر جو اس کے تخلیقی وجود کی اصل سطح ہے، اس کی اسی شخصیت کے حوالے سے ہے جو فنّی اہلیت کے اعتبار سے بہت قد آور، بہت تونگر ہے اور مجھے ان دو متصل حقیقتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

☆

غیاث اللغات

ہمارے افسانہ وناول نگار دوست اکرام اللہ ایک لطیفہ سنایا کرتے ہیں۔ ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا ”بتاؤ۔ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟“ اس نے کہا ”چار“ سوال کرنے والے نے پستول نکالا اور ڈز ڈز کر کے اسے مار دیا۔ کسی نے پوچھا۔ تم نے اسے مارا کیوں؟ جواب ملا He Knew too much۔ اب میں اس کا ترجمہ نہیں کروں گا کہ ترجمے سے اس کی کاٹ جاتی رہے گی۔ البتہ میں اپنی پریشانی کا ذکر ضرور کروں گا۔ میری پریشانی یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی دو اور دو چار ہیں۔ جس طرح سب جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس طرح عطاء الحق قاسمی کو سب جانتے ہیں۔ انہیں بھی جانتے ہیں اور ان کی تحریروں کو بھی۔ صرف جانتے ہی نہیں پسند بھی کرتے ہیں۔ اب اگر یہ ہوں کہ میں عطاء الحق قاسمی کے بارے میں ان سے بھی زیادہ جانتا ہوں تو مارا جاتا ہوں۔ اور اگر یہ کہوں کہ میں زیادہ نہیں جانتا تب بھی مارا جاتا ہوں کہ آپ کہہ سکتے ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے تو یہاں لینے کیا آئے ہو؟ لیکن میرے لیے تو ایک اور بھی پریشانی ہے۔ اگر میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بحث شروع کر دوں کہ ان میں طنز ہوتا ہے یا مزاح؟ اور پھر طنز اور مزاح کا فرق بیان کرنا شروع کر دوں تو میں پروفیسروں کے میدان میں چلا جاؤں گا۔ اور میں پروفیسر نہیں ہوں۔ تو پھر میں کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں؟ چلیئے میں طنز ومزاح کے ایک مشہور شاعر کے اس شعر پر اپنی بات ختم کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں:

پہلو میں وہ ہے اور غیاث اللغات ہے
اک منشی فاضل اپنی شریک حیات ہے

---مسعود اشعر

’’رب کا شکر ادا کر بھائی‘‘

صدیق سالک

(●)

کالم نویس عطاء بڑا بے لحاظ ہے۔ کسی کو معاف نہیں کرتا اپنے اخباری کالم میں مسکراتا بھی ہے تو یوں لگتا ہے کہ غصے سے دانت نکال رہا ہے اور اگر تواضع کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ چاقو خنجر یا پستول نکال کر تواضع کرنے والا ہے اور اگر لبریٹا کی گدی پر تھپکی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ’’آ ؤ تھانوں چھڈ آواں‘‘ تو ڈر لگنے لگتا ہے کہ یہ کہیں یہ اپنی پسند کے پولیس اسٹیشن میں نہ چھوڑ آئے۔

اس کی پانی اور آگ کی خصوصیات کا ہدف بالترتیب فرد اور معاشرہ ہیں فرد کو یہ قابل معافی اور لائق تواضع گردانتا ہے لیکن معاشرے کو سیدھے راستے پر چلانے کے لیے تابڑ توڑ چابک برسانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ چابک عام تانگے بان کا چابک نہیں بلکہ پڑھے لکھے باشعور شہری کا چابک ہے۔ کوڑے باز عطاء کا کمال یہ ہے کہ کوڑے برساتا ہے لیکن اخباروں میں احتجاج بھی نہیں ہوتا کہ یہ موجودہ تہذیب و تمدن کے منافی ہے چند کوڑے ملاحظہ ہوں۔ ٹریفک پولیس والوں کے لاؤڈ اسپیکر پر نشر ہونے والے اعلانات کے متعلق لکھتے ہیں:

’’نیلی ٹویٹا والے صاحب! زحمت تو ہو گی مگر براہ کرم اپنی گاڑی زیبرا کراسنگ سے ذرا پیچھے لے جایئے اس سے ٹریفک میں دشواری پیش آ رہی ہے بہت نوازش، شکریہ۔‘‘

’’ویسپا والے صاحب! دائیں جانب مڑنے کی کوشش نہ کریں۔ پہلے مین روڈ کا ٹریفک گزرنے دیں۔ اتنی بے صبری کی ضرورت نہیں۔

’’شکریہ‘‘

’’اوئے سائیکل والے! اندھا ہو گیا ہے، دیکھتا نہیں اشارہ بند ہے، یہ سڑک تیرے باپ کی نہیں ہے۔ دفع ہو جا، شکریہ۔‘‘

پھر بابا جی سے الیکشن کے امیدواروں کی گفتگو کا احوال یوں لکھتے ہیں۔

ایک عقیدت مند نے اپنی انتخاب مہم کے سلسلے میں مشورہ کیا۔

بابا جی نے فرمایا۔

تم نے عوام کی بہت خدمات انجام دی ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے گزشتہ گرمیوں میں تم نے شاہراہ قائداعظم پر پانی کے چار مٹکے رکھوائے تھے عوام کو اپنی یہ خدمات یاد دلاؤ، مولا کرم کرے گا‘‘ ایک اور نے عرض کی ’’حضور! میرے علاقے کے عوام میرے بہت خلاف ہیں میری پارٹی کے لوگ بھی مجھے پسند نہیں کرتے، مجھے کیا کرنا چاہیے۔

فرمایا ’’ان کے پاس جانا چاہیے‘‘ عرض کی ’’گزشتہ کئی دنوں سے جا رہا ہوں مگر وہ منہ نہیں لگاتے‘‘ فرمایا ’’یہ چار دن عوام کے نخرے اٹھانے کے ہوتے ہیں اگر وہ جوتے بھی ماریں تو کھا لینے چاہئیں۔ اس کے بعد دیکھی جائے گی۔‘‘

عطاء کی کالم نویسی کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے عزیز دوست سید ضمیر جعفری بہت یاد آ رہے ہیں جو شاعر، ادیب اور پیر ہونے کے علاوہ کالم نویس بھی ہین۔ ان کے کالموں کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ نوائے وقت، جنگ، اخبار جہاں اور ہلال میں باقاعدہ کالم لکھتے ہیں مگر کیا مجال کہ ان کے قلم سے کسی کو ذرا بھی رنج پہنچے۔ مثلاً اگر وہ اپنے کالم میں کسی کے گنجے پن کا ذکر کریں گے تو اس طرح کہ ’’موصوف کا سر ان کے کردار کی طرح بے داغ اور ان کی زندگی کی طرح کھلی کتاب تھا وہ جب چاندنی رات کو حقہ لے کر آنگن میں بیٹھتے تھے تو ان کے چمکتے ہوئے سر کو دیکھ کر چاند بھی شرما جاتا تھا۔ آخر کیوں نہ ایسا ہوتا کیونکہ ان کا سر ان کے چمکتے ہوئے کردار کی عکاسی کر رہا تھا۔‘‘

یا

وہ میونسپلٹی کے خشک نلکے کا ذکر کریں گے تو کچھ ان الفاظ میں کہ ’’یہ نلکا میونسپلٹی کے نیک ارادوں کا مظہر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اربابِ اقتدار کو اس بات کا علم ہے کہ بعض گھروں میں نلکے نہیں ہوتے اس لیے انہوں نے محلے میں نلکے لگوا دیئے ہیں تو ضرور ایک نہ ایک دن پانی کا بندوبست بھی کر دیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔‘‘

سید ضمیر جعفری کی یہ خوبی اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے دانت گرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ناخن بھی جھڑ گئے ہیں کہ کسی شخص کو کاٹنا تو در کنار اُس کے چٹکی بھی نہیں لے سکتے۔ یہ درحقیقت مرنجان مرنج پیر ہیں جو خطا کار انسانوں کی خطاؤں کی بجائے ان کی خوبیوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان کے برعکس عطاء الحق قاسمی بالکل دوسری وضع کے پیرزادے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں گنج نظر آئے ٹھونگا ضرور مارنا چاہیے کہ پتہ نہیں پھر گنج ملے نہ ملے۔

معاشرے کی خامیوں سے تنگ آ کر افلاطون نے ایک مثالی تصور پیش کیا تھا۔ جس کا ذکر عطاء کی کتاب میں بھی ہے ’’روزن دیوار سے‘‘ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ افلاطون کی طرح عطاء کے ذہن میں بھی ایک مثالی ریاست یا معاشرے کا تصور موجود ہے۔ اور وہ اپنے گردو پیش کے حالات کو اس مثالی معاشرے کے پیمانے سے پرکھتا ہے اور جہاں جہاں اُسے کوئی فرق یا خامی نظر آتی ہے اس کی نشاندہی کرتا ہے مثلاً اگر اس کے مثالی معاشرے میں سب دھوتیاں باندھتے ہیں۔ اور یہاں اسے پتلون پوش نظر آتے ہیں تو یہ پتلون پوشوں کی پتلون اتارنے کے درپے نظر آتا ہے۔ اگر ان کے مثالی معاشرے میں سب باون گزے ہیں اور روزمرہ زندگی میں ان کا واسطہ ٹھنگنے لوگوں سے پڑتا ہے تو یہ ان پر برسنے لگ جاتے ہیں ’’روزن دیوار سے‘‘ پڑھ کر اس مثالی معاشرے کے جو خدوخال ابھرتے

ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہیں کہ وہاں غربت، استحصال، بیروزگاری اور منافقت جیسی لعنتیں نہیں ہوں گی، ہر فرد معاشی ناہمواریوں سے بے فکر آزادانہ زندگی بسر کرنے کا اہل ہوگا کوئی کانا، گنجا، لولا یا اپاہج نہیں ہوگا۔ بسیں نئ ہوں گی۔ ریل گاڑیاں وقت پر چلیں گی۔ ٹیکسی اور رکشا کا کرایہ مناسب ہوگا۔ سکوٹر کے چورنا پید ہوں گے۔ اگر کوئی ضرورت مند اسکوٹر لے بھی جائے گا تو اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد واپس دے جائے گا۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عطا ذہنی طور پر بالغ ہو گیا ہے اس کے تخلیقی ذہن میں نہ صرف خیالات ابھرتے ہیں بلکہ یہ خیالات ایک یوٹوپیہ کی نشاندہی کرتے ہیں میرے خیال میں ہر بڑے لکھنے والے کے ذہن میں یوٹوپیہ ہوتا ہے جس کے بغیر الفاظ کا اینٹ گارا بیکار ہوتا ہے۔

عطا نہ صرف بالواسطہ طور پر ایک مثالی معاشرے کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ کبھی کبھی چلتے پھرتے افلاطون کا روپ دھار لیتا ہے اور طوطوں، گھوڑوں اور بکریوں کی آڑ میں فلسفہ بگھارنے لگتا ہے۔ دو اقتباس ملاحظہ ہوں۔

”میں نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ میں ایک بہت بڑے پنجرے کے قریب کھڑا تھا اس پنجرے میں مختلف قسم کے طوطے بند تھے۔ ان میں سے کچھ بولنے والے تھے اور کچھ ایسے تھے جو بولتے نہیں تھے۔ میں نے علیحدہ علیحدہ ان کی قیمت پوچھی تو دکاندار نے ان کی ایک ہی قیمت بتائی میں نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ خاموش رہنے والے طوطوں کی قیمت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ خاموش رہتے ہیں۔ اور بولنے والے طوطوں کی قیمت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ بولتے ہیں۔“

”میں نے سارے طوطے خرید کر آزاد کر دیئے مگر وہ بازار کا چکر لگانے کے بعد ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے واپس آ گئے۔ وجہ پوچھی تو سنہری گردن والے طوطے نے جواب دیا ”ہم بازار کا چکر لگا کر آئے ہیں سب کاروبار مندا پڑا ہے روزی پنجرے کے باہر نہیں پنجرے کے اندر ہے۔“

اسی طرح ”رب کا شکر ادا کر بھائی“ میں فلسفی عطاء الحق لکھتے ہیں:

”ہم سب کو شکر ادا کرتے رہنا چاہیے جس نے ہمارے لیے گھوڑا بنایا۔ گھوڑا بہت طاقتور جانور ہے یہ میلوں دوڑتا ہے اور اس کا سانس نہیں پھولتا۔ کیونکہ یہ سگریٹ نہیں پیتا۔ اس کی طاقت کا اصل راز یہ ہے کہ سوچنے سمجھنے کی لعنت سے پاک ہوتا ہے۔ چنانچہ گرد و پیش کے حالات اسے پریشان نہیں کرتے۔ ہمیں بھی گھوڑے کی طرح طاقت ور ہونا چاہیے اور کسی تانگے کے آگے جت جانا چاہیے۔“

فلسفیانہ اندازِ فکر کے علاوہ عطا کی جس خوبی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے وہ اس کی جرأت اظہار ہے وہ معاشرے کی قابل گرفت حرکتوں پر دل کھول کر چوٹ کرتا ہے۔ ڈرنے والے تو ادھار دینے والے دکاندار سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ لیکن جو نہیں ڈرتے وہ بھی مذہبی لیڈروں اور سیاسی حاکموں سے یقیناً محتاط رہتے ہیں۔ مگر عطا اپنی نوکری اور اپنے لمبر یٹا کا خیال کیے بغیر ہر دو سے ٹکرا جاتا ہے مثلاً وہ ایک عالم دین کے متعلق کہتے ہیں:

”وہ ایک بڑے سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے اس کے دفتر میں گئے۔ افسر حسب معمول میٹنگ میں تھے۔ یہ صاحب باہر بنچ پر بیٹھے سوکھتے رہے۔ اور گلہ کرتے رہے کہ آئندہ میں اگر کسی سرکاری افسر کے آستانے پر جاؤں تو خدا مجھ سے اپنی رحمتوں کو دور کر دے۔ ہم لوگ دینی پیشوا ہیں اور ہمیں اپنے منصب کا لحاظ کرنا چاہیے۔ ہمارے اکابر کبھی ان لوگوں کے پاس نہیں گئے۔ بلکہ ہمیشہ حکام ان کے در پر جبین نیاز جھکاتے رہے۔ ایک ہم ہیں کہ ان افسروں کے پاس خود چل کر آتے ہیں۔ اور وہ ہم سے ہتک آمیز سلوک کرتے ہیں۔ یہ دنیا کُتّی ہے اس کے لیے خود کو یوں گرانا نہیں چاہیے۔ آئندہ میں کسی افسر کے در پر نہیں جاؤں گا۔ بلکہ جلد ہی وزیر اعظم سے ملاقات کر کے اسی سے گزارش کروں گا کہ کہیں مجھے چار پانچ مربعے زمین الاٹ کر دے۔ جہاں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہوں۔ یہ دنیا کُتّی ہے۔

اسی طرح وہ بھٹو کے عین دور حکومت میں ”ہیرو کامیڈین اور اب ولن“ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

”اسلم پرویز نے فلم انڈسٹری میں بطور ہیرو قدم رکھا تو عوام کے ایک بڑے طبقے نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس میں کچھ دخل ان کی تقدیر کا بھی تھا جس کے نتیجے میں وہ کچھ عرصے کے لیے بطور ہیرو اسٹیبلش ہو گئے۔ اس دوران انہوں نے حُزنیہ اور طربیہ دونوں کردار کامیابی سے ادا کیے۔ اور ایسے مناظر میں ناظرین کو یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ اداکاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ اور ایک عرصے تک بطور ہیرو پردہ سکرین پر نمودار ہوتے رہے۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ جسے ہیرو سمجھ رہے ہیں وہ ہیرو کی صفات سے محروم ہے۔ چنانچہ عوام نے انہیں ناپسند کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا جب لوگوں نے انہیں پردۂ سکرین پر ہیرو کے روپ میں دیکھ کر ان پر آوازے کسنے شروع کر دیے۔ اور صورتِ حال اس حد تک مخدوش ہو گئی کہ اسلم پرویز کو ہیرو کا رول چھوڑ کر فلموں میں جزوی طور پر کامیڈین کے رول ادا کرنے پڑے۔ عوام نے کچھ دیر تک انہیں اس رول میں پسند کیا۔ اور پھر بطور کامیڈین بھی وہ ناکام ہو گئے پھر انہوں نے پردۂ سکرین پر موجود رہنے کے لیے ولن کا روپ دھارا۔ اور اب پاکستان فلم انڈسٹری کے وہ انتہائی نمایاں ولن ہیں۔“

عطاء کی تیسری خوبی جس کا میں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ اس کے کالموں میں تنوع ہے یہ تنوع نہ صرف سیاسی، معاشی، ادبی اور دیگر موضوعات پر پھیلا ہوا ہے بلکہ ہر موضوع پر لکھے گئے کالموں کا ذائقہ بھی منفرد ہے۔ ہم نے بہت سے ایسے کالم نویس دیکھے ہیں جو کئی بڑے ہوٹل کی طرح مشہور اور مہنگے ہوتے ہیں لیکن جو مینو بھی منتخب کر لیں پکوان کا ذائقہ ایک سا رہتا ہے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عطاء ابھی اس اسٹینڈر کو نہیں پہنچا وہ ابھی میسی گیٹ راولپنڈی یا بھاٹی گیٹ لاہور کا عوامی ریسٹورنٹ ہے جہاں لذیذ تکے کباب بھی ملتے ہیں اور تلی

ہوئی چانپیں بھی، مغز کی پلیٹ بھی ملتی ہے اور گردے کلیجی بھی۔ جس کسی کے یہ تکے کباب بناتا یا جس کسی کی چانپیں اتارتا ہے اسے درد تو ہوتا ہے لیکن جب یہ مرچ مصالحہ لگا کر کوئی ڈش قاری کو پیش کرتا ہے تو وہ ضرور لطف اندوز ہوتا ہے۔ میرا انہیں مشورہ ہے کہ وہ پبلک کے پرزور اصرار پر اس دکان کے ساتھ لسی کا تھڑا نہ بنائیں ورنہ ان کی دکان بیٹھ جائے گی لسی کی دکانیں پہلے ہی بہت ہیں۔

چوتھی بڑی خوبی جس کا میں معترف ہوں یہ ہے کہ عطاء کی دکان کا سارا مال پاکستانی ہے آپ کتاب پڑھے بغیر اگر کالموں کے عنوان پڑھ لیں تو آپ کو احساس ہو جائے گا کہ اس کی جڑیں ہمارے معاشرے میں کتنی گہری ہیں مثلاً ادھا پہلوان شیدا پستول، لہور، لہوراے تاریخ رائے ونڈ، براستہ بیڈن روڈ، برگد کے نیچے، کوڑھ کرلی وغیرہ ساری کتاب میں اصلی یا نقلی دو غیر ملکی کردار نظر آتے ہیں ایک غیر ملک سیّاح جو لاہور کا سفر نامہ لکھتا ہے اور دوسرا انکل جیری، یہ دونوں کردار محدب شیشے کا کام دیتے ہیں اور جس معاشرے کے خدوخال اس شیشے کی مدد سے زیادہ اُبھرتے ہیں وہ خالصتاً ہمارا اپنا معاشرہ ہے۔ اس کی خامیاں ہماری خامیاں اور اس کے اوصاف ہمارے اوصاف ہیں۔ اس میں تعزیت کے طریقے چہلم کی رسومات، شادی پر چھوہارے مارنے کی عادت اور دیگر ساری رسمیں ہماری اپنی ہیں۔

میں آج صرف یہ چار خوبیاں گنوانے پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ پہلی کتاب کی پشت پر انہوں نے مزید چھ کتابیں چھاپنے کی دھمکی دی ہے اگر ہر کتاب پر اُن کی چار خوبیاں اجاگر ہوتی گئیں تو ان کی کل خوبیاں ۲۸ ہو جائیں گی جو ان کی عمر کے لحاظ سے ان کے لیے کافی ہیں۔

- بقیہ -

بادشاہ کون ۔۔۔؟

”اوئے جنگل کا بادشاہ کون ہے؟“ گیدڑ نے کہا ”مائی باپ، آپ کے علاوہ کون ہو سکتا ہے!“ اتنے میں ایک ہاتھی سامنے آ گیا۔ شیر نے جسے خوراک ”چڑھی“ ہوئی تھی۔ اسے بھی روکا اور کہا اوئے بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے؟“ ہاتھی نے یہ سن کر جنگل کے بادشاہ کو اپنی سونڈ میں لپیٹا اور اٹھا کر پرے پھینک دیا شیر خفیف سا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا ”قبلہ اس میں اتنا ناراض ہونے کی بات کون سی تھی۔ اگر آپ کو نہیں پتہ تھا کہ جنگل کا بادشاہ کون ہے۔ تو مجھ سے پوچھ لیتے۔ سو دنیا بھر کے جنگل کے بادشاہوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ گیدڑوں اور لومڑیوں پر بے شک ساری عمر اپنی بادشاہت کا رعب جماتے رہیں لیکن اگر کبھی ان کا سامنا کسی ”ہاتھی“ سے ہو جائے تو اس وقت ادھر ادھر ہو جائیں یا کم از کم اس سے یہ نہ پوچھیں کہ ”جنگل کا بادشاہ کون ہے؟“

☆

- بقیہ -

شوقِ آوارگی

والے شاعر بھی۔ وہ پاکستانی بھی جو اہل مغرب سے بڑھ کر مغربی ہو چکے ہیں اور بیوی کے عتاب سے لرزاں وہ خاوند بھی جو بے وقت گھر آنے پر مہمان دوست سے معذرت کراتا ہے الغرض افراد کا جمعہ بازار لگا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ہر کردار انفرادی وجود کے ساتھ کسی خاص طبعاً سوچ تصور یا صورتِ حال کے لیے ایک ٹائپ ایک علامت اور ایک استعارہ بھی قرار پاتا ہے اور ایسی خصوصیت کی بنا پر شوقِ آوارگی محض مغرب کی سیر سے بڑھ کر تخلیقی معنویت کا حامل ثابت ہوتا ہے۔

عطاء نے امریکہ سے وطن واپسی کی یہ جذباتی وجہ بیان کی تھی۔

اس دو سال کے عرصے میں اس ڈانٹ کے لیے ترس گیا ہوں رات گئے واپس آتا ہوں اور کبھی نہیں بھی آتا مگر میرے لیے کوئی آنکھ منتظر نہیں ہوتی کسی نے میری واپسی کے لیے نفل نہیں مانے ہوتے اور کوئی دروازے کے باہر بے چینی سے ٹہل نہیں رہا ہوتا۔

☆

عطاءالحق قاسمی کے ڈرامے

منشایاد

(●)

عطاء الحق قاسمی ایک کثیرالجہات تخلیق کار ہیں۔ خالق کائنات نے انہیں بے حد زرخیز اور شاداب تخلیقی ذہن عطا کیا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر، صفِ اول کے مزاح نگار اور کالم نویس، منفرد سفرنگار اور بہترین ڈراما نگار ہیں۔ ان کے کالموں، مضامین اور ڈراموں کی بنیاد ہمیشہ نہایت اہم اور سنجیدہ موضوعات پر استوار ہوتی ہے جسے ان کا مخصوص طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب نہایت دلچسپ اور مقبول بنا دیتا ہے۔ یہی شگفتہ اسلوب ان کی ساری نثری تحریروں کی کامیابی کی دلیل ہے اور یہ انہیں کہیں سے مستعار نہیں لینا پڑتا ان کے مزاج کا اپنا حصہ ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ خوش طبعی انہیں ورثے میں ملی ہے اور ان کے لہو میں رچی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ثبوت ان کے مرحوم برادرِ بزرگ کی مزاحیہ شاعری ہے اور دوسرا خواجہ اینڈ سن ڈراما، جس کے مرکزی کردار خواجہ فیروز میں ان کے والدِ گرامی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہ ایک جید عالم دین تھے مگر یقیناً ان میں ظرافت، بذلہ سنجی اور شگفتگی کے اوصاف موجود ہوں گے۔ عطا کی بعض زبانی اور تحریری روایتوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

عطاءالحق قاسمی نے بہت سے سیریلز اور سنگل پلیز لکھے جو نہ صرف کامیاب اور مقبول ہوئے بلکہ خواجہ اینڈ سن، شب دیگ، حویلی اور آپ کا خادم کاسیکی کی حیثیت اختیار کر گئے (یہ اسی حیثیت یعنی پی ٹی وی کلاسیک ڈراموں کے نام سے انٹرنیٹ پر موجود ہیں) ’’سارے گامے‘‘ ان کا حال ہی میں ٹیلی کاسٹ ہونے والا سیریل ہے جو پہلے سیریلز کی طرح نہایت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اہم اور مقبول ڈراما علی بابا چالیس چور تھا۔

عطاءالحق قاسمی کے ڈراموں کی اولین خوبی ان کے عوامی کردار ہیں جو زندگی اور معاشرے کے مختلف طبقوں، پیشوں اور شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ سیاست اور الیکشن کے حوالے سے انہوں نے ایک ڈراما ’’آپ کا خادم‘‘ لکھا تھا جس کا مرکزی کردار شیدا ٹلی اتنا مقبول ہوا کہ لوگ ڈرامے کا اصل نام بھول گئے اور اسے شیدا ٹلی کے نام سے یاد کرنے لگے۔ پھر انہوں نے ’’الیکشن کمیشن‘‘ لکھا جو ہماری سیاست اور قومی انتخابات کی بے اعتدالیوں کی سچی عکاسی پر مبنی تھا۔ ان کے دیگر سیریلز میں عام طور پر معاشرتی اور قومی موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان میں ملک اور معاشرے کو درپیش قریباً سارے ہی مسائل اور معاملات سمٹ آتے ہیں۔ ان ڈراموں کا لوکیل زیادہ تر اندرون شہر (لاہور) کی ثقافت اور معاشرت ہے جو ان تمام سیریلز میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں یہ معاشرت اس لیے پسند ہے کہ وہ عوامی کرداروں کے حوالے سے عام آدمی کی بات کرنا چاہتے ہیں نہ کہ اس آسودہ حال (privileged) اقلیت کی وبیس بیس کنال کی کوٹھیوں میں رہتی اور ویسٹرن کلچر کی دلدادہ ہے۔

چنانچہ عطا کے ڈراموں میں زیادہ تر اندرونِ شہر کا ماحول اور کردار ہی ملیں گے یا پھر ایسے کردار جن کا تعلق کبھی دیہات سے تھا مگر وہ ان زمینی تعلقات کو توڑ کر بالائی طبقے میں شامل ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ’’خواجہ اینڈ سن‘‘ میں خواجہ فیروز کا ایک ہی بیٹا جواد ہے اور نو بیٹیاں۔ جنہیں بیاہتے بیاہتے وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ مصنف نے اس ڈرامے کے ذریعہ کثیرالاولاد اور خصوصاً زیادہ بیٹیوں والے خاندانوں کے معاملات، مسائل اور دشواریوں کو نہایت حقیقی رنگ میں مگر دلچسپ طریقے سے پیش کیا ہے اس میں تکنیکی خوبی یہ ہے کہ سیریل میں مختلف قسم کے لوگوں کے بارے میں کئی ایک ٹریکس چلانے کی بجائے ایک ہی شخص کے گھر میں طرح طرح کے لوگ جمع کر دیئے۔ خواجہ کا واسطہ طرح طرح کے دامادوں سے پڑتا ہے۔ ان میں کچھ اچھے اور بیٹوں کی طرح ہیں، کچھ لالچی ہیں، کچھ ہر وقت بلا وجہ ناراض رہنے والے، کچھ حاسد اور سسرال کو نیچا دکھانے والے۔ ایک نے طلاق دے کر اور ذہنی اذیتیں پہنچا پہنچا کر بیوی کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ ایک جواد کا گہرا دوست ہے زاہد، جو زمینوں سے آنے والی خاصی بڑی آمدنی پر عیاشی کر رہا ہے۔ وہ نہایت دولت مند، سمارٹ مگر دل پھینک قسم کا نوجوان ہے۔ مگر خواجہ کی نیک سیرت اور اچھی تربیت والی بیٹی ثمینہ اسے راہ راست پر لے آتی ہے۔ وہ منگنی کے بعد بھی اس کے ساتھ ریستوران میں چائے پینے یا تنہائی میں ملنے کی روادار نہیں۔ اس ڈرامے کے ذریعے بیٹیوں اور داماموں کے معاملات کے علاوہ باپ بیٹے اور بھائی بہنوں کی باہمی محبتوں اور ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کے جذبوں کی بہت عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ لڑکیوں کی والدہ نہیں ہیں لیکن بڑی بہنیں، باپ اور بھائی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے۔ ان گھریلو کرداروں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے شعبوں سے متعلق کردار بھی اس ڈرامے کی کہانی اور دلچسپی میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ جیسے ’’ادارۂ فروغِ درآمداتِ ادب‘‘ کا انچارج افسر پروفیسر اللہ دتہ اُداس جو اپنے ماتحت جواد کے مقابلے میں بہت کمزور شاعر ہے اور دوسروں کے سامنے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی انا کی تسکین کرتا اور اپنے احساس محرومی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس طرح مصنف نے بعض کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس میں شاعروں کے ایسے سادہ لوح پرستار بھی ہیں جو شاعر سے (جواد) سے توقع کرتے ہیں کہ وہ انہیں پہچان لے گا کیونکہ انہوں نے پانچ برس پہلے کسی مشاعرے میں اسے داد دی تھی۔

عطاءالحق قاسمی کا مزاح تخلیق کرنے کا انداز نہایت فطری اور تخلیقی ہوتا ہے۔ جیسے اندرون شہر خصوصا اندرون بھاٹی ولوہاری گیٹ کے بعض لوگ ’’ر‘‘ کی جگہ ’’ڑ‘‘ اور ’’ڑ‘‘ کی جگہ ’’ر‘‘ بولتے ہیں۔ مثلاً ’’چڑیا پھر کر کے اڑ گئی‘‘ کو وہ ’’چریا

پھڑکڑ کے ارگئی'' کہیں گے۔ چنانچہ عطاء الحق قاسمی نے اس سے ایک ایسا دلچسپ اور خوب صورت کردار تخلیق کیا ہے جو لوگوں میں نہ صرف مقبول ہوا بلکہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔ یہ خواجہ فیروز کے پڑوس میں رہنے والی ایک بیوہ ماں کی سیدھی سادی اور معصوم سی جوان لڑکی نبیلہ (ثمینہ خالد) ہے جو کبھی جواد سے اشعار کا مطلب پوچھنے اور کبھی کھیر یا حلوہ کے تحفے کے بہانے گھر میں آتی جاتی رہتی ہے۔ اس کا جواد کو ''جواد جی'' کہہ کر پکارنا، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرنا اور ''ز'' اور ''ڑ'' کو آپس میں تبدیل کر کے خالص پرانے لاہوری لہجے میں ادا کرنا، عوام و خواص میں اس قدر مقبول ہوا کہ آپ ان میں سے کوئی یک حوالہ دے کر کسی سے بھی ڈرامے یا مصنف کا نام معلوم کر سکتے ہیں۔ نبیلہ جس شعر کا مطلب جاننے کے لیے آتی جاتی رہی وہ ''ز'' کی تکرار کی وجہ سے نہایت پر لطف ہے ''یہ آڑزو تھی کہ تجھے گل کے ڑوبڑو کڑتے'' اور اس شعر کا مطلب جاننے کا یہ سلسلہ ڑوبڑو ہو جانے یعنی جواد سے شادی ہو جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ ایسے ہی بے ساختہ اور فطری مزاح کو ظرافت کہتے ہیں۔

مجھے ایک دلچسپ سین یاد آ رہا ہے جس میں باپ (خواجہ) اپنے شاعر بیٹے جواد کو فجر کی نماز کے لیے بیدار کرنے کے لیے کہتا ہے ''یہ جو تم مشاعروں میں عرض کیا ہے، عرض کیا ہے عرض کرتے رہتے ہو تو یہ وقت اٹھ کر اللہ کے سامنے عرض کرنے کا ہے۔ لیکن بیٹا دیر سے جاگتا اور محض سر پر ٹوپی پہن کر اور نمازیوں کا حلیہ بنا کر باپ کو باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ابھی ابھی مسجد سے لوٹا ہے۔ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے وہ ایک اور دور کی کوڑی لاتا ہے کہ مسجد میں قاضی محمود سے ملاقات ہوئی تھی وہ آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ اس پر زمانہ شناس باپ کہتا ہے ''اب ٹوپی اتار دو میں نے دیکھ لی ہے اور بیٹا قاضی محمود اٹک گئے ہوئے ہیں گزشتہ رات ان کا فون آیا تھا۔''

اسی طرح ایک سین میں جواد کو صبح سویرے یاسمین کا جسے وہ پسند کرتا ہے فون آتا ہے تو باپ پوچھتا ہے کس کا فون تھا وہ ٹالنا چاہتا ہے اور جھوٹ بول کر ٹالنا چاہتا ہے کہ کسی فین کا تھا تو خواجہ صاحب کہتے ہیں ''خبیث اتنی سردیوں میں فین سے پرہیز کیا کرو ورنہ نمونیہ ہو جائے گا۔''

خواجہ ایک بہت ہی شاندار کردار ہے۔ ساری اولاد سے محبت کرنے والا لیکن اکلوتے بیٹے کو خبیث کہہ کر ہمہ وقت اس کے انتظار میں رہنے اور اس سے بے پناہ محبت کرنے والا باپ اپنی بیٹیوں میں سے بیمار اور پاگل سمجھی جانے والی بیٹی کا زیادہ خیال رکھنے والا۔ گلی محلے کے لوگوں کا ہمدرد، کشادہ ظرف اور زمانے کے سرد و گرم سے آشنا۔ اس کا کہنا ہے کہ ''انسان کو دنیا میں رہنا چاہیے نہ کہ دنیا انسان کے اندر جیسے کشتی پانی میں رہتی ہے نہ کہ پانی کشتی میں، جس کا انجام ڈوبنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

ہوس دنیا اور دولت پرستی کو اس ڈرامے میں جواد سے محبت کرنے والی یاسمین (ارم کنول) کے باپ چودھری اے ڈبلیو (فخری احمد) کے ذریعے بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اس کی پسند اور مرضی کے مطابق کرنے پر رضامند نہیں ہوتا مگر وہ نئے عہد کی پڑھی لکھی لڑکی ہے اور کسی بے زبان گائے یا بھیڑ بکری کی طرح ہنکائے جانے پر تیار نہیں چنانچہ وہ باپ کی ساری دولت کو ٹھکرا کر اور اسے تنہا چھوڑ کر اپنے انکل کے پاس ٹورنٹو چلی جاتی ہے اور باپ خالی گھر اور دولت کے ڈھیر میں سسکنے کے لیے رہ جاتا ہے۔ اس خوب صورت اور دلچسپ ڈرامے کی ہدایات ایوب خاور نے دی تھیں جو ڈائریکٹر کے علاوہ خود بھی اچھے شاعر ہیں۔ مصنف اور ڈائریکٹر کے علاوہ علی اعجاز، ایم شریف، نبیلہ خالد اور دیگر اداروں کا بھی اس سیریل کی کامیابی میں پورا حصہ ہے۔

عطاء الحق قاسمی کا دوسرا اہم سیریل ''شب دیگ'' تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ایسی دیگ ہوتی ہے جس میں شلجم، گوشت، انڈے، کباب اور دیگر مصالحہ جات ڈال کر اسے رات بھر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس ڈرامہ سیریل میں بھی طرح طرح کے کرداروں، اے کے ریوں، عادتوں، حرکتوں اور سوسائٹی کے گونا گوں مسائل، مشکلات اور معاملات کی شب دیگ تیار کی گئی ہے۔ اس میں بھی اندرونِ شہر لاہور کا ماحول اور زندگی کے مختلف شعبوں، پیشوں اور طبقوں کی نمائندگی کرنے والے کردار ہیں۔ یہ رومانوی ہیرو ہیروئن پر مشتمل روایتی کہانی نہیں ہے بلکہ اس کے زیادہ تر کردار منفی رویوں کے حامل ہیں اور مصنف نے اس منفیت سے مثبت نتائج مرتب کیے ہیں۔ مرکزی یا اہم کردار ایم بی باجوہ (علی اعجاز) ایک دفتر میں ہیڈ کلرک ہے اس کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں اونگا بونگا سے ہے۔ وہ ایک غریب کسان کا بیٹا ہے مگر بی اے کر لینے اور شہر منتقل ہو جانے کے بعد اس نے اپنی زمین اور کلچر سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ وہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے اور انگریزی زدگی سے اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ ہوس زر کے خلاف آواز اٹھانے کے علاوہ عطاء الحق قاسمی کا خاص اور پسندیدہ موضوع اپنی زمین اور کلچر سے وابستگی ہے اور وہ ایسے کرداروں کے مضحک رویوں پر طنز کے تیرہ تفنگ خوب چلاتے ہیں جو اپنی اصل کو بھول کر غیروں کی زبان اور کلچر کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے سیدھے سادے نام مولا بخش کو ایم بی کر لیتے ہیں، انہیں انگریزی نہیں آتی مگر وہ اپنی زبان کو کمتر جاننے اور غلط سلط انگریزی بول کر سمجھتے ہیں کہ وہ بالائی طبقوں میں شامل ہو گئے۔ ایم بی باجوہ گاؤں کے ماحول سے بھاگ آیا ہے۔ وہ گاؤں کی کسی ان پڑھ لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ ایک انڈسٹریلسٹ باپ کی بیٹی کے چکر میں ہے تا کہ وہ اس سے شادی کر کے دولت مند ہو جائے۔ وہ اس قدر احساس کمتری کا مارا ہوا ہے کہ اپنے سگے بوڑھے باپ کو جو گاؤں سے اسے ملنے آتا ہے۔ لوگوں سے چھپا کر اندر بند رکھتا ہے۔ ایک تو وہ اسے اصل نام (مولا بخش پتر) سے بلاتا ہے پھر اس کا حلیہ دیہاتیوں جیسا ہے۔ باجوہ کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے دوستوں کے ڈیڈیوں کو دیکھا ہے کیا پرسنیلٹی ہوتی ہے۔ باپ کو Presentable ہونا چاہیے۔ شہر میں مشکل سے عزت بنائی ہے جسے خبطی میاں بیوی (باپ) خراب کر دیں گے۔

مصنف نے مولا بخش ہی کی طرح ایک زنانہ کردار روشین (کنول) بھی تخلیق کیا ہے۔ یہ وہی انڈسٹریلسٹ باپ کی بیٹی ہے جسے باجوہ دولت کی خاطر پھانسنا چاہتا ہے مگر اس خاتون نے بھی ایک جھوٹی کہانی گھڑ رکھی ہے کہ وہ ایک بڑے صنعتکار باپ کی بیٹی ہے اور پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔ باجوہ کی طرح وہ بھی کسی اہل ثروت کو پھانسنے کا ارادہ رکھتی ہے اور باجوہ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ دونوں فراڈ کردار ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے اور ایک دوسرے کو دھوکا دیتے رہتے ہیں لیکن پھر ڈرامائی سچوایشن پیدا ہو جاتی ہے وہ ایک دوسرے کو سچ مچ پسند کرنے لگتے ہیں اور جھوٹ کھل جانے اور اصل حیثیتیں سامنے آ جانے کے بعد دونوں اعتراف کر لیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے۔ روشین کہتی ہے ''میں معمولی مالی کی بیٹی ہوں۔ کسی محل میں نہیں بلکہ دو کمروں کے چھوٹے سے کوارٹر میں پل کر بڑی ہوئی۔ یہ تو نو دولتیوں کے دیے ہوئے خواب تھے جن کی وجہ سے مجھے اپنی ماں کو آیا قرار دینا اور بیمار ماں کو چھوڑنا پڑا۔''

تاہم واقعات اور حالات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے چہرے پر روشنی کا ماسک چڑھانے کا قصور ضرور کیا مگر اپنے چہرے پر کالک نہیں لگنے دی۔

شب دیگ کے دیگر کردار بھی آس پاس ہی رہتے ہیں۔ جس مکان کی نچلی منزل میں افسر سجاد شاہ (سہیل احمد) اور ہیڈ کلرک ایم بی باجوہ کا دفتر ہے اس کی بالائی منزل میں مکان کی مالکہ کی بیٹیاں اور بیٹا منا پہلوان مقیم ہیں۔ منا ہڈیوں اور جوڑوں کا نیم خواندہ عطائی یا جعلی ماہر ہے اور اس نے گھر کے باہر بورڈ لگا رکھا ہے ''جوڑ توڑ کا بین الاقوامی ماہر کا کا منا''۔ اس کے ''کلینک'' میں ایک پلنگ بچھا ہوا ہے جسے وہ آپریشن تھیٹر کہتا ہے اور خود کو جوڑوں اور ہڈیوں کا ڈاکٹر قرار دیتا ہے۔ وہ اپنی الٹی پلٹی تھراپیوں، دواؤں اور مالشوں سے مریضوں کی بیماری کو بڑھاتا اور پیچیدگیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے غلط علاج سے اس کے بہنوئی کو اپنی ٹانگ کٹوانا پڑ جاتی ہے۔

لیکن عطاء الحق قاسمی نے اس کردار کے ذریعے مزاح کی بہت دلچسپ سچوایشنز پیدا کیں اور دیکھنے والوں کو خوب ہنسایا۔ منے کو ماں ''کا کا منا عقل کا انھا'' کہتی ہے اور ٹھیک ہی کہتی ہے وہ گنجا اور بے ڈھب سا آدمی ہے (عرفان پاشا) مگر خود کو بہت سمارٹ اور ہینڈسم سمجھتا ہے۔ اور نیلم جیسی خوب رو لیڈی ڈاکٹر سے محبت کرتا ہے، ماں سے اکثر جلد اپنی شادی کی فرمائش کرتا رہتا ہے ''ماں اب تو مجھے بڑا ہوئے بھی سینکڑوں سال ہو گئے ہیں۔ میں کب ہنیاں مونیاں مناؤں گا۔''

ماں کہتی ہے: ''ابھی تمہاری چار بہنیں بیٹھی ہیں۔''

''وہ کھڑی کیوں نہیں ہو جاتیں خود ہی تھک جائیں گی۔''

منے کا تکیہ کلام ہے فلاں چیو کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ بعض الفاظ کو اپنی مرضی کے معنوں میں استعمال کرتا ہے جیسے میانہ روی۔ ماں جی یہ تو آپ کی میانہ روی (مہربانی) ہے۔ مریض آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رزق آیا ہے۔ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کا ڈاکٹر نیلم سے نکاح ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب نکاح پڑھا رہے ہیں۔ منا دو بار قبول ہے قبول ہے کہہ چکا ہے کہ ماں جگا دیتی ہے اس پر وہ احتجاج کرتا ہے کہ آپ تھوڑی دیر بعد نہیں جگا سکتی تھیں۔ صرف ایک بار اور قبول ہے کہنا باقی تھا۔

اس ڈرامے کے دیگر مضحک کرداروں میں سجاد شاہ (سہیل احمد) باس کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جو ہمارے احساس کمتری میں مبتلا مطلبی، خوشامد پسند، ماتحتوں پر ہمہ وقت رعب جھاڑنے والے اور نااہل بیوروکریٹوں کی علامت ہے۔ کہتا ہے میں جس ضلع میں بھی افسر جا کر لگتا ہوں مجھے وہاں کے لوگ سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں اور میں بھی مان لیتا ہوں۔

ایک اور کردار دلچسپ کردار ''انکل کیوں'' کا ہے اس کردار کی تخلیق میں مصنف نے بے حد ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ انکل کیوں بظاہر خبطی سا شخص ہے مگر وہ نہایت سنجیدہ سوالات اٹھاتا رہتا ہے۔ اس کردار کی تخلیق اس لیے بھی قابل داد ہے کہ وہ باتیں اور ان گنت قومی نوعیت کے بڑے بڑے سوالات جن کے اظہار کے لیے بہت تردد کرنا پڑتا ہے وہ اس کردار ''کیوں'' کے ذریعے نہایت آسانی اور سہولت سے اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ان بے شمار لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جنہیں قدم قدم پر معاشرتی اور قومی حوالے سے تضادات نظر آتے ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ آخر ایسا کیوں ہے اور کب تک ایسا ہوتا رہے گا؟ مثلاً انکل کیوں پوچھتا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ ملک معرض وجود میں آیا تھا وہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی کیوں پورا نہیں ہوا۔ انکل کو پولیس آوارہ گردی میں پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے۔ وہ سیدھا سادا معصوم آدمی وہاں وہ خود کو آزاد ملک کا معزز شہری اور انسانی مساوات و حقوق کے دعویدار معاشرے کا فرد سمجھ کر کرسی پر بیٹھنے کی جسارت کرتا ہے جس پر اس کی خوب پٹائی کی جاتی اور اسے باور کرایا جاتا ہے کہ عام اور غریب آدمی کی کوئی عزت اور وقار نہیں ہوتا۔ تب اس کا کیوں کہنا بہت ہی معنی خیز بن جاتا ہے ایک بار جب وہ گٹر میں گر کر زخمی ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ کافر ملکوں (یورپ) میں بلی کا بچہ بھی زخمی ہو جائے تو کرلاٹ مچ جاتا ہے مگر ہمارے ہاں سڑکوں پر جگہ جگہ موت کے ٹوئے کھودے ہوتے ہیں اور آدمیوں کو کیڑے مکوڑے سمجھا جاتا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آخر کیوں؟

اس سیریل کے دیگر اہم اور دلچسپ کرداروں میں زن مرید قسم کا الیاس اور اس کی شوہر کو ملازم کا درجہ دینے اور آخرکار تنہا رہ جانے والی بیوی ہیں۔ ایم اے انگلش کرنے کے بعد ٹیکسی کار چلانے پر مجبور طارق قریشی (سہیل اصغر) ہے جس نے اپنے والدین اور زمانے کے ہاتھوں اتنی نفرتیں دیکھی ہیں کہ اس کا محبت کے لفظ اور جذبے سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا سب اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ جسے محبت میں چھوڑ

دیا جاتا ہے وہی آہیں بھرتا ہے۔ جو چھوڑتا ہے اسے آہیں بھرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ باجوہ کے پوچھنے پر کہ وہ محبت کرنے والی عذرا (گل رعنا) سے شادی کیوں نہیں کر لیتا، بتاتا ہے کہ جب میں چھوٹا تھا میرے باپ نے دوسری شادی کر لی اور میری ماں کو میرے سمیت گھر سے نکال دیا۔ اس نے گھروں میں برتن مانجھے اور مجھے پڑھایا۔ بڑا ہوا تو ایک روز باپ اس ریستوران میں آ نکلا جہاں میں مالک کے بچے کو کھانا کھلا رہا تھا میرا باپ اپنی نئی بیوی کے ساتھ میرے قریب سے گزرا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا مگر پھر میرے دل کو کچل کر میرے پاس سے گزر گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سارے رشتوں کو بے وقعت ہوتے دیکھا ہے۔ شادی کے بعد رشتہ دار پروٹوکول کے مطابق ملتے ہیں۔ اس معاشرے میں بچوں والے ملازم بچوں پر تشدد کرتے ہیں۔ بیٹیوں کے باپ دوسروں کی بیٹیوں سے جہیز طلب کرتے ہیں۔ گھروں، فیکٹریوں اور قالین بافی کے کارخانوں میں بچوں نوکروں پر تشدد کیا جاتا ہے۔ جوان بیٹیوں کے باپ عزت اور غیرت کے نیلام گھروں میں بڑھ چڑھ کر بولی لگاتے ہیں۔ بیواؤں کے سر سے چادر کھینچنے والے بہت ہیں مگر سر ڈھانپنے والے بہت کم ہیں۔ یہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ میں نے ہر رشتے کو بے وقعت اور بے توقیر ہوتے دیکھا ہے۔ یہاں محبت اور وفا سب عبث۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مقابلے کا امتحان بھی اسی لیے دینا چاہتا ہے کہ اپنے محدود دائرے میں ہی سہی اس بگڑے ہوئے نظام کو ٹھیک کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

دیگر قابلِ ذکر کرداروں میں باجوہ کا دوست شبن میاں ہے جو اردو سپیکنگ فیملی سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ پنجابی زبان کا بڑا دلدادہ ہے اور اردو کے لہجے میں پنجابی بولتا رہتا ہے جو بہت اچھی لگتی ہے پھر دودھ فروش جیدا پہلوان ہے جس کی دکان پر شبن میاں کو پنجابی بولنے کا خوب موقع ملتا ہے۔ منھے کی نیم گونگی بہن ہے جو بھائی کے زخمی ہو جانے پر اضطراری حالت میں اچانک ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولنے لگتی ہے۔ طارق قریشی کا بھائی عمر دار (جمیل بسمل) ہے جس کی دلچسپ گفتگو سے محفل اور ماحول خوش گوار ہو جاتا ہے۔ ایک اور کردار ہے مشتاق جس کا منھا غلط علاج کرتا اور اسے ٹانگ کٹوانا پڑتی ہے۔ اس کا منھے کی گونگی بہن سے نکاح ہو جاتا ہے۔ منھے کی بہنوں میں بڑی عذرا ہے جو طارق قریشی سے خاموش محبت کرتی ہے یہ کردار مشرقی اور باحیا پاکستانی لڑکی کی خوب صورت مثال ہے۔ لیکن مولا بخش باجوہ کے بوڑھے اور اونچا سننے والے باپ اللہ بخش (فخری احمد) کا کردار بے حد دلچسپ ہے۔ ایک تو وہ اونچا سنتا ہے۔ پھر خبطی سا ہے جیسا کہ اس عمر کے دیہاتی بوڑھے عام طور پر ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت بے وجہ اور بلا ضرورت سوالات کرتا رہتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اسے جملے یا گفتگو کے سارے الفاظ سنائی دیتے ہیں سوائے کلیدی لفظ کے، جس کے بارے میں اسے پھر سوال در سوال کے کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کو ہمیشہ عجیب و غریب اور انوکھی باتیں سوجھتی رہتی ہیں جن سے وہ مزاحیہ سچوایشن پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کردار میں بھی انہوں نے ایسی ہی ایک اور انوکھی بات پیدا کر لی۔ ملتان کا نام اس کے ذہن یا سائیکی میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ وہ ہر کسی سے پوچھتا ہے کہ وہ ملتان سے آیا ہے یا اسے ملتان جانا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بیٹے سے کہتا ہے دفتر جا رہے ہو تو ملتان والے حکیم سے میری دوا لیتے آنا۔ اس کے قریب بیٹھنے والا تھوڑی ہی دیر میں اس کے سوالوں اور ملتان آنے جانے کی باتوں سے زچ ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ ’’شکر ہے، شکر ہے‘‘ اس کا تکیہ کلام ہے اور وہ ہر بات پر بلا وجہ ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ ٹوپی ہے۔ شکر ہے شکر ہے۔ تم ملتان نہیں گئے شکر ہے شکر ہے۔ غرض یہ کہ عطاء الحق قاسمی نے خواجہ اینڈ سن کی طرح اسے ڈرامے میں بھی طرح طرح کے کرداروں کی کہکشاں سجائی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے مزاح کے لیے عام مزاحیہ ڈراموں کی طرح کسی اچھل کود یا کرداروں کی اوچھی حرکتوں یا لفظی بازی گری سے کام نہیں لیا۔ اس نے ہمیشہ مزاح تخلیق کرنے کے لیے سچوایشن پیدا کی یا مضحک کردار تخلیق کیے ہیں جو اپنے مزاج اور شخصیت کے عین مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں اتنی شگفتگی اور برجستگی ہوتی ہے کہ انہیں کسی اچھل کود یا اوور ایکٹنگ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

عطاء الحق قاسمی کے ڈرامے اس لحاظ سے مختلف اور منفرد ہیں کہ ان میں زمین کی بو باس، پاکستانیت اور اپنی تہذیب و ثقافت سے قربت و محبت صاف اور غیر مبہم طریقے سے پیش ہوئی ہے۔ دوسرے یہ مجموعی طور پر ایک بڑی علامتی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں اور گھر یا کنبہ پھیل کر ایک ملک اور معاشرے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا سیریل ’’حویلی‘‘ بہت ہی واضح مثال ہے۔ ایک بہت بڑی حویلی (پاکستان) میں رہنے والے ایک شخص بشارت (بانی پاکستان) کے پانچ بیٹے (صوبے) ہیں جو اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ اس حویلی میں رہائش پذیر ہیں۔ چاروں بھائی اپنے اپنے کام دھندے میں لگے ہوئے ہیں مگر پنا چواں اداس اور خاموش رہتا ہے۔ غالباً یہ مشرقی پاکستان کی علامت ہے جو اپنے چاروں بھائیوں سے روٹھ جانے والا پانچواں بھائی تھا۔ حویلی کا آغاز باپ کی اس نصیحت سے ہوتا ہے کہ کھانا حلق سے اتارنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ وہ پاکستان میں رہنے والے سارے لوگوں کو یہ نعمت عطا فرمائے۔ اور دعا کرو کہ اس میں رحمتوں اور محبتوں کا وہ نظام نافذ ہو جائے جس میں کوئی بھائی دوسرے بھائی کا حق نہ مارے اور جس میں کوئی کسی سے بڑا اور چھوٹا نہ ہو۔ میرے بعد تم اس حویلی کے وارث ہو تم انصاف کی راہ پر چلنا اور ایک دوسرے سے محبت سے پیش آنا۔

میں سمجھتا ہوں کہ عطاء الحق قاسمی نے اپنے ڈراموں میں اپنے نظریات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی زبان سے وقتاً فوقتاً ایسی باتیں کہلواتے رہتے ہیں جن پر عمل کر کے ہم اپنے پیارے اور خوب صورت ملک کو امن و آتشی کا گہوارہ اور اپنے معاشرے کو صحیح طور پر ایک ترقی یافتہ معاشرہ بنا سکتے ہیں۔

”لفظوں کے زیروبم“

(قاسمی صاحب کے نظمیہ کلام سے بصد انکسار)

فاری شا

(اسلام آباد)

تمہارے رستے میں روشنی ہو!

(کشمیری مجاہدین کے لیے ایک نظم)

میں کتنا نازاں ہوں اپنے لکھے ہوئے
حروفِ شگفتگی پر
میں سوچتا ہوں خدا نے مجھ کو ہنر یہ کیسا عطا کیا ہے
کہ میرے لفظوں کو خلعت فاخرانہ دے کر
مرا نصیبہ جگا دیا ہے
میں لاکھوں لوگوں کے آنسوؤں کو
میں ان کی افسردہ خواہشوں کو
میں ان کے پھیلے ہوئے دکھوں کو
سمیٹ لیتا ہوں اپنے دامن میں
میں اپنے ہنستے ہوئے قلم سے
میں اپنے لفظوں کے زیروبم سے
انہیں غموں سے نکالتا ہوں

* * *

تمہارے لیے ایک نظم

میرے دل میں تم اُس شہر کی صورت بستے ہو
جس کی گلیاں دھوپ سے روشن ہیں، اور جس کے
بام دریچے چاندرو پہلی کرنوں جیسی
آہٹ سنتے ہیں
میرے دِل میں تم اُس شہر کی صورت بستے ہو
جس میں گھنے درختوں، گہری چھاؤں، سبز ہواؤں کی
ریکھائیں روشن ہیں
جس کے دونوں جانب ابھرے، سفید گلابوں کے سائے میں
ریشم ریشم ساحل والی ایک ندی ہے
میں اس شہر کے پھولوں، ریشمی ساحل
گھنے درختوں، گہری چھاؤں، سبز ہواؤں میں رہتا ہوں
میں اس شہر کے سارے رستوں سے واقف ہوں
یہ وہ شہر ہے جس میں میری عمریں بیت گئی ہیں
یہ وہ شہر ہے جس میں میرے آنے والے دِن رہتے ہیں

* * *

ایک فلرٹ لڑکی

مجھ کو اپنا کہتی تھی
مجھ سے بھی وہ ملتی تھی
اُس کے ہونٹ گلابی تھے
اُس کی آنکھ میں مستی تھی
میں بھی بھولا بھٹکا سا
وہ بھی بھولی بھٹکی تھی
شہر کی ہر آباد سڑک!
اُس کے گھر کو جاتی تھی!
لیکن وہ کیا لڑکی تھی!
لڑکی تھی کہ پہیلی تھی!
اُلٹے سیدھے رستوں پر

* * *

پینٹنگ

میری آنکھیں دیکھتی ہیں روز و شب ایسا تماشا
جو کبھی دیکھا نہ تھا
رنگ اُڑتے ہیں فضاؤں میں، ہواؤں میں
خلاؤں میں
''اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن''
پھر یہ سارے رنگ مل جاتے ہیں اک نقطے پہ یوں
جیسے یہ نقطہ ہی ان کا نقطۂ آغاز ہو
اور میری آنکھیں یہ منظر دیکھتی ہیں
ایک ہیولا دور سے اُڑتا ہوا آتا ہے
اور یہ سارے رنگ
اس میں سمانے لگتے ہیں
اک شکل بنانے لگتے ہیں
مجھ ہجر نصیب مسافر کو
کچھ یاد دلانے لگتے ہیں!

○

ایک لانگ ڈسٹینس کال

تمہارا خط مجھ کو مل گیا ہے
ابھی پڑھا ہے
مجھے تو بس اتنا پوچھنا ہے
اداس کیوں ہو؟ اداس کیوں ہو؟
تمہاری آواز اتنی مدھم ہے
ایسے لگتا ہے
جیسے اپنے ہی کان میں
کوئی بات کہہ کر سمجھ رہے ہو
کہ بات مجھ تک پہنچ گئی ہے
تمہاری آواز
راستوں کی مسافتوں میں بھٹک رہی ہے

○

ٹریفک سگنل

''میں عہدِ رفتہ کو ڈھونڈتا ہوں
نئی کتابوں کے معبدوں میں
پرانے لفظوں کو پوجتا ہوں
بشارتوں کا میں منتظر ہوں''

○

الہ دین کے جن کا زوال

عطاء الحق قاسمی

الہ دین کا چراغ نسل در نسل ہوتا ہوا جب الہ دین ہفتم کے ہاتھ آیا (جو ایک سیدھا سادا انسان تھا) تو اس نے باپ کی وفات کے اگلے ہی روز چراغ زمین پر رگڑا جس سے فضا میں دھواں پھیل گیا اور پھر اس دھوئیں میں سے ان کا خاندانی جن خوفناک قہقہے لگاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے بازو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے تھے اور قد آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

جب یہ دھواں چھٹا اور اس قوی ہیکل جن کی دہلا دینے والی آواز فضا میں گونجی:

"کیا حکم ہے میرے آقا؟"

الہ دین ہفتم نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کہا:

"ذرا دوڑ کر نکر والی دکان سے میرے لیے ایک سانچی پان لاؤ۔"

جن کو اپنے نئے باس کے اس حکم کی تعمیل میں بڑی شرم محسوس ہوئی مگر اس نے تعمیل کی اور دوبارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

الہ دین نے اسے حکم کا منتظر پایا تو کہا:

"میں نہانا چاہتا ہوں۔ بالٹی اٹھاؤ اور سرکاری نلکے سے پانی بھر کر اسے صحن میں رکھ دو۔"

"جن کو اگرچہ ایک بار پھر بڑی سبکی محسوس ہوئی مگر اس نے "جو حکم میرے آقا" کہا اور غائب ہو گیا۔

نہانے سے فراغت پا کر الہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی، فضا دھوئیں سے بھر گئی اور پھر خوف ناک قہقہے لگاتا ہوا جن نمودار ہوا۔

اس نے جھک کر کہا:

"کیا حکم ہے میرے آقا؟"

الہ دین نے کہا:

"بازار سے سبزی وغیرہ لے کر آؤ اور میرے لیے جلدی سے کھانا تیار کرو۔ بڑی بھوک لگی ہے!"

یہ سن کر جن بہت شرمسار ہوا اور گردن جھکا کر بازار کی طرف چل پڑا۔

کھانا وغیرہ کھا کر الہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر جن ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا نمودار ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ الہ دین نے حکم دیا:

"ہمسایوں سے تھوڑی پتی مانگ کر لاؤ اور چائے بناؤ"

یہ سن کر پسینے کے قطرے جن کی پیشانی پر نمودار ہوئے جو اس نے فوراً ہاتھ سے پونچھ ڈالے اور بادلِ نخواستہ حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ دن، مہینے اور سال گزرتے گئے اور وہ اپنے آقا کی خدمت میں اسی طرح مشغول رہا۔ اس کے کپڑے دھوتا، استری کرتا، جوتے پالش کرتا، برتن مانجھتا اور نکّر کی دکان سے اس کے لیے پان اور سگریٹ خرید کر لاتا اور پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

اس دوران جن میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی جسامت پہلے سے بہت کم ہو گئی اس کا قد بھی گھٹتا چلا گیا اور اس کے قہقہوں کی گونج بھی مدھم پڑ گئی۔ ایک اور تبدیلی اس میں یہ رونما ہوئی کہ الہ دین کے چراغ رگڑنے پر وہ کاندھے پر رومال رکھے نمودار ہوتا اور:

"کیا حکم ہے میرے آقا؟" کی بجائے "کیا حکم ہے صاحب جی؟" کہتا۔ یہ جن آہستہ آہستہ اپنی پہچان بھولتا جا رہا تھا۔

سو الہ دین کے اس جن کی نقاہت اب روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ اس کا قد گھٹتے گھٹتے اپنے آقا کے قد کے برابر ہو گیا۔ اس کے بازو اب مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے نہیں تھے بلکہ وہ سکڑ کر اپنے آقا جتنا ہی رہ گیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کی کمر میں درد ہونے لگا اور پٹھے بھی درد کرنے لگے جس کے لیے وہ باقاعدگی سے "سر بیکس ٹی" کھانے لگا تاہم وہ اب بھی اپنے "صاحب جی" کی خدمت میں ہمہ تن مشغول رہتا۔

اس دوران الہ دین کو اپنے محلے کی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا مگر سخت نگرانی کی وجہ سے اس کے ساتھ نامہ و پیام کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ایک روز الہ دین نے چراغ رگڑا، ایک معمولی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر دھوئیں میں سے مدقوق چہرے والا جن نمودار ہوا۔

الہ دین نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا:

"یہ رقعہ بلیلہ کو دے آؤ۔"

جن کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ابھرے اور اس نے کہا:

"صاحب جی! میں جن ہوں کوئی۔۔۔"

مگر الہ دین نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی دس کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ جن کی "سر بیکس ٹی" کی شیشی ختم ہونے والی تھی سو اس نے یہ نوٹ جیب میں ڈالا اور جھینپتے جھینپتے وہ رقعہ بلیلہ تک پہنچا آیا بلکہ اس کی موثر کارکردگی کو دیکھ کر محلے کے دوسرے نوجوان بھی اب اس سے یہ خدمت لینے لگے۔ شروع شروع میں اسے اس کام سے ندامت محسوس ہوتی تھی مگر پھر یہ اس کی عادت بن گئی۔ اس دوران وہ خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا۔ اب وہ پہلے سے کرّ و فر والا جن نہیں تھا بلکہ وہ اپنی شناخت بھول گیا تھا سو اَب اسے بلانے کے لیے چراغ رگڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ کاندھے پر رومال رکھے، دھوتی اور بنیان

پہنے ایسے ہی سب کی نظروں کے سامنے پڑا رہتا۔ اس کا قد اللہ دین کے قد سے بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب اللہ دین نے اسے بلانا ہوتا تو وہ اسے ”اوئے چھوٹے! ادھر آؤ“ کہہ کر آواز دیتا۔

ایک دن اس نے اللہ دین سے کہا:

”صاحب جی! اگر اجازت دیں تو میں کہیں اور کام تلاش کر لوں۔ آپ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس میں آپ کا اپنا گزارہ بھی نہیں ہوتا۔“

اللہ دین یہ سن کر جھینپ گیا اور پھر اس نے رضامندی کے اظہار کے لیے ہولے سے اپنی گردن ہلا دی!

سو یہ جن آج کل بابو ہوٹل میں ملازم ہے اور ”چھوٹے اوئے“ کی آواز سن کر تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ایک میز سے دوسری میز کی طرف جاتا ہے۔ کبھی کبھی اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے تو اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے بازو اور آسمان سے باتیں کرتا ہوا قد! بڑے بڑے بادشاہوں کے محلات کو اپنی ہتھیلی پر اٹھا لینے والا ماضی! چشم زدن میں نئی دنیائیں تعمیر کرنے والا ماضی! چنانچہ ان لمحوں میں وہ دوبارہ جن کے روپ میں آنے کے لیے اپنی تمام قوتیں جمع کرتا ہے۔

مگر۔۔۔ اپنی اس تمام تر کوشش کے نتیجے میں وہ سگریٹ کے دھوئیں جتنے مرغولے میں سے اپنی دکھتی کمر پر ہاتھ رکھے نمودار ہوتا ہے۔ اس پر وہ مارے ندامت کے سر جھکا لیتا ہے اور ہولے سے کہتا ہے:

”میں بڑے کرّ و فر والا جن تھا مگر میرے آقاؤں نے مجھے کمزور کر دیا“

اور پھر ایک دم خوفزدہ ہو کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے کہ کہیں کسی نے یہ سن تو نہیں لیا کہ وہ کبھی بڑے کرّ و فر والا جن تھا!

☆

۔ نورِ شمع ۔

نورِ شمع نور صاحبہ کی شاعری جس امید کے جھروکے سے دنیا کو دیکھتی ہے، وہ ان کی کتابوں کے عنوانات سے بھی عیاں ہے، کلام سے تو ہے ہی۔ یعنی ان کی دو کتابیں ”وسعتِ امکاں“ اور ”دستکِ امکاں“۔ ان کی شاعری کا فلسفہ ہی امکان اور رجائیت ہے اور ان دونوں کتابوں میں موجود کلام اسی سے عبارت ہے۔ اس حوالے سے ان کی دوسری کتاب ”دستکِ امکاں“، پہلی کتاب ”وسعتِ امکاں“ ہی کا تسلسل ہے، یعنی یہ ایک مسلسل سفر کے دو فطری پڑاؤ ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں شامل نظمیں بہت خوب ہیں۔ یوں تو ان کے ہاں پابند نظم بھی ہے، معرّٰی بھی اور آزاد بھی لیکن پابند اور معرّٰی نظموں کا تناسب زیادہ ہے۔ نورِ شمع نور صاحبہ کی نظم، رومان اور ترقی پسندی کے بین بین، اپنے بعد آنے والوں کو اور اپنے اطراف کے لوگوں کو حوصلے، امید اور عزم کا پیغام دیتی ہے۔ ان کے ہاں سماج کے ابتذال پر شدید تنقید ہے، جو محض وقت کا نوحہ نہیں ہے بلکہ جبر اور ابتذال کے نقش ابھارنے کا عمل بہت واضح اشاروں میں نظر آتا ہے۔ وہ نظموں میں استعارے خوب استعمال کرتی ہیں، خصوصاً ”وسعتِ امکاں“ میں جا بجا ترکیبیں اور اضافتیں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں جوش کے ساتھ مزاحمت، احتجاج اور فردا پر نظر بھی ہے اور ایک مسلسل ترغیب بھی۔ اگر ماضی کے لیے رومان ہے تو ساتھ ہی روشن مستقبل کی تلاش بھی ہے۔ میرے خیال میں وہ تشبیہات، استعاروں اور مضامین کے معاملے میں فیض صاحب سے شعوری طور پہ متاثر ہیں۔ مضامین کی سطح پہ ان کی نظموں میں مزاحمت، احتجاج، بغاوت اور ماحول کے جبر میں انقلابِ بہار کی تلاش اور یقین اس بات کا ثبوت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کے کلام میں سماجی شعور بہت واضح ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا چلوں کہ ان کی واردات پر مبنی نظمیں بہت خوب ہیں۔ آخر میں چند مثالیں عنوانات کی حد تک بھی دینا چاہوں تو ”دستکِ امکاں“، جس میں معرّٰی نظمیں زیادہ ہیں، ان میں کئی نظمیں انتخاب کا حصّہ بن جائیں گی۔ ان میں ”وہ دن“ اور ”زخمِ تمنّا“ کا ذکر کرتا چلوں جو کسی شکستِ آرزو کے لمحے یا عرصے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ جبکہ ”وسعتِ امکاں“ میں پابند نظمیں زیادہ ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور ان میں کئی اور نظموں کے علاوہ ”آج کا فرہادؔ“ اور ”دیواروں کا مسافر“ سماجی معاملات پر بڑی کاٹ دار نظمیں ہیں۔

فیصل عظیم
(کینیڈا)

”تشکیلِ کائنات“

نعت رسول مقبول ﷺ

احسان یہ بھی ہم پہ ہمارے نبیؐ کا ہے
دِکھلایا ہم کو راستہ جو راستی کا ہے

اِک مصرعے میں ہو شبِ معراج یوں بیاں
”یہ روشنی کی سمت سفر روشنی کا ہے“

حاضر مَیں کس مقام پہ ہوں، جانتا ہوں میں
دیوانگی میں ہوش بھی فرزانگی کا ہے

پھَیلے جہاں میں سیرتِ اطہرؐ کی روشنی
حقاً کہ بس علاج یہی تیرگی کا ہے

کیا کیفیت ہے روضۂ اطہر کے سامنے!
عالم ہی یہ تو اَور کسی سرخوشی کا ہے

تشکیلِ کائنات کا ہیں آپؐ ہی سبب
جو کچھ بھی کائنات میں ہے، آپؐ ہی کا ہے

اُس در پہ حاضری کا شَرَف جو عطا ہُوا
میرے لئے پیام نئی زندگی کا ہے

لَوٹا ہوں حال ہی میں وہاں دے کے حاضری
پھر انتظار مجھ کو وہیں واپسی کا ہے

حاصل یہ عُمر بھر کی ریاضت کا ہے نسیمؔ
اُن کی گلی میں جانا سفر آگہی کا ہے

نعتِ رسولِ پاکؐ ہی لکھتا رہوں نسیمؔ
مقصد بھی، مُنتہا بھی مِری شاعری کا ہے

نسیم سحر
(راولپنڈی)

نعت رسول صلی اللہ علیہ والیہ وسلم

دُنیائے حسن و عشق کی رونق بڑھایئے
سرکار کے خیال کو دل میں بسایئے

نعتِ نبی سے منبر و محفل سجایئے
سیرت کا ذکر کیجیے گھر گھر میں لایئے

آمد جہاں میں سرورِ کون و مکاں کی ہے
اے عاشقانِ مصطفٰے خوشیاں منایئے

کھو جاؤ گر رسول کی باتوں میں سر بسر
اُن کے تصورات کی شمع جلایئے

مل جائے اُن کا آپ کو دیوانہ جب کہیں
عزّت سے پیش آیئے دل سے لگایئے

اُنؐ کے عمل پہ کیجیے جو کام کیجیے
اُنؐ کی رضا کو زیست کا حاصل بنایئے

شاہدؔ ملے گا لطفِ عبادت اِسی جگہ
اپنا سرِ نیاز یہیں پر جھکایئے

شاہد صدیقی
(یوکے)

فلٹر ٹپ

جمیل عثمان

(نیویارک)

شامو بہت دیر سے اس آدمی کے پیچھے چل رہا تھا- اس کے آگے چلنے والے آدمی کی انگلیوں کے درمیان ایک فلٹر ٹپڈ سگریٹ دبا ہوا تھا جس کے کش لگاتا ہوا وہ شخص خراماں خراماں چلا جا رہا تھا- اور شامو اس کے پیچھے اس امید پر چل رہا تھا کہ جب وہ سگریٹ پھینکے تو شاید اس کا آخری حصہ اسے اپنی طلب مٹانے کے لئے مل جائے- بہت انتظار کے بعد آدمی نے سگریٹ ختم کیا اور اس کا ٹوٹہ سڑک کے کنارے پھینک دیا- شامو نے لپک کر سگریٹ اٹھا لیا مگر اسے بڑی مایوسی ہوئی- اس شخص نے سگریٹ فلٹر تک ختم کر دیا تھا-

" سالا، کنجر کی اولاد!" شامو نے جاتے ہوئے شخص کو نفرت سے دیکھا اور ٹوٹہ ہوا میں اچھال دیا-

شامو کو فلٹر ٹپڈ سگریٹ پینے کی بڑی خواہش تھی- مگر وہ اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا- گولڈ لیف ایک سو ساٹھ روپے کا ایک پیکٹ ملتا ہے اور ایک سگریٹ آٹھ روپے کا تھا- آج صبح سے اس کا بڑا جی چاہ رہا تھا کہ گولڈ لیف پیے- پورے کا پورا، شروع سے آخر تک- مگر کہاں سے پیتا؟- جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی- صبح بیڑی کی ایک گڈی خریدی تھی- ابھی اس میں چند بیڑیاں باقی تھیں -مگر بیڑی پینے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا- بیڑی کو جب وہ اپنے ہونٹوں میں دباتا تھا تو اس کے دونوں ہونٹ مل جاتے تھے، جبکہ فلٹر ٹپڈ سگریٹ منہ میں لینے سے ہونٹ ملتے نہیں تھے اور اسے سگریٹ کے سرے کی گولائی اپنے ہونٹوں کے درمیان محسوس ہوتی تھی- اسے بہت اچھا لگتا تھا- اس نے سوچا کہ اب کے جب اسے مزدوری ملے گی تو وہ فلٹر والا سگریٹ ضرور خریدے گا-

وہ گھر کی طرف چل پڑا- خشک ندی کے ریتیلے پیٹ میں اس کا گھر تھا گھر کیا تھا، چار کونوں میں چار بانس گاڑ کر ان کے گرد ٹاٹ اور گتے کی دیواریں بنا دی گئی تھیں- دیواروں کو گرنے سے روکنے کے لئے درمیان میں بھی لکڑی اور بانس کے کھمبے گاڑ دیے گئے تھے- گتوں اور ٹاٹ میں سوراخ کر کے ان میں سے رسیاں گزار کر انہیں ان کھمبوں سے اچھی طرح باندھ دیا گیا تھا تا کہ دیواریں گریں نا- چھت کی جگہ ٹن اور گتے کی چادریں تھیں جنھیں کھمبوں کی مدد سے سہارا دیا گیا تھا- چھت کو پلاسٹک کی بڑی بڑی شیٹوں سے ڈھک دیا گیا تھا کہ بارش کا پانی اندر نہ آئے- اس طرح کی دو جھگیاں برابر برابر بناء گئی تھیں- ایک میں شامو اور اس کی بیوی حلیماں رہتے تھے اور دوسرے میں اس کا بیٹا ڈبو، بہو سندری اور ڈیڑھ سال کا پوتا سونا- اسی طرح کی کئی اور جھگیاں تھوڑی دور پر بنی ہوئی تھیں اور ندی میں ایک چھوٹی سی بستی بس گئی تھی- بستی کی یہ جھگیاں اسی وقت تک محفوظ تھیں جب تک موسم شدت اختیار نہ کرے- یہ طوفان اور تیز بارش میں ٹک نہیں سکتی تھیں-

"حلیماں، کچھ کھانا پانی ہے؟" - وہ جھگی کے باہر پڑی ہوئی ایک پیڑھی پر بیٹھتا ہوا بولا-

" کہاں سے آئے گا کھانا؟" حلیماں چمک کر بولی " تو کچھ لایا؟"

"اوے چار دن سے پہیہ جام ہڑتال اے- ایک دھیلے کا کام نہیں ہویا- جیب خالی اے- کاں سے لاؤں راشن؟"

"اب میں کیا کروں؟ - بھوکوں مر-" وہ بیزاری سے بولی اور جھگی کے اندر چلی گئی-

شامو نے بیڑی سلگائی اور اس کے کش لیتا رہا- اس کے خالی پیٹ کو سخت تمباکو کا دھواں اور کھرچ رہا تھا-

تھوڑی دیر بعد حلیماں جوتے کے ڈبے کے ایک ڈھکن پر روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے اور گڑ کی ایک ڈلی لے آئی، " لے، یہ کھا لے، اتنا ہی بچا تھا، اس کے بعد اور کچھ نئیں اے-"

وہ پاپڑ کی طرح سخت روٹی کے خشک ٹکڑے گڑ سے کھاتا رہا اور نوالہ چباتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا رہا- ہاتھیوں کی طرح کالے بادل امڈے چلے آ رہے تھے- ہوا میں بھی خنکی آ گئی تھی- چیل پر پھیلائے اوپر ہوا میں اونچے اڑ رہے تھے-

"حلیماں، آسمان کا رنگ ٹھیک نہیں اے-"

" کیا ہوا؟" وہ باہر آتی ہوئی بولی-

" بارش ہونے والی ہے- کوئی ٹھیک نہیں طوفان بھی آئے-"

" کچھ نئیں ہونے کا- یہ بادل ایں ویں ای آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں- بارش نئیں ہو گی-" حلیماں وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی-

" شامو، ہم کل کیا کھائیں گے؟ سونا تو بہت تنگ کرے گا-"

" تو سونے کے باپ کو بول- حڈ حرام کہیں کا- سارا دن پڑا سوتا رہتا ہے-"

" جاتا تو ہے کام کی تلاس میں" حلیماں بولی- " اب اس کو کام نہیں ملتا تو کیا کرے-"

" دیکھوں گا، کچھ کروں گا" ، شامو کچھ سوچتا ہوا بولا ، " آج کل سادیاں بھی نہیں ہو رہی ہیں- نہیں تو وھاں سے بچا کھچا کھانا مل جاتا تھا-"

رات آہستہ آہستہ ندی کی بستی میں اترنے لگی تھی- اور اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا تھا- اس اندھیرے میں شامو یہ نہ دیکھ پایا کہ سیاہ بادلوں نے کس طرح پورے شہر کو ڈھک لیا تھا- دور ندی کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں آ رہی تھیں- کبھی کبھی کوئی آوارہ کتا بھونکنے لگتا-

وہ گہری نیند سو رہے تھے جب بارش شروع ہوئی- نیند کے غلبے نے شامواوراس کے بیٹے کو اٹھنے نہیں دیا- ڈبو سوچتا رہا کہ اگر زیادہ بارش ہوئی تو بابا خود اسے اٹھائے گا- ادھر شامو دعا کر رہا تھا کہ بارش تیز نہ ہو پھر نیند نے اسے آلیا -وہ تو حلیماں چیخی تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھا- ہوا چھت پر پڑے پلاسٹک کی چادر کو اڑا لے گئی- بارش اس قدر تیز کہ لگتا تھا طوفان نوح ہے- وہ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے- چھت پر لگے ہوئے گتے کے ٹکرے بھیگ کر بوسیدہ ہوئے اور منٹوں میں نیچے آرہے- ایک تو اندھیرا اور اوپر سے اتنی تیز بارش- انہیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا- جو کچھ سامان ہاتھ آیا اسے لے کر وہ جھونپڑی کے ملبے سے باہر نکلے- شامو نے حلیماں کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا- اتنی ہی دیر میں پانی تیزی سے ندی میں بہنے لگا تھا اوران کے پیر ٹخنوں تک ڈوب گئے تھے-

"ڈبو!" اس نے بیٹے کو آواز دی- ڈبو اپنے بچے کو گود میں لئے اسی کی طرف آرہا تھا- بچہ بری طرح رو رہا تھا-

"تو اسے پکڑ" ڈبو بچے کو شامو کو دیتا ہوا بولا، "میں سندری کو نکالتا ہوں- ٹین کی چھت اس کے اوپر گر گئی ہے-" وہ واپس جھگی کی طرف بھاگا اور جلدی جلدی ٹین کی چادر، شہتیر اور بانس وغیرہ ہٹانے لگا- سندری زمین پر گری ہوی تھی- اس کا جسم ملبے میں دبا ہوا تھا- پانی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ڈبو کو خوف تھا کہ سندری کے سر سے اونچا نہ ہو جائے- اس نے ملبہ ہٹایا اور سندری کو کھینچ کر نکلا- اس کے منہہ میں شاید پانی چلا گیا تھا- وہ بری طرح کھانس رہی تھی- ڈبو اور سندری بھاگ کر شامو اور حلیماں کے پاس پہنچے- ڈبو نے سونا کو کندھے پر بٹھایا، دو چار پوٹلیاں ایک ہاتھ میں پکڑیں اور دوسرے ہاتھ سے سندری کا ہاتھ تھاما اور کنارے کی طرف بھاگا- شامو اور حلیماں پیچھے پیچھے تھے- بارش اتنی تیز تھی کہ انہیں کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا- پانی ان کے سر پر سے چہرے پر یوں بہہ رہا تھا جیسے ان کے سروں پر بالٹی سے پانی انڈیلا جا رہا ہو- ان کے ہاتھوں میں تھوڑی بہت چیزیں تھیں جو وہ اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے- اس لئے وہ اپنے چہرے سے پانی پونچھ بھی نہیں سکتے تھے- ندی میں طغیانی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی- پانی ان کے گھٹنوں تک آپہنچا تھا- پانی کا ریلا ان کے پیروں کے نیچے سے ریت کو بہا کر لے جا رہا تھا اور وہ بار بار گر رہے تھے- حلیماں کئی بار گری- بڑی مشکلوں سے شامو نے اسے اٹھایا- خدا خدا کر کے وہ کنارے پر پہنچے- وہ ترائی میں تھے اور ندی کے کنارے کنارے چلنے والی سڑک اونچی تھی- وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے تو پھسل کر پھر نیچے آرہتے- پانی اب کمر تک آچکا تھا اور بارش میں ذرا بھی کمی نہیں آءتھی- ڈر تھا کہ اگر کوئی پھسل کر گرا اور اس کے پیر اکھڑ گئے تو پانی کا ریلا اسے بہا لے جائے گا- ڈبو کو کچھ دوری پر اپنی ہی طرح کے چند لوگ نظر آئے جو اوپر چڑھ رہے تھے-

"بابا، ادھر چل-" اس نے چیخ کر شامو کو کہا اوراس طرف اشارہ کیا -وہ گرتے پڑتے وہاں پہنچے- اس جگہ زمین پتھریلی تھی- پھسلن نہیں تھی- اس لئے ان کو اوپر چڑھنے میں دشواری نہیں ہوی- اوپر پہنچ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا-

"اگر ابھی اوپر نہیں آسکتے تب تو ہم گئے تھے-" شامو نے ندی کی طغیانی کو دیکھتے ہوئے کہا- اب سوال یہ تھا کہ جائیں کہاں- بارش اب بھی ہو رہی تھی اور بچہ سردی سے کانپ رہا تھا- دور انہیں ایک فلائی اوور نظر آیا تو وہ بھاگے اور اس کے نیچے جا کر پناہ لی- ان کی طرح کے اور بھی کئی بے گھر خاندان وہاں پناہ گزین تھے تھے-

رات بھر سندری اپنے بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی کہ اسے سردی نہ لگے- وہ بھوک سے روتا تو اسے تھپک کر سلا دیتی- کپڑے جسم پر ہی سوکھ گئے- صبح ہونے سے پہلے بارش تھم گئی- مشرقی افق کی سرخی بتا رہی تھی کہ بادل چھٹ گئے ہیں- تھوڑی دیر میں آفتاب پورے آب و تاب سے نکل آیا تو ان لوگوں کی جان میں جان آء- جس کو جہاں دھوپ میں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا- کپڑے سکھائے جانے لگے- بچہ بھوک سے بلک رہا تھا- سندری اسے لے کر نکل گئی اور کہیں سے مانگ تانگ کر چند روٹیاں لے آء اور اسے کھلایا- چند ٹکڑے بچ رہے تھے تو تینوں نے ایک ایک ٹکرا کھایا- پھر شامو اور ڈبو کام کی تلاش میں نکل گئے-

بارش اور جھکڑ سے کچھ نقصانات ہوئے تھے- کہیں کوئی کھمبا ٹوٹ گیا تھا، کہیں چھجہ زمین پر آرہا تھا، کسی کے گھر میں پانی آگیا تھا اور ساتھ کیچڑ بھی لے آیا تھا- کوئی اپنی گاڑی دھلوانا چاہتا تھا تو کوئی دکاندار اپنی دکان کے آگے صفائی کروانا چاہتا تھا- دونوں باپ بیٹے کی اس روز اچھی کمائی ہوئی- واپسی پر شامو نے سوچا کہ شادی ہال کی طرف سے ہوتا چلے- رات کے دس بج رہے تھے- وہ ایک شادی ہال کے باہر پہنچا تو دیکھا کہ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے- "معلوم نہیں کھانا کب ہوگا؟" اس نے سوچا، " کہیں رات کے بارہ ایک نہ بج جائیں- بیوی بچے بھوکے بیٹھے اس کا انتظار کر رہیہوں گے- وہ ہال کے پچھلے دروازے کی طرف گیا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ کھانا چل رہا ہے-" شاید آج کل پولیس والوں نے سختی کی ہوئی ہے کہ رات بارہ بجے حال بند کر دیں- اسی لئے جلدی ہو رہی ہے-" اس نے سوچا- وہ تھوڑی دیر وہیں منڈلاتا رہا- پھر دیکھا کہ کام کرنے والے لڑکے جھوٹی پلیٹیں لا رہے ہیں اور ان میں کا بچا ہوا کھانا کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک بڑی سے ٹوکری میں پھینک رہے ہیں- اسی وقت ایک بلی آء اور ٹوکری میں گھس کر ایک بوٹی اٹھانے لگی- شامو نے اسے بھگا دیا- ایک کتا الگ ہڈی کا ایک ٹکڑا کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا- شامو نے اسے بھی ہنکایا- اس نے کام کرنے والے لڑکوں سے منت کی کہ کیا وہ اس ٹوکری میں سے کھانا لے سکتا ہے؟

"لے لے بھائی، لے لے، جتنا چاہے لے لے- ابھی تو ہم سارا پھینک ہی دیں گے"-

شامو بھاگ کر گیا اور کوڑے میں پڑے ہوئے کچھ شاپنگ بیگز اٹھا

لایا- کتا اور بلی واپس آ گئے تھے- مگر شامو کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ انہیں بھگاتا - وہ جلدی جلدی بیگز میں کھانا بھرنے لگا - کتا، بلی اور انسان اپنے اپنے حصے کا کھانا بٹور رہے تھے- تین تھیلے روٹی، گوشت اور بریانی سے بھر کر وہ فلائی اوور کی طرف چلا جہاں اس کا خاندان اس کا انتظار کر رہا تھا- وہ ان لوگوں کو دعائیں دیتا جا رہا تھا جو اپنی پلیٹوں میں اتنا کھانا نکال لیتے ہیں جتنا ان سے کھایا نہیں جاتا اور پھینکنا پڑتا ہے- آج اس کی کمائی بھی اچھی ہوئی تھی- " کیوں نہ آج تھوڑی سی فضول خرچی کر لی جائے -" اس نے سوچا - آخر کب تک دل کو مارتا رہوں گا - چل شامو آج ایک فلٹر ٹپ خرید ہی لے " - اس نے دل میں کہا اور گلی کی نکڑ پر پان سگریٹ کے کھوکھے پر گیا-

" ایک گولڈ لیف دے دے بھائی -" اس نے دکاندار کی طرف دس کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا-

میمن پان والے نے اسے غور سے دیکھا - وہ اسے پہچانتا تھا-

" آٹھ روپے کا ایک سگریٹ ہے، تیرے کو معلوم بھی ہے؟"

" ہاں، ہاں معلوم ہے،" شامو نے حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

" چل سگریٹ نکال" -

" اے ڑے، آج تو بڑی عیاسی ہو رہی ہے او" - دکاندار اسے سگریٹ دیتا ہوا بولا-

" تو اپنے کام سے کام رکھ-" شامو نے سگریٹ اور دو روپے واپس لئے اور سگریٹ کو کان میں اڑس کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑا-

فلائی اوور کے نیچے اندھیرا تھا- حلیماں نے لالٹین جلا لی تھی-

" ارے واہ! آج تو بڑی روسنی ہو رہی ہے-" شامو زمین پر بیٹھتا ہوا بولا-

" شکر کر کہ جو بوری کل میں لے کے بھاگی تھی اس میں یہ لالٹین تھی - ڈبو پٹرول پمپ سے جا کر تھوڑا سا مٹی کا تیل لے آیا تھا تو جل گیا" - حلیماں بولی-

" ٹھیک ہے- آج اچھا کھانا ملا ہے تو روسنی میں بیٹھ کر کھائیں گے- پلیٹیں تو ہیں نا؟"

حلیماں نے بوری میں سے چار المونیم کی پلیٹیں نکالیں- شامو نے سبھوں کے پلیٹ میں کھانا ڈالا-

" ادھر آ، تو میرے پاس بیٹھ " - اس نے اپنے ننگ دھڑنگ پوتے کو اپنے زانو پر بٹھا لیا اور پیار سے اسے کھلانے لگا - سبھوں نے اس رات سیر ہو کر کھانا کھایا-

شامو کا پیٹ بھرا تو تمباکو کی طلب ہوئی - اس نے سونا کو گود سے اتارا جو اس کے سامنے ہی کھڑا ہو گیا- شامو نے سوچا کہ باہر جا کر سگریٹ پیئے گا - وہ اٹھنے لگا تو سگریٹ اس کے کان سے نکل کر زمین پر گر پڑا- ٹھیک اسی وقت سونا نے کھڑے کھڑے پیشاب کر دیا - سگریٹ پیشاب میں تر ہو گیا - شامو نے غضبناک نظروں سے پوتے کو دیکھا اور ایک تھپڑ اسے رسید کر دیا - " حرامی، تجھے ابھی ہی موتنا تھا؟" بچہ روتا ہوا اپنی ماں کی طرف بھاگا - شامو نے پیشاب میں تر سگریٹ کو اٹھا کر لالٹین کی چھت پر رکھا - وہ اسے الٹتا پلٹتا رہا یہاں تک کہ سگریٹ بلکل خشک ہو گیا - پھر اس نے وہ سگریٹ سلگایا اور گھرے گھرے کش لینے لگا-

جگ مگ جوت

نویں سال وِچ اِس دھرتی تے ربّ ہُن مہر کرے
ون ترن مولن مہکن ٹھکن پلھرن برکھ ھرے

اگن کھیڈدی دانوَ ٹولی تُر جائے دور پرے
گھر دیاں نکراں روشن ہوون جگن چراغ دھرے

لّم سلمی رات دے مگروں ہُن پربھات کرے
اوہ نہ اس دھرتی تے آوے جس توں بال ڈرے

ھری انگوری کنک تے سُپنے ھن نہ مرگ چرے
سکھّم سکھّے نیناں دے وچ چانن واس کرے

چندرما سورج تے دیوے سن مُکھ نھیر مرے
جگ مگ جوت دھرت دے کونے نورو نور کرے

لّم سلمی نھیری زندگی سوچ کے جی ڈرے
پیار محبت امن دا پرچم سنے گگن بھرے

اِس دھرتی دا کنکا کنکا ایھہ ارداس کرے
جیھڑی تھاں بنجر تے بیلا اوتھے فصل بھرے

ماں دی گودی بال الوناں بیٹھ کلول کرے
اپنے گھر چوں نہ ڈر آوے ویڑھے رھن بھرے

تڑکسار ماں پائے رڑکنا مکھن ھتھ بھرے
دودھ پت رھن سلامت نونھاں دھیاں نہ ھون پرے

سردار گُربھجن گِل

(لدھیانہ)

فیضانِ محبت

رینو بہل

(چنڈی گڑھ)

ادھورے رشتے ہمیشہ تکلیف کا باعث بنتے ہیں نہ خود مرتے ہیں اور نہ ہی مرنے دیتے ہیں۔ پچھلے تین مہینوں سے سحر نے خود کو اپنے کمرے میں قید کر رکھا تھا نہ کسی سے ملتی تھی نہ کہیں آتی جاتی تھی۔ ماں بابا سمجھا کر تھک گئے مگر اُس پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نازو سے پالی اکلوتی بیٹی کو تِل تِل مرتا دیکھ خون کے آنسو بہانے پر مجبور ہو گئے۔ اُن کے بس میں ہوتا تو اُس کی زندگی میں آئے اس طوفان کو کبھی اُس تک نہ پہنچنے دیتے۔ بیٹی کو دامن میں سمیٹ لیتے اور گرم ہوا کا جھونکا بھی اُسے چھو کر نہ جا سکتا۔ ماں باپ تو صرف اولاد کو جنم دے سکتے ہیں قسمت تو انسان کے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں چھپی ہوتی ہے۔ اور وہ تو ایسے بدنصیب والدین ہیں جنہوں نے اُسے جنم بھی نہیں دیا نہ جانے کس بدنصیب ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئی اور کس مجبوری کے تحت اس کی ماں کو معصوم بچی کو اپنے سے جدا کر کے یتیم خانے کے باہر پالنے میں چھوڑنا پڑا۔ کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی ورنہ اپنے ہی جسم کے حصّے کو کون خوشی خوشی خود سے الگ کر کے کاٹ کر پھینکتا ہے؟

سحر سات سال کی تھی جب اُس نے پہلی بار ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت محسوس کی تھی۔ اُس کے آنے سے اُن کے گھر کا سُونا آنگن خوشیوں سے منور ہو گیا تھا۔ ماں باپ کے لاڈ پیار نے بہت جلد کچے ذہن پر آشرم کے سہمے ڈرے دن اور تنہا سرد دیواروں کے سائے میں گزاری راتوں کے نقوش دُھندلا دئے تھے۔ اُسے یاد ہے جب پہلی بار دادی اُسے ملنے آئی تھی تو اُس کے بارے پوچھا تھا:

''لڑکی ہندو ہے یا مسلمان؟''

''کیسی باتیں کرتی ہو ماں۔ یہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان یہ ہماری بچی ہے ہماری جان۔'' بابا نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے ماں کو بڑی بے رخی سے جواب دیا تھا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ پیار اور ممتا کا رنگ گہرا ہوتا گیا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ وہ یہ بھول ہی گئے کہ اُن کا خون کا رشتہ نہیں ہے۔

اُنہیں یاد رہا تو بس اتنا کہ اُس کے دم سے اُن کے گھر میں رونق ہے اُن کی زندگی میں خوشیاں ہیں اور وہ ہی اُن کے جینے کا مقصد ہے اور اب اُسے ٹوٹتا بکھرتا دیکھ کر وہ خود بھی بکھرنے لگے تھے۔ محبت عذاب بن کر اُس کی زندگی میں آئی اور درد اُس کی رگِ جاں میں اُترتا چلا گیا۔ دعاؤں کے سوا کوئی اور راستہ بچا ہی نہیں اُن کے پاس۔

جاوید علی صاحب کو صبح سویرے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر ورما صاحب کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اُن کی آمد شاید سحر کو کچھ بہتر کر دے۔ سحر کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے بڑے حق سے کہا:

''چلو تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تمہاری آنٹی تمہیں ملنا چاہتی ہیں۔''

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

''ہم نے یہ مکان بیچ دیا ہے اور واپس بریلی جا رہے ہیں۔ آخری بار ان سے مل لو پھر پتا نہیں تم کبھی اُسے دیکھ بھی سکو گی یا نہیں۔ بسترِ مرگ پر پڑی تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ کیا تم اُس کی یہ خواہش پوری نہیں کرو گی؟''

سحر تڑپ کر اُٹھی اور ماں بابا کی طرف دیکھا۔ بابا نے آنکھ کے اشارے سے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

ایان کے گھر آج وہ دوسری بار جا رہی ہے۔ اس سے پہلے ایان اُسے اپنی امی سے ملوانے لے گیا تھا۔ لڑکی تو اُنہیں پسند تھی مگر اُنہیں اعتراض اُس کے حسب نسب کے نامعلوم ہونے پر تھا۔ ایان نے اُسے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر وہ پڑھی لکھی سمجھدار باشعور لڑکی تھی، اُس کی امی کی باتوں سے بھانپ گئی تھی۔ اُس نے بھی ایان سے چھپا لیا۔ اب جب ایان کے والد اُسے خود گھر لے جانے آئے تو اُنہیں انکار کرنے کی ہمت اُس میں نہ تھی۔

ایان اور اُس کا رشتہ دونوں گھروں کے لیے کھُلی کتاب تھی۔ چھ سالوں سے دونوں ایک ساتھ تھے۔ دونوں کے والدین کو علم تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بِنا ادھورے ہیں۔ اس لیے ورما صاحب نے جاوید علی صاحب کو دل پر بھاری پتھر رکھتے ہوئے بتایا تھا کہ انہوں نے اسے جنم نہیں دیا اور یہ بات سوچتے بھی اِنہیں بُرا لگتا ہے مگر وہ اُن سے حقیقت چھپانا نہیں چاہتے۔ جاوید علی صاحب جانتے تھے کہ اُن کا اکلوتا بیٹا سحر سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اُس کی خوشی کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایان کو بھی یقین دلایا تھا کہ:

''میرے ہوتے تمہیں فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں تمہاری ماں کو بھی راضی کر لوں گا اور سنو یہ بات سحر کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ بے وجہ وہ پریشان ہو جائے گی۔''

''میں جانتا ہوں ڈیڈ آپ سب سنبھال لیں گے۔'' اس نے بھی پورے یقین کے ساتھ ڈیڈ کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔

جاوید علی اور سحر اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ پندرہ منٹ کے راستے میں دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ گھر پہنچتے ہی وہ اُسے ایان کی امّی کے کمرے میں لے گئے۔

''دیکھو بیگم میں کِسے لے کر آیا ہوں؟'' جاوید علی نے اُن کے بستر کے پاس پہنچ کر کہا تو انہوں نے بوجھل آنکھیں کھول کر سحر کی طرف دیکھا اور دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ ہونٹ کچھ کہنے کو ہلے مگر آواز نے ساتھ نہ دیا البتہ آنکھیں زار و قطار برسنے لگیں۔ سحر لپک کر اُن کی بانہوں میں سما گئی۔ دونوں کو روتا چھوڑ کر جاوید علی کمرے سے باہر نکل گئے۔

دیر تک دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر روتی رہیں۔ امّی بار بار

اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں بھر کر اُس کا ماتھا چومتی اور کہتی جاتی ‘‘تجھ میں تو مجھے اپنے ایان کی صورت نظر آتی ہے۔ کاش میں نے ضِد نہ کی ہوتی تو آج میرے آنگن میں بھی پھول کھلے ہوتے، کلکاریوں اور ہنسی سے میرا گھر گونج رہا ہوتا۔ میرے پاس بھی جینے کا کوئی مقصد ہوتا۔ اب میں جی کر کیا کروں گی؟’’

ان کا یہ آخری جملہ اُس کے دل میں تیر کی طرح لگا۔ جتنی دیر وہ اُن کے پاس رہی اُس کا ذہن اس نقطے پر ٹِکا رہا۔ سوچ گہری ہونے لگی تو اُلجھنیں بھی بڑھنے لگیں۔ جلد ہی اُن سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ گھر لوٹ آئی۔ خود کو پھر کمرے میں قید کر لیا۔ الماری کھول کر اُس نے ایک چھوٹی سی صندوقچی نکالی جس میں ایان کے دئے تحفے، خط اور چند تصویریں جو اُس نے سنبھال کر رکھی تھیں۔ تین مہینوں میں اُس نے کئی بار اس صندوقچی کو کھولنے کا سوچا مگر ہمت نہ ہوئی۔

ایک ایک کر کے اُس نے سارے خط کھولے سامنے رکھے اور باری باری پڑھتی گئی۔ یہ وہ خط تھے جس میں محبت کی مہک تھی، دوریوں کا درد تھا، جدائی کی کسک تھی، رنگین خوابوں کی کہانی تھی، خواہشیں تھیں، ارمان تھے، جذبات تھے۔ پہلا خط اس نے تب لکھا تھا جب وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے دور ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ملٹری ٹریننگ کے لیے دہرادھن گیا تھا۔ اسی دوری نے انہیں ایک دوسرے کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ پہلی بار تب انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بِنا ادھورے ہیں۔ جدائی کی کسک نے دلوں میں محبت کے شگوفے کھِلا دئے تھے۔

میجر بنتے ہی اُس کی بٹالین کو کپواڑہ جانے کا حکم مل گیا تھا۔ ایک طرف اُس کے میجر بننے کی خوشی تھی تو دوسری طرف کپواڑہ کے بدلتے حالات سب کو پریشان کر رہے تھے۔ روانگی سے پہلے وہ چار دن کی چھٹی لے کر گھر آیا تھا۔ وہ چار دن انہوں نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ ورما صاحب نے جاوید علی صاحب کو اُن کی بیگم اور ایان کو رات کے کھانے کے لیے مدعو کیا تھا تاکہ وہ بچوں کے مستقبل کے بارے میں بات کر سکیں۔ ملاقات بڑی خوشگوار رہی اور یہ طے پایا کہ آئندہ سال دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔ اُس رات وہ دونوں دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ لئے شہر کی ویران سڑکوں پر گھومتے رہے تھے۔ دھند میں لپٹی وہ سرد رات خوبصورت لمحوں اور گدگداتے جذبات کو اُن کی یادوں کی پٹاری میں ڈال گئی تھی۔ بھول جانا اور بھلا دینا فقط ایک وہم ہی تو ہے جو دل میں بستے ہیں وہ دل سے کب نکلتے ہیں۔ وہ چاہ کر بھی ان لمحوں کے احساس کو نہ بھلا پائے گی۔ سبھی خط اور تصویریں دوبارہ صندوقچی میں بند کر کے صرف ایک سفید لفافہ اُس نے باہر رہنے دیا۔ پھر صندوقچی دوبارہ احتیاط کے ساتھ الماری میں سنبھال کر رکھ دی۔ بستر پر لیٹتے ہی اک سرد آہ اُس کے سینے سے نکلی اور اپنے اندر اُسے اپنی ہی آواز ٹوٹتی ہوئی سنائی دی:

جسم کی دراڑوں سے روح نظر آنے لگی
بہت اندر تک توڑ گیا مجھے عشق تیرا

میلوں دور بیٹھے ایان کی فون پر آواز سن کر وہ جان جاتی تھی کہ اس کا موڈ کیسا ہے۔ کبھی اُس کی باتوں میں محبت کا شہد لپٹا ہوتا تو کبھی اُسے تھکن کا احساس ہوتا۔ وہ اُس کی ہنسی میں چھپی درد کی شکن بھی محسوس کر لیتی۔ ایان کے پاس اُسے سب کچھ بتانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ بچتا۔ کچھ عرصے سے وہ بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ اُس کے بار بار پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتایا یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ:

‘‘ایسی کوئی بات نہیں جو میں سنبھال نہ سکوں۔ چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم بس کبھی کبھی امّی سے بات کر لیا کرو۔’’

‘‘میری بات ہوتی رہتی ہے انکل آنٹی سے۔ دونوں ٹھیک ہیں۔ تم اپنا خیال رکھو ادھر کی فکر چھوڑ دو۔’’

‘‘اکلوتی اولاد ہوں اس لیے اُن کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا بھائی یا بہن ہوتا تو میں بھی بے فکر رہتا۔ اس وجہ سے میں تمہیں بار بار کہتا ہوں۔’’

‘‘کیا کہتے ہو؟ میں سمجھی نہیں؟’’

‘‘اب بنو مت جانتا ہوں اتنی بھی ناسمجھ نہیں ہو۔’’

‘‘اب بتا بھی دو۔’’

‘‘میری جان مجھے کم سے کم تین بچے چاہیے۔’’

‘‘دھت تیرے کی۔ بے شرم۔’’

‘‘ارے اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے۔ شادی کریں گے بچے تو ہوں گے ہی۔ دو تین بچے ہوں گے تو گھر آنگن بھرا بھرا رہے گا۔ ایک کو فوج میں بھیجوں گا اور دوسرے کو نیوی میں۔’’

‘‘اور تیسرے کو؟ ایئر فورس میں بھیج دینا’’ سحر نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

‘‘بیٹی کو پائلٹ بناؤں گا۔’’

سحر نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

‘‘شیخ چلی ذرا رفتار دھیمی رکھو۔ تمہارا تو یہ حال ہے کہ
‘‘کنک کھیت بیٹی پیٹ آ داماد روٹی کھا’’

پھر اک روز ایان نے بڑی مختصر مگر سنجیدہ بات کہی۔ اس سے پہلے اس نے اسے اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

‘‘حالات یہاں ٹھیک نہیں۔ افسوس ہوتا ہے دیکھ کر کبھی کبھی چنے کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے۔’’

‘‘کیا مطلب؟’’

‘‘بدعنوانی کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ اُس نے اس مقدس پیشے کو بھی نہیں چھوڑا۔ بھوکے بھیڑیئے انعام کی رقم سرکار سے وصول کرنے کی خاطر بے گناہوں کو بھی گولی کا شکار بنا کر دہشتگردوں کی فہرست میں شامل کر رہے ہیں۔’’

‘‘تم سب خاموشی سے دیکھ سکتے ہو؟’’

‘‘میں نے آواز اُٹھانے کی کوشش کی تو میری وفاداری پر سوال اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہتے ہیں مسلمان ہو اس لیے انہیں بے گناہ قرار دے کر بچانا

چاہتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اندر تک ٹوٹ گیا تھا جس کی کسک سحر نے اپنے سینے میں محسوس کی تھی۔

”تم کچھ دنوں کی چھٹی لے کر گھر آ جاؤ۔“ حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس نے مشورہ دیا۔

”میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔ کل بات کرتا ہوں۔ تم امّی یا ابّو سے اس بارے کوئی بات نہ کرنا بے وجہ پریشان ہو جائیں گے۔“

ایان کو حوصلہ دے کر اُسے کسی کو نہ بتانے کا یقین تو دلا دیا مگر رات بھر وہ سو نہ سکی۔ طرح طرح کے خیال اُسے بے سکون کرتے رہے۔ صبح بھی اُس کا کسی کام میں دل نہ لگا۔ جب تک ایان اُسے چھٹی کی منظوری کی خبر نہیں سنا دیتا اُسے تسلی نہیں ہونے والی۔

رات کو اُس نے ایان کو فون لگایا تو اس کا فون بند تھا۔ کئی بار فون لگایا مگر فون نہیں ملا۔ پھر خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ شاید نیٹ ورک سے باہر ہو۔ وہ رات بھی اُس نے بڑی بے سکونی میں گزاری۔ صبح بستر سے اٹھی بھی نہ تھی کہ ماں اخبار ہاتھ میں لئے اس کے کمرے میں گھُسی اور آتے ہی اُسے سینے سے چپکا لیا جیسے کوئی چڑیا طوفان سے اپنے کچے کو بچانے کے لیے اپنے پنکھوں میں چھپا لیتی ہے۔ بابا کسی سے فون پر دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ اُس نے جھٹکے سے خود کو ماں سے الگ کیا جس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور ڈرتے ڈرتے ماں کے ہاتھ سے اخبار چھین لیا۔

اخبار کے پہلے صفحہ پر کونے میں ایک مختصر سی خبر چھپی تھی ”ذہنی تناؤ کی وجہ سے کپواڑہ میں تعینات میجر ایان علی نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔“ یہ خبر پڑھتے ہی کہرام مچ گیا ”ایان خودکشی نہیں کر سکتا اس کا قتل ہوا ہے“ وہ روئے جا رہی تھی اور بار بار یہ ہی دہرائے جا رہی تھی۔ ماں باپ کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ روتے روتے وہ غش کھا کر گر گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا اور اُسے نیند کا انجکشن دیا تو کہیں جا کر وہ قابو میں آئی۔

اُس دن کے بعد سحر نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ ایان کے مردہ جسم کو گھر لایا گیا وہ نہیں گئی۔ تدفین کے وقت بھی بابا نے اُسے وہاں چلنے پر زور دیا مگر وہ نہیں گئی۔

”میرے لیے وہ زندہ ہے۔ میں اُسے مردہ نہیں دیکھ سکتی۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

یہ خیال اُسے اندر ہی اندر کھانے لگا کہ وہ اپنی موت نہیں مرا اُسے کسی سازش کے تحت مارا گیا ہے۔ وہ ایک دلیر، بہادر، زندہ دل نوجوان تھا کسی بھی صورت میں وہ خودکشی نہیں کر سکتا۔ اُسے ایان کی کہی باتیں حرف حرف یاد تھیں مگر راستہ نہیں سجھائی دے رہا تھا کہ کس طرح وہ ایان کو انصاف دلائے کس طرح اس کی موت کو بے داغ کرے۔ یہ تکلیف اُسے گھن کی طرح مٹا رہی تھی۔

تین مہینے بعد جب ایان کے ابو اُسے گھر لے کر جانے کو آئے تو ایان کی امّی کو دیکھ کر اُسے زبردست دھچکا لگا۔ تین مہینوں میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نکل آئی تھی۔ اُس نے سفید لفافے سے کاغذ نکال کر پڑھے اور رات دیر تک اُس کے بارے سوچتی رہی۔

صبح وہ ماں بابا سے اجازت لے کر دوبارہ ایان کے گھر پہنچ گئی۔ اُسے صبح صبح اچانک سامنے دیکھ کر امّی کا بجھا ہوا چہرہ کِھل اٹھا۔ چائے کے دوران انکل سے اُسے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو بھی ایان کی موت کے متعلق چند سوالات پریشان کر رہے تھے اور انہوں نے اس کی شکایت منسٹری میں دی تھی۔ انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ جلد ہی اس کیس کی تفتیش کریں گے ایک انکوائری بٹھائی جائے گی اور اس کیس کی معاملے کی تہہ تک جائیں گے۔ یہ سب کارروائی کب تک مکمل ہو گی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

”اب انکوائری بٹھائیں یا وجہ تلاش کریں، میرا جوان بیٹا تو جان سے گیا۔ وہ تو واپس نہیں آ سکتا۔“ امّی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”کم سے کم اسے انصاف تو ملے گا بیگم“

یہ سن کر تھوڑی سی راحت سحر نے بھی محسوس کی۔

”ایک بات کرنی ہے آپ سے۔“ سحر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”جو بات دل میں ہے کہہ دو بیٹی“

”ہم تینوں کا غم مشترکہ ہے۔ ہم مل کر اس غم کو کچھ حد تک کم کر سکتے ہیں اگر آپ میرا ساتھ دینے کا وعدہ کریں۔“

دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا ”وہ کیسے؟“

”آپ کو میری بات نامناسب لگے یا آپ مجھے بے حیا سمجھیں مگر میں جو کہنے جا رہی ہوں وہ ہے تو کام مشکل مگر ناممکن نہیں۔“

”اب کہہ بھی دو بیٹی جو بات کہنی ہے۔“

”اگر میں ایان کے بچوں کو جنم دوں تو کیا آپ میرا ساتھ دو گے؟“

”کیا کہا؟ ایان کے بچے؟ تم ہمیں پاگل سمجھتی ہو“ امّی چیختی ہوئی بولیں۔

”جی ہاں ایان کے بچے۔ مجھے بھی آپ ہی طرح ایان کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی مگر یہ ممکن ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”پچھلی بار جب ایان آیا تھا تو میرے جنم دن پر مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔“

بیگ میں سے لفافہ نکال کر اُس نے ابو کی طرف بڑھا دیا۔

”کیا ہے یہ؟“ انہوں نے لفافہ کھولتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔

”ایان نے اپنا نطفہ ہسپتال بینک میں محفوظ کرا دیا تھا اور اُس کا وارث صرف مجھے بنایا ہے۔“

”مگر اُس نے ایسا کیوں کیا؟“ امّی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”میں نے بھی یہ ہی سوال کیا تھا۔ اُس کا جواب تھا کہ میری خالہ کی ایک ہی اولاد تھی جو بھری جوانی میں سڑک حادثے میں ماری گئی۔ والدین کے لیے بڑا صدمہ تھا۔ اتنی بڑی جائیداد کا کوئی وارث نہ تھا۔ نہ وہ کسی رشتے دار یا کسی یتیم خانہ سے بچہ گود لینا چاہتے تھے، انہیں اپنی اولاد ہی چاہیے تھی لہٰذا انہوں نے گود

کرایہ پر لے کر IVF کے ذریعہ اولاد حاصل کی۔ ماشاءاللہ اب اُن کی اولاد دس سال کی ہوگئی ہے۔ انہیں جینے کا مقصد بھی مل گیا۔ اُس کے خالو نے اُسے کہا تھا کہ اگر مجھے عقل ہوتی تو میں جوانی میں اپنے نطفے منجمد کروا لیتا۔ صرف پانچ سے چھ ہزار روپے ہر ماہ کرایہ ہی تو دینا پڑتا ہے انہیں محفوظ رکھنے کا۔ میرے پاس کون سی کمی تھی دولت کی۔ اس طرح کم سے کم پچاس سال تک انہیں محفوظ رکھ کر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ نا جانے کیوں ایان کو اُن کی بات جچ گئی۔''

''کیا اُسے پہلے سے اس حالات کا اندیشہ تھا؟'' امّی نے شک کی نظروں سے اُسے ناپتے ہوئے پوچھا۔

اس نے مجھے یہ تحفہ دیتے ہوئے کہا تھا ''کل کو اگر میں ڈیوٹی کے دوران اپاہج ہو جاؤں یا کوئی حادثہ پیش آ جائے تو تم ہماری اولاد سے محروم نہیں رہو گی۔ اس وقت یہ اُس نے کب سوچا ہوگا کہ وہ اس طرح اتنی جلدی اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔'' بات کہتے کہتے وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ امّی نے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں اور دونوں اس غم سے نجات پانے کے لیے ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش میں تھیں۔ جاوید علی دونوں کو روتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

شام تک وہ ان دونوں کے ساتھ رہی اور اس موضوع پر تفصیل سے بات ہوتی رہی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سحر کوئی ایسا قدم اٹھائے۔ ایک کنواری لڑکی کو اپنی خودغرضی کے لیے ماں بنا کر بدنامی اور دُکھ کے سمندر میں نہیں دھکیل سکتے۔ پہاڑ سی زندگی وہ اکیلے تو نہیں کاٹ سکتی۔ کل کو بچہ پیدا ہو گیا تو کون اُس کا ہاتھ تھامے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ سحر راضی ہو جائے اور وہ کرایہ کی گود لے کر ایان کا بچہ حاصل کر لیں۔ اس کے لیے سحر نے صاف انکار کر دیا۔

''میرے جیتے جی ایان کے بچے کی ماں کوئی اور نہیں بن سکتی۔''

''مگر ہم تمہاری زندگی اس طرح برباد نہیں کر سکتے۔ تمہارے والدین اس بارے جانتے ہیں؟''

''نہیں۔ آپ راضی ہو جائیں تو میں اُن سے بھی بات کر لوں گی۔''

''مجھے یقین ہیں وہ بھی نہیں مانیں گے۔''

''انہیں منوانا میرا کام ہے۔ آپ بس ایک بار حامی بھر دیں۔ مجھے تو ابھی یہ بھی نہیں معلوم کہ طبی جانچ کے بعد فیصلہ میرے حق میں ہوگا بھی یا نہیں۔''

''اتنی جلدی اس کے بارے فیصلہ نہیں لیا جا سکتا۔ دیکھتے ہیں کیا راستہ نکلتا ہے''

جاوید علی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

سحر خاموش رہی۔ دل میں وہ فیصلہ کر چکی تھی جو اُس کی آنکھوں اور چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں نے وہ فیصلہ پڑھ کر نظریں چُرا لی تھیں۔ سحر دل ہی دل میں کہہ اُٹھی:

عشق وہ نہیں جو تجھے میرا کر دے
عشق وہ ہے تجھے کسی اور کا ہونے نہ دے

اپنی تسلی کے لیے اگلے روز جاوید علی ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے ان کا قصہ سن کر کہا:

''رازداری ہم پر فرض ہے۔ ہم کبھی کسی کا بھروسہ نہیں توڑتے۔ جو بھی یہاں تخم دینے یا جمع کرانے آتے ہیں اُن کے میڈیکل چیک اَپ کے علاوہ خود کی اور فیملی ہسٹری بھی ہمارے پاس درج رہتی ہے۔ ہر طرح سے ڈونر تندرست ہونا چاہیے۔ میجر ایان تو پورے دو سال کا کرایہ تک ادا کر کے گئے تھے۔ آپ کے پاس وقت ہی وقت ہے جب چاہیں اسے استعمال کرا سکتے ہیں۔ پچاس سال تک یہ اسی طرح کارگر رہے گا''

''ہمارے پاس وقت ہی تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہم عمر کے اُس موڑ پر ہیں جب کبھی بھی بلاوا آ سکتا ہے۔ ایان کی امّی تو بسترِ مرگ پر پڑی ہے شاید بچے کو دیکھ کر کچھ سال اور جی لے۔ کیا ہم تخم کو دوسرے شہر لے جا سکتے ہیں۔''

''آپ نہیں لے جا سکتے۔ ہم بھجوا سکتے ہیں۔ آپ نے جس شہر میں جانا ہے وہاں جا کر ڈاکٹر سے بات کریں اور جب سب تیاری ہو جائے تو ہمیں اطلاع کر دیں۔ ہم بھجوا دیں گے۔ دراصل اسے ہم ۷۵ ڈگری نائٹروجن میں زندہ رکھتے ہیں۔''

سحر کا فیصلہ ماں باپ پر بم کی طرح پھوٹا۔ ماں روئی بھی چلائی بھی بابا نے غصّہ بھی کیا پیار سے سمجھایا بھی مگر اُس پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے راضی کرنے کے لیے دونوں نے سام، دام، دنڈ، بھید کا طریقہ اپنایا مگر سب بے سود۔ اُس نے صرف ایک ہی بات کہہ کر اُن کو خاموش کرا دیا کہ ''رشتے نبھانے میں نے آپ دونوں سے ہی سیکھے ہیں۔ کچھ رشتے عمر قید کی طرح ہوتے ہیں جہاں ضمانت دے کر بھی رہائی ممکن نہیں۔ آپ صرف میرا ساتھ دیں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میرا یہ فیصلہ دونوں خاندانوں میں یقیناً خوشیاں لے کر آئے گا۔''

انسان جب بھی جھکتا ہے تو اپنے پیٹ کے آگے جھکتا ہے وہ بھی اپنی اولاد کی خوشی کے لیے خاموش ہو گئے۔

ایان کی برسی کو ایک سال آٹھ مہینے گزر چکے ہیں مگر ابھی تک انکوائری کمیشن اپنی رپورٹ جمع نہیں کروا پایا البتہ دو ننھے جڑواں فرشتوں کی کلکاریوں نے ددھیال اور ننھیال کے ویران گھر کے آنگن میں پھر سے رونق کر دی ہے۔

نقوشِ امن

یہ آگ کس نے لگائی ہے کون پوچھے گا
لہو میں آگ ملائی ہے کون پوچھے گا
نقوشِ امن واماں کے مٹائے جانے لگے
زمیں پہ کیسی لڑائی ہے کون پوچھے گا

سمیرا سلیم کاجل

کھوٹا سکہ

فیروز عالم

(نیویارک)

غزنوی صاحب کی بیگم کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔

پھر یہ بات بھی تھی کہ انکا دل ویسے بھی اپنی اہلیہ مہر النساء بیگم سے نہیں ملا تھا۔ ادھر مہر النساء بیگم نے بھی نہ تو انہیں وہ عزت اور توقیر دی تھی جسکے وہ اہل تھے اور نہ ہی وہ محبت اور توجہ جو عام بیویوں کا شیوہ ہے۔ بس یہ ایک پہلے سے طے شدہ شادی تھی جسکا فیصلہ بزرگوں نے کر دیا تھا اور زندگی جیسے تیسے گذر گئی تھی۔ وہ ایک تشنہ زندگی گذارتے رہے تھے جس میں بیوی اور اولاد کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کرنا تو شامل تھا مگر انکے اپنے لئے زندگی کے اس طویل اور لق و دق صحرا میں دور دور تک محبت اور طمانیت کا کوئی سایہ نہ تھا۔ یہ نہیں تھا کہ انہوں نے اس بندھن کو بہتر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی مگر انکی بیگم ایک اڑیل خاتون تھیں اور وہ کسی قسم کی مفاہمت کے لئے تیار نہیں تھیں۔ شادی شدہ زندگی تو کسی طور گذار لی تھی مگر اب اس دور میں، تنہائی کے اس جنگل میں عجیب عجیب خیالات انہیں پریشان کرتے تھے۔ ایک بے نام سی بیقراری تھی جو انہیں بیچین رکھتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے کئی پہلو تشنۂ تکمیل رہے۔ انکی عمر اب ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہو چلا تھا کہ اب انکے پاس عمر کی تھوڑی سی پونجی بچی ہے اور اس بات کا امکان نہیں کہ زندگی کوئی نئی کروٹ لے گی۔ وہ اس حقیقت سے مفاہمت کر چکے تھے کہ کچھ لوگوں کی زندگی تشنہ ہی رہتی ہے اور وہ اس دنیا سے ایسے ہی نامراد رخصت ہو جاتے ہیں۔

مگر پھر بھی جب وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو کر آئینہ میں خود پر نظر ڈالتے تو دل کہتا ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ یوں تو روائت ہے کہ آئینہ تو سب ہی سے جھوٹ بولتا ہے مگر ان کے سلسلے میں یہ کچھ صحیح بھی تھا۔ کثرتی جسم، گورا رنگ، غلافی آنکھیں اور کھڑے افغانی نقوش اور پھر سر پر کالے اور سفید بالوں کی کچھ ایسی آمیزش کے لوگ مذاق میں پوچھتے کہ بالوں پر اس قدر خوبصورت رنگ کس سیلون سے کرواتے ہیں۔ مگر انکو اپنی عمر اور سماجی قدروں کا احساس تھا اور اپنے بیٹے کی موجودگی میں انہوں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ انکا دور گذر چکا ہے اور اب انہیں اپنے جذبات کو تھپک تھپک کر سلا دینا ہوگا۔ پھر بھی تنہائی کی دوزخ انہیں اندر ہی اندر جلاتی رہتی اور کسی کسی رات جب اچانک انکی آنکھ کھلتی تو اپنے وسیع اور دراز بستر پر انہیں کسی کی کمی شدت سے محسوس ہوتی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ بستر کے خالی حصہ کی طرف بڑھاتے جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو۔ جیسے وہ کسی کو چھونے کی کوشش کر رہے ہوں مگر انکا ہاتھ ٹھنڈے بستر کے لمس کے علاوہ کچھ اور نہیں پاتا ایسے میں انکے دل کی گہرائی میں ایک میٹھی سی کسک اٹھتی اور تنہائی کا احساس اور گہرا ہو جاتا۔ پھر انہیں دیر تک نیند نہیں آتی اور صبح تک وہ کروٹیں بدلتے بدلتے ہلکان ہو جاتے۔

دن کی روشنی میں جب وہ دل سے زیادہ دماغ کے زیر اثر ہوتے تو اپنے خیالات پر بہت شرمندہ ہوتے۔ انہیں خود پر نہ صرف غصہ آتا بلکہ اپنے آپ سے گھن آنے لگتی۔ اگرچہ وہ خوب جانتے تھے کہ ان خیالات میں حیوانی جذبہ سے کہیں زیادہ اس انسانی فطرت کا تقاضہ ہے جہاں وہ کسی کی رفاقت، کسی کا ساتھ تلاش کرنا چاہتا ہے۔ انکا دل اس خواہش کی تکمیل چاہتا ہے کہ اس سفر میں انکے ساتھ کسی اور کا بھی ساتھ ہو مگر پھر بھی وہ اس کیفیت کا دن کی روشنی میں سامنا کرنے سے ڈرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس معاملے پر کسی سے گفتگو کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ویسے بھی اب نہ تو انکا کوئی دوست تھا نہ ہی رشتے میں کوئی ایسا فرد جس سے اس معاملے پر مشورہ طلب کیا جا سکے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی صورتحال میں شادی ایک جائز حل ہے مگر جس معاشرے میں وہ رہتے تھے اس میں انکی عمر اور بیٹے کی موجودگی میں شادی صرف جگ ہنسائی ہی کا باعث بنتی اور وہ اس حد تک دنیادار تھے کہ جگ ہنسائی کے بجائے اس بات کو ترجیح دیتے کہ اپنے احساسات کو کچل دیں اور اپنے جذبات کو ایک میٹھی نیند سلا دیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ انکا بیٹا طارق جو انکا واحد سہارا تھا انکا بیحد خیال رکھتا تھا بلکہ طارق تو انکی پرستش کرتا تھا ہر طرح سے انکی دلجوئی کا سامان فراہم کرتا تھا اور شاید ہی انکے بغیر کہیں جاتا تھا۔ وہ خود بھی ایک خوبرو انسان تھا اور اپنی شائیستگی اور نفاست میں انکی ہی تصویر، پھر اعلی تعلیم اور ایک باعزت نوکری نے اسکی شخصیت میں چار چاند لگا دئے مگر کسی وجہ سے ایک پختہ عمر کو پہنچے کے باوجود اس نے شادی نہیں کی تھی۔ شاید اپنے باپ اور ماں کی ناکام شادی کا اسکے لاشعور پر ایسا منفی اثر پڑا تھا کہ وہ شادی کے لئے تیار ہی نہیں ہو تا تھا۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے نہ صرف مطمئن بلکہ بڑی حد تک خوش تھا۔

مالی فارغ البالی، اعلے تعلیم اور خوش ذوقی کی وجہ سے دونوں سوسائیٹی میں مقبول تھے اور جب یہ کسی تقریب میں جاتے تو سبھی کی توجہ کا مرکز ہو جاتے۔ لوگ انہیں ستائیش کی نظروں سے دیکھتے اور سماجی حیثیت پر رشک کرتے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں جو آرٹس کونسل میں نطاشہ کاشانی کی تجریدی پینٹنگس کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی ان کی نطاشہ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ نطاشہ ایک پختہ عمر عورت تھی جو ایک طویل عرصہ فرانس کی آرٹس اکیڈمیوں میں گذار کر حال ہی میں وطن لوٹی تھی۔ وہ دراز قد، چمپئی رنگت اور بادامی آنکھوں کی مالک تھی۔ اسکے ہونٹ نارنجی لپ اسٹک سے رنگے تھے اور وہ اطالوی باٹل واٹر ''پیلیگرینی'' سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ آرٹس کونسل کے ہال میں روشنیاں دھیمی کر دی گئی تھیں صرف چند اسپاٹ لائیٹس تصویروں کو منور کئے تھیں اور ایک بہت بڑی محراب دار کھڑکی کے اس پار مرمریں فوارے سے گرتے پانی نے ''قل قلِ مینا'' کا سماں باندھ دیا تھا۔ نطاشہ اس نیم تاریک مگر جادوئی ماحول میں کھڑی خود

بھی کسی آرٹسٹ کا شاہکار لگ رہی تھی۔

شاید اسکی کسی تصویر کو دیکھ کر غزنوی صاحب نے کچھ کہا تھا وہ مسکرا کر انکی جانب بڑھی اور اسکی وضاحت کرنے لگی۔ غزنوی صاحب خود بھی اس شام گہرے سلیٹی سوٹ میں ملبوس، ہلکی کریم شرٹ اور ”کرسچین ڈی اور“ کی میرون ٹائی میں بیحد متاثر کن لگ رہے تھے۔ ساتھ ہی طارق بھی اپنا نفیس لباس زیب تن کئے کھڑا تھا۔ تعارف ہوئے، لگتا تھا کہ نطاشہ اس کنبے سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ وہ بہت جوش سے انکو اپنی تصویریں دکھاتی رہی اور ہر تصویر کا پس منظر بتاتی رہی۔ اسکی گفتگو کا مرکز غزنوی صاحب تھے۔ شاید اس لئے بھی کہ انہوں ہی نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ وہ جب کسی تصویر کو بیان کرتے ہوئے کچھ جوش میں آتی تو اس کے نیم تراشیدہ بال اسکے دائیں رخسار پر جھولنے لگتے اور وہ انہیں ایک خاص ادا سے جھٹکا دے کر ہٹانے کی کوشش کرتی۔ غزنوی صاحب تو ایک بنجر سوکھی زمین تھے جو بارش کا ہر قطرہ جزب کرنے کو بیقرار تھی۔ وہ اس کے سحر میں کھوئے جا رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ بارش کب تک برسے گی مگر جب تک بھی برسے وہ اس سے سیراب ہونا چاہتے تھے۔ ادھر نہ جانے کیوں نطاشہ ان لوگوں پر اس قدر توجہ دے رہی تھی کہ لگتا تھا جیسے اس نے اپنی نمائش کا اہتمام صرف اسی خاندان کے لئے کیا ہو۔ چلنے سے پہلے نطاشہ نے ان سے پھر ملنے کی فرمائش کی۔ وہ باتیں کرتے کرتے طارق کو بھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی مگر اسکے مخاطب غزنوی صاحب ہی تھے۔ اس نے کہا کہ وہ نئی نئی وطن واپس لوٹی ہے اور اپنا ایک باذوق اور معیاری سماجی حلقہ بنانا چاہتی ہے۔

وہ رات غزنوی صاحب کے لئے ایک مشکل رات تھی۔ گھر آ کر انہوں نے لباس تبدیل کرنے سے پہلے خود کو آئینے میں دیکھا۔ اگرچہ ان پر اوّل شام کی شگفتگی تو باقی نہیں تھی مگر پھر بھی انہیں اپنا سراپا بہت اچھا لگا۔ ہلکی سی تھکن سے رخساروں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں مزید غلافی ہو گئی تھیں اور بکھرے ہوئے بالوں کی کچھ لٹیں انکے ماتھے پر جھول رہی تھیں۔ انہوں نے بیساختہ خدائے تعالی کا شکر ادا کیا کہ قدرت ان پر اس عمر میں بھی مہربان ہے اور وہ بہت سے جواں عمر لوگوں سے زیادہ پرکشش ہیں مگر اس کے ساتھ ہی دل میں ایک ہوک سی اٹھی، جیسے انہوں نے خود سے پوچھا ”مگر یہ سب کس کام کا، کس کے لئے؟؟“ جیسے کسی نے شرارت سے چپکے سے کہا ہو ”نطاشہ، نطاشہ“ پھر خود ہی خجل ہو گئے ”میاں اس قدر خوش گمان نہ ہو، ہوا ہی کیا ہے۔ صرف چند لمحوں کی گفتگو!!“ پھر بھی رات کو نیند مشکل سے آئی اور کئی دفعہ نیند ٹوٹ جانے پر نطاشہ کا سراپا نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔

کئی دن بیچینی میں گذرے، نطاشہ کا تصور انہیں پریشان کرتا رہا ایک بے نام سا انتظار تھا کہ اسکا فون آئیگا۔ ایک دن خود ہی ہمت کر کے فون کیا۔ اس کھیل میں ابھی کچے تھے، اپنی جوانی میں بھی ان حالات سے واسطہ نہیں پڑا تھا کیونکہ جلد ہی شادی ہو گئی تھی اور اس کے بعد نہایت پاکیزگی اور سعادت مندی کے ساتھ شادی شدہ زندگی گزاری تھی اس لئے جب نطاشہ کی آواز سنی تو کچھ نروس ہو گئے اور اس کے سوا کوئی بہانہ فوراً یاد نہ آیا کہ طارق بھی آپکو یاد کر رہا تھا کہ اس کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ نطاشہ فون پر بہت مہذب تھی اس نے خوشگوار انداز سے باتیں کیں۔ غزنوی صاحب نے اسے اپنے گھر پر آئیندہ ہفتے کھانے پر مدعو کیا اس نے ہنس کر کہا کہ یہ میرے لئے خوش قسمتی اور اعزاز کا باعث ہوگا کہ میں آپ کے اور طارق کے ساتھ ایک شام گذاروں۔

غزنوی صاحب کے لئے چند دن گذارنا مشکل ہو گئے۔ کبھی کبھی خود سے جھنجلاتے کہ میں کیا کر رہا ہوں تو کبھی آنے والی شام کے تصور سے دل ہی دل میں لطف لیتے۔ طارق کے لئے یہ ایک عام سی سوشل ایوننگ تھی مگر غزنوی صاحب نے تو اس شام سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ ”یہ آغاز مراسم کیا زندگی میں کسی خوشگوار کروٹ کا پیش خیمہ ہیں؟؟“ انکا دل پوچھتا مگر پھر خود اپنے آپ ہی سے شرمندہ ہو جاتے۔

نطاشہ آئی۔ پہلے لان میں مصنوعی آبشار کے پاس لگی لان فرنیچر کی کرسیوں پر شام کی چائے پی گئی پھر انتہائی نفاست سے سجے ڈرائینگ روم میں گفتگو کی نشست جمی اور پھر تینوں کرسٹل کے شمع دان تلے ڈائینگ روم میں کھانے سے لطف اندوز ہوئے۔ نطاشہ اگرچہ غزنوی صاحب سے محو گفتگو تھی مگر کبھی کبھی ترچھی آنکھوں سے طارق کو بھی دیکھتی تھی۔

غزنوی صاحب کو تو ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے وقت کا پہیہ انکے لئے پیچھے گھما دیا ہے۔ وہ پھر سے اپنے عہد نو جوانی میں داخل ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نطاشہ کچھ ان سے ایسی مانوس ہوئی کہ ملاقاتوں کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی وہ ان کے لئے فرانسیسی ڈشس بنا رہی ہے تو کبھی اطالوی کھانے اور کبھی خود فرمائش کر کے انکے یہاں گارڈن پارٹیز ترتیب دے رہی ہے۔ ایسی حالت میں وہ گھر کا مکمل انتظام سنبھال لیتی اور اسے دیکھ کر غزنوی صاحب اپنی جاگتی آنکھوں میں نہ جانے کیسے کیسے خواب سجا لیتے۔ جب وہ انہیں اور طارق کو کھانے پر مدعو کرتی تو اس بات کا خاص اہتمام کرتی کہ میز پر تازہ پھولوں کے گلدستے کے ساتھ انہی کے رنگوں سے ملتی موم بتیاں بھی روشن ہوتیں۔ ابھی تک نہ تو غزنوی صاحب کو اس بات کی ہمت ہوئی تھی کہ وہ اسے تنہا کہیں ڈنر پر مدعو کریں نہ ہی اس نے کوئی ایسا موقعہ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اکیلے کچھ وقت گذاریں۔ لیکن طارق کی موجودگی میں بھی وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی تھی کہ وہ تنہا ہے اور اب اسے اپنی تنہائی تکلیف دینے لگی ہے۔ اپنے ماضی پر اس نے بہت زیادہ روشنی نہیں ڈالی تھی سوائے اسکے کہ زندگی نہ جانے کیسے تیزی سے گذر گئی ، جب اسے ہوش آیا تو کاروانِ حیات اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ شادی کی عمر نکل گئی تھی۔ اتنی بہت سی ملاقاتوں میں بہت سی عام باتیں ہوئی تھیں مگر اس نے کبھی اس بات کا اشارہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کے لئے کسی قسم کے رومانی جذبات رکھتی ہے۔

غزنوی صاحب ایک الجھن میں گرفتار تھے۔ انکا دل اس غیر یقینی کیفیت کی وجہ سے بیقرار تھا۔ وہ نطاشہ کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتے

تھے۔ انہیں اب بھی طارق کی موجودگی کا احساس تھا اور یہ بھی کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ مگر پھر وہ خود ہی دلیل دیتے کہ یہ تو اسکا اپنا فیصلہ ہے۔ یہ بھی سوچتے کہ انکی عمر کے لحاظ سے نطاشہ شاید آخری موقعہ ہے۔ وہ اگرچہ انکی عمر کے قریب تو نہ تھی مگر پھر بھی وہ اب عمر کے ایسے دور میں تھی کہ اسکو بھی غزنوی صاحب سے بہتر کوئی اور ملنا مشکل تھا۔ قدرت شاید انکو آخری موقعہ دے رہی ہے۔ اپنی نا آسودہ زندگی کو سیراب کرنے کا یہ آخری موقعہ ہے۔ انہیں ہمت کرنی چاہئے۔ جرأت مندانہ قدم تو ہر معاشرے میں مرد ہی کو اٹھانا ہوتا ہے۔ انہوں نے تصور میں نہ جانے کیا کیا رنگین خاکے تراش لئے تھے۔ بچی کھچی زندگی مختصر ہی صحیح لیکن اگر وہ خوش گوار ہو جائے تو کیا برائی ہے۔ بھرپور اور پر مسرت زندگی کے تو چند لمحے بھی انمول ہوتے ہیں۔ انہوں نے نطاشہ کو فون کر کے اگلی شام کھانے پر مدعو کیا۔ اس بات کی بھی وضاحت کردی کہ وہ اکیلے اسے لینے آئینگے۔

شام آئی، شام بھی ایسی کہ قدرت نے بھی جیسے انکے لئے خاص اہتمام کیا ہو۔ مغربی افق سے گہرے نیلگوں بادل اٹھے تھے اور نرم ہوا کے جھونکوں میں بھینی بھینی خوشبو بسی تھی۔ غزنوی صاحب نے دلکش سوٹ زیب تن کیا تھا۔ انہوں نے اپنی کار پارک کی اور میگ نولیا کے پھولوں سے لدے درختوں کی روش سے گذرتے ہوئے نطاشہ کے ٹاؤن ہوم کی گھنٹی بجائی۔ نطاشہ نے مسکرا کر انکا استقبال کیا۔ شہر کی سب سے اچھی ریسٹوران میں مومی شمعوں کی روشنی میں انہوں نے ڈنر کیا۔ دور کونے میں آرکسٹرا دھیمے سروں میں آسٹرین والٹز بجا رہا تھا۔ موم بتی کی روشنی نطاشہ کے چہرے کی داہنی طرف لرزاں تھی اسکے چہرے کا باقی حصہ ایک درخشاں اندھیرے کے حالے میں تھا۔ اسکا یہ پروفائل غزنوی صاحب کو بہت اچھا لگا۔ وہ مستقبل کے حسین خوابوں میں کھو گئے تھے۔ دنیا اس وقت بیحد حسین تھی۔ اپنی طویل اور تشنہ زندگی کا صلہ انہیں ایک تابناک اور پر مسرت زندگی کی صورت میں مل رہا تھا۔ انہوں نے جھک کر کہا ''نطاشہ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔۔ بہت ہی اہم!!'' نطاشہ نے چہرہ انکی طرف موڑا، اسکی آنکھوں میں موم بتی کی لو کا عکس جھلکنے لگا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں'' غزنوی صاحب کو جیسے یہ جملہ کہنے میں صدیاں لگ گئیں مگر جب انکے منہ سے یہ جملہ نکل ہی گیا تو انکو لگا کہ ساری کائینات انکی خوشیوں میں شامل ہوگئی ہو، لگا ہر سو شہنائیاں بجنے لگی ہوں۔ مگر، مگر یہ کیا۔ نطاشہ نے ایسی حیرت سے انکی طرف دیکھا جیسے انہوں نے یہ جملہ کسی اجنبی زبان میں ادا کیا ہو، اسکے چہرے پر سخت کنفیوژن کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بالکل گم سم ہوگئی، پھر کہنے لگی ''اوہ غزنوی صاحب۔۔ مگر میں تو سمجھی تھی آپ مجھے طارق کے لئے مانگنے آئے ہیں'' پھر کہنے لگی ''میں مانتی ہوں کہ میری عمر آگے بڑھ گئی ہے اور میں طارق سے کچھ بڑی ہوں مگر، مگر وقت نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ دیکھئے نا۔۔ میری طرف دیکھئے'' یہ کہہ کر اس نے گردن کو ایک خاص طرح خم دیکر چہرہ اوپر اٹھایا اور بڑے اعتماد سے اپنی آنکھیں انکی آنکھوں میں ڈالدیں۔ پھر کہا ''یہ کیا ضروری ہے کہ مرد ہی عورت سے بڑا ہو۔ آئی ایم سوری مگر آپکو غلط فہمی ہوئی۔ آپ سے تعلقات بڑھانے کی وجہ تو طارق تھا اور میں اس سلسلے میں پہلے آپ کا دل جیتنا چاہتی تھی۔ پھر اب تو آپ عمر کے ایسے حصے میں ہیں کہ۔۔۔'' اس کے بعد غزنوی صاحب کچھ نہ سن سکے انہیں ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ریسٹوران کا خوب صورت ماحول، وہ مومی شمعیں، آرکسٹرا کی دھنیں اور چھت پر لگے فانوس ایک دھماکے سے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ کھانا ختم ہو گیا تھا۔ شام بھی ختم ہو گئی تھی۔ سحر بھی ٹوٹ چکا تھا اور اسکے ساتھ ہی انکا دل بھی۔ کوئی ان سے کہہ رہا تھا ''میاں تم تو ایک کھوٹہ سکہ ہو۔ یہ اب کسی بازار میں نہیں چل سکتا'' وہ اپنے آپ سے بیحد شرمندہ ہوئے اور انہوں نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔

فیض صاحب

فیض صاحب 1960 کے عشرے کے وسط میں بیکار تھے تو کراچی کے دوستوں بالخصوص ان کی عزیز ترین دوست ڈاکٹر شوکت ہارون نے انہیں تین آفرز بھیجیں۔ انہوں نے شوکت ہارون کے خاندان (ڈان والے ہارون خاندان) کے قائم کردہ عبداللہ ہارون کالج کی پرنسپل شپ کا انتخاب کیا۔۔ تدریس اپنا پہلا پیشہ ہونے کی وجہ سے بھی اور اس لئے بھی کہ یہ کالج کراچی کے غریب ترین علاقے میں قائم کیا گیا تھا۔ آگے کی بات جناب حمید اختر کی زبانی سنیے تا کہ آپ کو پتہ چلے کہ کیسے تھے ہمارے فیض صاحب۔۔۔

کراچی گیا تو فیض سے ملنے ان کے گھر پہنچا۔ اس وقت عبداللہ ہارون ٹرسٹ کی روحِ رواں ڈاکٹر شوکت ہارون اور فیض صاحب کے درمیان زبردست بحث جاری تھی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہ لوگ فیض کو (عبداللہ ہارون کالج کی پرنسپل شپ کی) کم تنخواہ دے رہے ہیں مگر بعد میں پتہ چلا کہ ٹرسٹ کی انتظامیہ نے ان کی تنخواہ تین ہزار روپے مقرر کی ہے۔ ڈاکٹر شوکت ہارون انہیں یہی بتانے آئی تھیں۔ فیض نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ یہ تنخواہ بہت زیادہ ہے۔ انہیں صرف اٹھارہ سو روپے ماہوار چاہئیں۔ ڈاکٹر شوکت کے جانے کے بعد میں نے کہا، انتظامیہ نے قواعد کے مطابق جو مشاہرہ مقرر کیا ہے وہ آپ کو قبول کر لینا چاہیئے۔ کہنے لگے۔

بھائی، ہم نے حساب لگا لیا ہے، ہماری ضرورتیں اس رقم میں پوری ہو سکتی ہیں۔ باقی پیسے یہ لوگ کسی اور بہتر کام میں لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ جتنا عرصہ وہ (کراچی کی مزدور بستی کے) اس کالج کے پرنسپل رہے یہی تنخواہ وصول کرتے رہے۔

سفر ہے شرط

قمر جمالی

(حیدرآباد، دکن)

سفر ہے شرط مگر۔۔۔

اسی اگر مگر کے بیچ ساری کائنات کا رمز پوشیدہ ہے۔

اس کی زندگی بھی اسی "اگر مگر" کی نذر ہو گئی تھی۔

زندگی ایک مسلسل سفر ہی تو ہے۔ منزل در منزل۔

انسان لاشعوری طور پر جانے ایسی کتنی منزلوں پر سفر کرتا ہے اور کسی پڑاؤ پر پہنچ کر اُسے اپنی منزل سمجھ بیٹھتا ہے۔

مگر۔۔۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا تو احساس ہوتا ہے کہ سامنے ایک اور منزل متقاضیٔ سفر ہے۔

اس نے بھی شاید کسی پڑاؤ ہی کو اپنی منزل سمجھ لیا تھا۔

"پوں۔۔۔ پوں۔۔۔ پوں۔۔۔"

پیچھے سے گاڑیوں کے متواتر ہارن کی آواز سے وہ چونک پڑی اور اسٹیرنگ وہیل سے سر اٹھا کر دیکھا تو شرمندگی کا احساس ہوا۔ سگنل کب کا مل چکا تھا اور سفر شروع ہو گیا تھا۔ محض اس کی وجہ سے ٹریفک رک گئی تھی۔ اس کا دھیان شونا کی طرف پلٹ گیا۔

"زندگی اس دوران کتنا جارحانہ روپ اختیار کر چکی ہو گی۔۔۔!"

اسے رہ رہ کر شونا یاد آنے لگی۔ زندگی کے نام پر صرف پھولتا پچکتا پیٹ اور کبھی کبھی اٹھتی گرتی پلکیں۔ اس میں اب اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ سر گذما کر دیکھ سکتی۔ کبھی کبھی وہ کھلی آنکھوں سے یک ٹک دیکھتی تو لگتا کہ شاید اسے منزل کے نشان دکھائی دے رہے ہوں۔

اپنے بستر پر پڑی آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنا، بس اتنا ہی اس کے حصے میں رہ گیا تھا۔ گُو مُوت میں لتھڑی کسی کے انتظار میں کہ کوئی اس کی صفائی کر دے تا کہ مکھیاں اس کے قریب نہ پھٹکیں۔ جب تک اس کے دَم میں دَم تھا مکھی کیا مجال تھی کہ اس کے قریب پھٹکتی۔۔۔!

"کم ظرف مکھیاں۔۔۔! کمزور کا استحصال کرتی ہیں!!"

وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔۔۔ مگر۔۔۔ دوسرے ہی لمحہ اسے احساس ہوا کہ اگر شیر شکار سے اور مکھیاں غلاظت سے دوستی کر لیں تو جئیں کیسے! دراصل یہی تو Ecology یعنی نظامِ فطرت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کوئی کسی اور کا استحصال کر کے ہی جیتا ہے۔

سرکل پر "اسٹاپ" لگ چکا تھا۔ اس نے اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر ٹکا دیا۔

ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کتنی ہشاش بشاش تھی وہ۔۔۔!

سفید نائلون کا جمپر پہنے، گلے میں موتیوں کی کالر لگائیی ڈرائیور سیٹ کے بازو بیٹھے کس شانِ بے نیازی سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی!

اس کے ہلکے بادامی بھورے بھورے شیمپو سے دھلے بال ہوا میں لہراتے تو بازو سے گذرنے والا ایک لمحے کے لیے اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان موقعوں پر رافعہ کو شونا پر بڑا پیار آتا۔

"کیا قسمت ہے۔۔۔!! وسیلہ چاہیے۔۔۔"

"کس کی قسمت۔۔۔؟ اور کیسا وسیلہ بابا؟"

رافعہ نے پانچ روپے کا سکہ فقیر بابا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی۔۔۔"

فقیر بابا نے شونا کی طرف اشارہ کیا تو رافعہ کا سینہ فخر سے پھول گیا۔

سگنل مل چکا تھا۔ اسٹیرنگ پر رافعہ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

مگر۔۔۔

وہ لفظ "وسیلہ" اس کے کانوں میں کورس کی طرح بجنے لگا۔

وسیلہ۔۔۔ ہاں وسیلہ ہی تو ہے جو منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

جب وہ چھوٹی تھی۔۔۔

بابا جب بھی جمعہ کی نماز سے واپس آتے وہ بابا سے ضرور پوچھتی:

"بابا! آج کے خطبے میں کیا خاص تھا۔۔۔؟"

ایک دن۔۔۔

اس کے بابا نے بتایا کہ اس جمعہ کے خطبے میں خطیب صاحب نے ایک کہانی سنائی کہ ایک لمبی چوڑی گاڑی میں ایک لحیم شحیم کتا اپنے مالک کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے بڑی شانِ بے نیازی سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا جسے دیکھ کر راہرو رشک کر رہے تھے۔ خطیب صاحب نے مصلیوں سے پوچھا کہ کیا کوئی بتا سکتا ہے اس کے ایسے نصیب کیسے ہوئے؟ سب سر جھکا کر چپ رہے۔ تب خطیب صاحب نے کہا:

"یہ وسیلہ ہے۔۔۔"

تب

بابا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔۔۔

"بیٹا۔۔۔! انسان کو بھی دین و دنیا میں سرخ رو ہونے کے لیے وسیلہ درکار ہے۔"

شاید اس کی زندگی میں اس وسیلے کی کمی تھی۔ ورنہ تو سب کچھ ٹھیک تھا۔

بظاہر تو قابلِ رشک تھا۔ گھر دار، شوہر، بچے۔۔۔ خود اس کے جنے نہیں تو کیا ہوا۔۔۔ تھے تو اس کے شوہر ہی کے۔

"پھر۔۔۔ میرے نصیب کو کیا ہوا۔۔۔؟ ہوں تو نصیبوں والی۔۔۔!!!"

رافعہ کو خود پر ہنسی آ گئی۔۔۔

مگر۔۔۔ یہ بے چینیاں ۔۔۔ یہ ادھورا پن۔۔۔ یہ اندر ہی اندر ٹوٹنے پھوٹنے کا احساس۔ ضمیر کے کچوکے اور اندر اتھل پتھل ہوتی کچھ کہی اَن کہی کہانیاں۔۔۔ یہ سب کیا ہیں۔۔۔؟!

وہ تو اپنے امی بابا کی نورِ نظر تھی۔

اچھا خاصا ہنستا کھیلتا خاندان۔ بابا نے سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد گریجویٹی کی رقم سے کار خرید کر رافعہ کو تحفتاً دی تھی۔ پہلے بھی کار تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بابا کے بازو والی سیٹ پر بیٹھی بابا کو کار چلاتا ہوا غور سے دیکھتی اور سوال پر سوال کیے جاتی۔ اسی لیے وہ بنا کسی استاد کے کار چلانا سیکھ گئی تھی۔ شاہراہوں پر آنے سے قبل اس نے گلی محلوں میں کار چلا کر خوب ہاتھ صاف کر لیا تھا۔ امی بابا اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ اس پر فخر کرتے تھے۔ اس کے اچھے مستقبل کا خواب خود بھی دیکھتے اور رافعہ کو بھی احساس دلاتے کہ اس کا مستقبل شاندار ہوگا۔

مگر۔۔۔

اس منحوس شام امی بابا کسی کام سے باہر گئے تو لوٹ کر ان کی لاشیں ہی گھر آئیں۔

اُف۔۔۔! کیا قیامت تھی۔۔۔!!

''میڈم۔۔۔ میڈم۔۔۔!''

ٹریفک کانسٹبل زور زور سے کار کی کھڑکی پر ہاتھ مار رہا تھا۔

''سوری۔۔۔''

وہ خود سے شرمندہ ہوئی اور آگے بڑھ کر ٹریفک میں شامل ہوگئی۔

کچھ ہی دور چلی ہوگی کہ اسے احساس ہوا کہ ٹریفک تو بہت پیچھے چھوٹ چکی ہے۔

''شٹ ناسٹلجیا۔۔۔''

اس نے رک کر سانس لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ سرکل پر غلط رُخ پر آگے بڑھ گئی ہے اور اس کی کار شاہ راہ پر لگ گئی ہے۔ اب دو تین کلومیٹر سے پہلے تو اسے کوئی یُوٹرن ملنے والا نہیں۔

میٹروسیٹیز کا یہی تو رونا ہے۔ کسی موڑ پر اگر راستہ پاؤں سے چھوٹ جائے تو الٹا سفر گلے پڑ جاتا ہے۔

اب اس کے پاس آگے بڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ارشد سے شادی کرنا خود اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ ارشد اس کا باس تھا، اس کی کمپنی کا موسٹ ایلیجبل وِڈوَر۔! ساری لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ مگر ارشد نے خود سے رافعہ کو پروپوز کیا تھا۔

اس وقت۔۔۔ رافعہ نے سوچا کہ قسمت نے یاوری کی۔ وہ تنہائی سے خوف زدہ تھی اور کسی مونس وغم خوار کی متلاشی تھی جو زندگی بھر اس کا ساتھ نبھائے۔ واقعی ارشد نے رافعہ کو کبھی دھوکہ نہیں دیا۔

مگر۔۔۔

اس اگر مگر نے ہی رافعہ کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ یُوٹرن مل گیا تھا۔ وہ دوبارہ راستے پر لگ گئی تھی۔

''زندگی کتنا بھیانک روپ اختیار کر چکی ہوگی۔۔۔!''

وہ خود سے شرمندہ ہوئی۔ ایک ذرا سی غلطی کو سدھارنے میں ایک گھنٹہ نکل گیا۔

دراصل وہ ایک VET کے پاس جارہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے کہیں وہ اور کسی کام سے نکل نہ جائے۔ اس نے موبائل فون کا بٹن آن کر دیا۔

''یس میڈم'' اُدھر سے جواب ملا۔

''ڈاک! میں شرمندہ ہوں۔ ٹریفک کی وجہ سے تاخیر ہوگئی۔ میں بالکل پاس میں ہوں۔ آپ تیار ہیں نا؟''

''یس میڈم''

ڈاکٹر کے جواب پر اسے تسلی ہوئی۔ اس نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

اب اس کا ذہن پوری طرح شونا کی طرف پلٹ چکا تھا۔ دل سے ہوک سی اٹی اور اس نے شونا کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو احساس ہوا کہ شونا تو موت کے انتظار میں صحن میں پڑی تھی۔

اس کا سارا جسم معطل تھا اور دم آنکھوں کی پتلیوں میں سمٹ آیا تھا جنہیں کبھی کبھی حرکت دے کر یہ احساس دلاتی تھی۔۔۔

''ماسٹر۔۔۔! میں بہت تکلیف میں ہوں۔''

ارشد یہی کہہ رہے تھے۔ شاید وہ اس کی زبان سمجھتے ہوں۔ اُسے تو جانوروں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جانور پالنا ارشد کا شوق تھا۔ یہ ایک لیبرے ڈور (Labredor) تھی، ہلکی بھورے رنگ کی۔ تقریباً ڈیڑھ دو فٹ اونچی اور تین ساڑھے تین فٹ لمبی۔ جب وہ اپنے جسم کو حرکت دیتی تو اس کی گردن اور دُم کے نکھرے نکھرے بادامی بال بڑے خوبصورت لگتے۔

اس نے اچھی زندگی جی۔ بارہ بچے پیدا کیے۔ دو تو اس کی آنکھوں کے سامنے پل کر جوان ہوئے اور باقی دس اسی طرح کھاتے پیتے گھرانوں میں گدّی نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی سالگرہ کے موقع پر ارشد اور رافعہ بھی مدعو ہوتے اور رافعہ ان کے لیے سوٹس اور جمپرز اپنے ہاتھ سے سی کر لے جاتی۔ اسے کپڑے سینا بہت پسند تھا۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی شونی کے لیے بھی نت نئے ڈیزائن کے جمپرز اور کالرز سیتی اور جب کبھی باہر جانا ہوتا اسے ایک نیا لباس پہناتی۔ شونی تھی بھی بڑی خوبصورت۔ لمبی تھوتھنی، صاف وشفاف صورت، لہراتے بادامی بال۔

اور آنکھیں۔۔۔

غضب کی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل کی تحریر اللہ نے پیدائش ہی سے بخش دی تھی۔ اسے اپنی شونی سے بے انتہا پیار تھا۔

مگر۔۔۔

وہ اسے اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے نہیں دیتی تھی اور نہ کبھی ہاتھ

پیر چاٹنے کی اجازت تھی۔ جب بھی اس کا لعاب اس کے کپڑوں پر لگ جاتا اور اس کے منہ سے ''چھی'' نکل گیا، سمجھو اس دن گھر میں تنازعہ ہو جاتا۔ ارشد کو شونا کو دِھتکارنا ایک نظر نہ بھاتا اور وہ رافعہ کے سلوک کو مڈل کلاس مورالیٹی کا طعنہ دے کر اس کے باپ دادا تک پہنچ جاتے۔

رافعہ کو یہ سب سہنے کی عادت سی ہو گئی تھی، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ لہروں کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو روکو تو اذیتیں تو اٹھانی ہی ہوتی ہیں۔

مگر۔۔۔

اس دن اسے اپنے بابا کی بہت یاد آتی۔ وہ چھپ چھپ کر روتی۔

بابا کا وہ سفید لباس، اذان کے ساتھ ہی سر پر سفید کروشیا کی ٹوپی لگا کر مسجد جانا، امی کا بے داغ لباس اور سر کا ہمیشہ پلّو سے ڈھنکا رکھنا، وہ ایک قدامت پرست خاندان کی پروردہ تھی جہاں بچپن ہی سے کتوں کے لعاب کو نجس سمجھایا جاتا تھا۔ ارشد سے شادی کے بعد اسے لگا کر جس زندگی کا وہ خواب دیکھتی تھی وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اب تو وہ اس طرز زندگی میں محض پیوند کی طرح جڑی ہوتی تھی۔

سب کچھ الٹا۔۔۔

بیٹا، باپ کے ساتھ بیٹھا بلانوشی کرتا تو باپ کا سینہ فخر سے پھول جاتا اور بیٹی شادی سے پہلے ہی کسی کے ساتھ رہ رہی ہو تو احساس ہوتا کہ بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ حد تو یہ کہ جب بھی ارشد شراب پی کر بستر پر آتے تو اُسے اُن سے گھن سے آتی۔ وہ اپنی بلانکٹ میں اور سمٹ جاتی اور دونوں گھٹنے پیٹ میں سمیٹے گہری نیند سونے کا ناٹک کرتی حالانکہ ایسا کرتے ہوئے وہ خود کو گنہگار محسوس کرتی، اس کے اعصاب پر ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں''^(۱) کی قرأت مسلسل ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتی۔

شادی کے بعد جب رافعہ پہلی بار ارشد کی پہلی بیوی کے بچوں سے متعارف ہوئی تو اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

اسی دن۔۔۔

اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ زندگی اب صرف بہتی لہروں پر ڈولنے کا نام ہے۔ لہروں کی مخالف سفر کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کے منہ سے کچھ نہ کچھ نکل ہی جاتا تھا۔

ایسے ہی ایک دن۔۔۔

''ارشد! آپ نے تو اُن گوروں کا کلچر خوب اپنا لیا، مگر کیا رتّی بھر بھی انہیں سکھا پائے۔ یہ ''لیونگ ریلیشن شپ'' ہماری تہذیب کا حصہ نہیں ہے۔ یہ گناہِ عظیم ہے۔ ماریہ کو روکئے۔ کیوں جہنم کے حصہ دار بنتے ہو۔!''

ایک قیامت ٹوٹی تھی۔ اسی دن پہلی بار رافعہ پر دل کا دورہ پڑا تھا۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

وہ منزل پر پہنچ چکی تھی۔ اسکائی ہائی اپارٹمنٹ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس نے فون پر اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔

''تھینکس ڈاک۔ تشریف رکھئے۔''

گھر پہنچی تو شونا حسبِ معمول اپنے بستر پر پڑی تھی۔ پاس ہی کرسی پر ارشد بیٹھے اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ پچھلے سال ارشد پر فالج کا اثر ہوا تھا۔ وہ زیادہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔ تب سے رافعہ ہی باہر کے کام سنبھالتی تھی۔

رافعہ کو قریب محسوس کر کے شونا کے جسم میں جنبش ہوئی۔ تب اُسے احساس ہوا کہ یہ بے زبان کچھ معاملوں میں انسانوں سے کتنا آگے ہے!

وہ شونی کے بازو بیٹھی اس کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

شونا نے آنکھیں کھولیں۔

اُف کیا آنکھیں تھیں۔۔۔!

جن میں بلا کا کرب تھا۔

ایک یاس تھی۔

فریاد تھی۔

اور شکایت بھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔

''مالکن۔۔۔! میں نے چودہ برس آپ کی خدمت کی۔ آپ کے بچوں کو کھلایا، آپ کے گھر اور خاندان کی حفاظت کی، کسی کی کیا مجال تھی جو گیٹ کے قریب بھی پھٹکتا۔

مگر آج۔۔۔

جبکہ میں ضعفِ پیری سے بے بس و لاچار ہوں۔ میری گندگی اور غلاظت نے آپ کو مجبور کر دیا کہ کل کی موت مجھے آج ہی آ جائے۔ کیا یہ محض اس لیے کہ میں انسان نہیں، جانور ہوں۔۔۔؟!!

''نہیں۔۔۔''

رافعہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے پلٹ کر ارشد کی طرف دیکھا۔

''ایسا مت کرو ارشد۔۔۔! ہم ایک خون ناحق کے مرتکب ہو جائیں گے۔''

رافعہ کے دل میں درد کی ہُوک اٹھی۔ دو سال پہلے ہی اس کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی۔ درد شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ دبا کر پکڑ لیا اور بے اختیار رونے لگی۔

''تو اب کیا ارشد صاحب۔۔۔؟'' ڈاکٹر بے چین ہو اٹھا۔

''ایک منٹ ڈاکٹر۔۔۔''

ارشد نے پلٹ کر ملازم کو آواز دی۔

''نرنجن! میڈم کو اندر لے چلو۔''

''میں ابھی آیا ڈاکٹر۔ پلیز۔۔۔ ایک بار آپ اُسے دیکھ تو لیں۔''

''کیا دیکھوں ارشد صاحب؟ خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔ اس کی بڑی آنت سڑ گئی ہے۔ یہ جو فاسد خون باہر آ رہا ہے اس سے شدید قسم کا انفکشن پھیل سکتا ہے۔ میں اس کے بچپن سے اس کا معالج ہوں۔ دُکھ تو مجھے بھی ہے۔ ویسے یہ لیبرے ڈور ہے۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چودہ سال ہو سکتی ہے۔ یہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکی ہے۔ آج نہیں تو کل مر ہی جائے گی۔ اس کا سفر تمام ہوا۔''

''ایکسکیوزمی۔۔۔ابھی آیا۔''

رافعہ کی حالت نے خوداُن پر رعشہ طاری کردیا تھا۔

''یہ کیا بچگانی حرکت ہے رافعہ۔۔۔!''

وہ رافعہ کے سرہانے بیٹھے اسے سمجھانے لگے۔

''ارشد! بڑھاپا سب کا ایک جیسا ہوتا ہے خواہ وہ انسان ہو کہ حیوان۔ اس کی آنکھوں کی بے بسی میں، میں نے خودکو دیکھا ہے۔ کل کو میرا بھی یہی حشر ہونا ہے۔ میری تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔''

''ہوش کی باتیں کرو۔ تم جانور سے اپنا مقابلہ کیسے کرسکتی ہو۔ جانوروں کے لیے ''مرسی کلنگ'' (Murcy Killing) قانوناً جائز ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی اینس (ANUS) سے نکلا خون شدید انفکشن پھیلاسکتا ہے۔ تم آرام کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ باہر آئے تو ڈاکٹر گیٹ کی طرف رخ کیے فون پر بات کررہا تھا۔ انہوں نے بات ختم ہونے کا انتظار کیا، پھرآواز دی۔

''آپ آگے بڑھیے ڈاکٹر۔''

''مگر۔۔۔میڈم۔۔۔؟''

''انہیں میں سنبھال لوں گا۔ وہ ایسی ہی ہیں۔ کسی کا درد برداشت نہیں کرسکتیں۔ پھر اسے تو انہوں نے اولاد کی طرح پالا ہے۔''

''ام۔۔۔سوتو ہے۔'' آخر ڈاکٹر بھی انسان ہے۔۔۔!

''یُو پروسیڈ پلیز۔۔۔''

ڈاکٹر نے پہلے تو شونا کی وین (Vein) ڈھونڈنے کی کوشش کی، پھر ۔۔۔انجکشن اس کے دل میں گھونپ دیا۔ شونی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے اپنی ضعف بھری آنکھیں کھول کر ایک نظرِ ترحّم سے مالک کی طرف دیکھا پھر۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کی پلکیں گرگئیں۔

''مالک۔۔۔مالک۔۔۔میڈم۔۔۔میڈم''

اندر سے نرنجن بھاگتا ہوا آیا۔

''کیا ہوا میڈم کو۔۔۔؟''

وہ اپنا واکر اٹھا کر تقریباً دوڑتے ہوئے اندر پہنچے۔ رافعہ بستر پر بیہوش پڑی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔

''ہیلو۔۔۔ہیلو! ایمبولینس ۔۔۔ہیلو۔۔۔ایمرجنسی۔۔۔ہارٹ اٹیک۔۔۔ پلیز۔۔۔پلیز۔۔۔''

''یہ تم نے کیا کیا رافعہ۔۔۔! میں نے تو اسے سختی سے نجات دلائی''

انہوں نے جھک کر رافعہ کی پیشانی کا بوسہ لیا اور دھم سے کرسی پر گر پڑے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور خود ان کا دل متکلم ہوگیا تھا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً ٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً٥ (۲)

۱۔ سورۃ البقرہ، آیت:۲۲۲

۲۔ سورۃ الم نشرح، آیات:۵۔۶

''چُپ کر۔۔۔''

سالِ نو لے کے کون آیا ہے؟
کوئی Omicron آیا ہے

اس کا سارا چلن ہے Covid کا
یہ بھی ظالم Cousin ہے Covid کا

ہے یہ تشویش طبّی عملے میں
تیز تر ہے، یہ اپنے حملے میں

گھر میں بیٹھا ہوا ہوں، ڈھک چھپ کر
بام و در کہہ رہے ہیں، ''بس''، چُپ کر

کہہ رہا ہے مگر یہ سال نیا
پھر دکھاؤ کوئی کمال نیا

یونہی بیٹھے رہو گے تم کب تک
دل پہ دیتی ہے حسرتیں دستک

بند گھر میں رہوں تو دنیا تنگ
گھر سے باہر ہے وائرس سے جنگ

کوئی بتلاؤ ، کیا کِیا جائے
عبؔد، کب تک یونہی جیا جائے

عبدالرحمٰن عبد

(نیویارک)

مٹی

تابش خانزادہ

(نیویارک)

جب میری دادی امّاں نے چچا عظیم کو میرے سامنے چچا کہا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں بھلا کہاں خاموش رہنے والا تھا اس لیے تجسس کے عالم میں دادی سے سوال کیا۔ آپ انہیں چچا کیوں کہتی ہیں وہ تو آپ کے بچوں جیسا ہے؟ میرے سوال پر دادی جان کا اتنا زوردار قہقہہ نکلا کہ ان کی بتیسی منہ سے نکلتے نکلتے بچی۔ انہوں نے بتیسی منہ میں دوبارہ فٹ کرتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں بیٹا، چچا عظیم بڑی پُرانی ہڈیوں سے بنے ہیں۔ میں جب تمہاری عمر کی تھی تو چچا عظیم اس وقت بالکل ایسے تھے جیسے تم انہیں آج دیکھ رہے ہو۔

وہ صرف ہمارے گاؤں کے ہی نہیں جگت چچا تھے۔ پتلے لمبے قد پر گرجدار آواز والے سر پر سفید پگڑی، سفید لٹھے کا گھٹنوں تک لمبا کرتا اور سفید دھوتی انکا مستقل لباس یا یونیفارم ہوا کرتا تھا۔ میں نے تمام عمر انہیں کبھی کسی اور رنگ کے یا کچھ اور پہنے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچے بن کر ان کے ساتھ گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلتے اور بسنت کی پتنگیں اڑاتے۔ ان کے کُرتے کی جیب سنگترے والی میٹھی گولیوں سے بھری رہتی تھی جو وہ ہر آنے جانے والے بچوں میں رات دن ہنستے ہوئے تقسیم کرتے تھے۔ نوجوانوں کے ساتھ وہ کبڈی کھیلتے اور بزرگوں کے ساتھ جرگے میں بیٹھ کر اپنے اور آس پاس کے گاؤں والوں کے جھگڑوں کے فیصلے سنایا کرتے تھے۔ فوج سے ریٹائر تھے اور چند بیگھے زمین کے مالک تھے اس لیے بڑی بےفکری کی زندگی گزار رہے تھے۔

گاؤں میں کسی کی شادی ہوتی تو چچا بارات کے آگے ناچتے گاتے ہوئے پائے جاتے اور جنازوں میں وہ بڑی غم گساری سے شریک ہوتے۔ نہ صرف ہمارے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں ان کی شرکت کے بغیر کوئی غمی خوشی پوری نہ سمجھی جاتی تھی۔ ہنس مکھ اور زندہ دل اتنے کہ وہ جہاں ہوتے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی خوش گپیاں اور ان کے قہقہے سننے کے لیے ان کے آس پاس مجمع سا لگ جاتا۔ ایک دن ایسے ہی مجمع میں گھرے تھے کہ جمعہ نائی نے انہیں ملک سائیں کی جانب سے بلاوا آن دیا۔

سائیں جی ہمارے گاؤں کے بڑے زمیندار کیا مالک تھے۔ انکا بھائی سرکار کی کابینہ میں وزیر زراعت تھا اور اسی نسبت سے ملک صاحب گاؤں کے نوے فیصد رقبے کے بلاشرکت غیرے مالک تھے اور گاؤں میں ایک دو گھروں کو چھوڑ کر باقی تمام یا تو ان کے مزاعے تھے یا پھر ان کے ذاتی ملازم تھے۔

سائیں جی نے چچا کو بڑی عزت سے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ وہ گاؤں میں ایک بڑی شوگرمل لگوانے والے ہیں اور ان کے نقشے کے مطابق چچا کی زمین ان کی مل کے درمیان پڑتی ہے اس لیے چچا اپنی زمین اگر انہیں بیچ دیں تو ان کی شوگرمل تکمیل کے مراحل جلد پورے کر سکتی ہے۔ چچا نے بڑی نرمی سے اپنی زمین بیچنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ چند بیگھا زمین ان کے آباء کی نشانی ہے اور وہ اسے اپنے جیون میں نہیں بیچیں گے۔

اس کے چند روز بعد ایک رات چچا کی گندم کی فصل میں آگ لگ گئی جو صبح تک راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ اس واقعے کو ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ چچا کو عدالت نے سمن جاری کیا کہ وہ اپنی زمین کے مالک نہیں تھے مزارعے تھے اور زمین دراصل ان کے پرکھوں نے سائیں کے پرکھوں سے بہائی کے لیے لی تھی اس لیے سائیں جی زمین کے اصل مالک ہیں۔ چچا نے وکیل کرنے کی کوشش کی تو کوئی وکیل ان کا مقدمہ سائیں جی کے خلاف عدالت میں لڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے ایک وکیل ملا اور اس نے چچا سے مقدمہ لڑنے کی اتنی فیس مانگی کہ چچا کو اپنے گھر والوں کے زیورات بیچنے پڑے اور اس کے بعد چچا روزانہ گھوڑے پر بیٹھ کر عدالت کے چکر لگاتے۔

اب وہ بچوں میں میٹھی گولیاں تقسیم کرنے کی بجائے انہیں بات بے بات ڈانٹتے، جوانوں کو کبڈی کھیلتا دیکھ کر گالیاں دیتے۔ کسی کو ہنستا دیکھ کر چڑ جاتے۔ ان کے چہرے کی تازگی اور اس پر ہمیشہ رہنے والی مسکان ختم ہوتی گئی اور اس کی بجائے ان میں چڑچڑا پن داخل ہو گیا۔ پھر ایک رات ان کا گھوڑا تھان پر مردہ پایا گیا۔ اب وہ عدالت میں جانے کے لیے گھنٹوں بیٹھ کر بس کا انتظار کرتے اور عدالت تک پہنچتے پہنچتے عدالت کا وقت نکل جاتا اور مدعی کی غیر موجودگی میں مقدمے کا فیصلہ سائیں جی کے حق میں ہو جاتا۔ کئی سال اس مقدمہ بازی میں نکل گئے اور چچا ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک کے تمام مقدمات ہار گئے اور ان کی زمین ملک سائیں کی ملکیت قرار دی گئی۔

ہمارے گاؤں میں شوگرمل کی رسمِ افتتاح کا دن آج بھی سب کو کسی گزرے ہوئے کل جیسا یاد ہے جب سارے گاؤں کی کچی سڑکوں پر چھڑکاؤ کیے گئے اور نالیوں پر چونا ڈالا گیا۔ سارا دن وفاقی اور صوبائی وزیر اور مشیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لمبی لمبی گاڑیوں میں آتے اور سائیں جی کی حویلی میں دعوتیں اڑاتے رہے۔ بڑے بڑے ٹینٹ لگا کر پلاؤ کی کئی دیگیں پکائی گئیں اور سارے گاؤں والوں میں مفت کھانا تقسیم کیا گیا۔ شام کے چھ بجے وزیراعظم نے ہیلی کاپٹر سے اتر کر شوگرمل کی بنیاد ڈالی، چند منٹ کی تقریر کر کے گاؤں والوں کو ترقی کی خوش خبری سنائی اور چند لقمے کھانا کھانے کے بعد ہیلی کاپٹر پر بیٹھ چلے گئے۔

ایسی گہما گہمی کے دوران سائیں جی پر دل کا جان لیوا دوڑا پڑا اور وہ ہمارے گاؤں میں شوگرمل کا پہلا اور سائیں جی کی سانسوں کا آخری دن ثابت ہوا۔ دوسرے روز کئی سرکاری وزیر اور مشیر سائیں جی کے جنازے میں شامل تھے۔

باقی صفحہ ۸۳ پر ملاحظہ کیجیے

''برکندہ دل''

خواجہ میر درد

(●)

نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے
کسے دماغ کہ ہو دوبدو کمینے سے

نہیں خیال مجھے خاتمِ سلیماں کا
برنگِ نام ہوں برکندہ دل نگینے سے

بسانِ دانہ انگور مے پرستوں نے
لیا ہے فیض مرے دل کے آبگینے سے

ترقّی اور تنزّل کو یاں کے کچھ عرصہ
مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تُو نہ مر جاوے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مآلِ کار سُجھایا قبُور نے ہم کو
یہ نقد مال لگا ہاتھ اس دفینے سے

بسا ہے کون ترے دل میں گل بدن اے دردؔ
کہ بُو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

○

عبداللہ جاوید

(کینیڈا)

اگر سیلاب کا چہرا نہ دیکھا
تو گویا آپ نے دریا نہ دیکھا

رکھیں آنکھیں کھلیں گو ہم نے دل کی
مگر دل سا کوئی اندھا نہ دیکھا

عبث تھا بھاگنا دنیا کے پیچھے
جو بھاگے ان سے پھر کیا کیا نہ دیکھا

فقیری تو گنوانے کا ہنر ہے
وہ پیالہ کیا جسے ٹوٹا نہ دیکھا

پڑی جب روشنی پرچھائیں ناچی
کوئی بھی ناچنے والا نہ دیکھا

رہے سب پیڑ کے سائے کے نیچے
کسی نے پیڑ کو جلتا نہ دیکھا

گلی میں ہم نے اکثر دھوپ تاپی
کسی دیوار کا سایا نہ دیکھا

زمانے نے بہت سے لوگ دیکھے
کوئی مجھ سا ، کوئی تجھ سا نہ دیکھا

وہ سب دیکھا فلک نے جو دکھایا
زمیں نے آج تک کیا کیا نہ دیکھا
ق
مگر جو آدمی دکھلا رہا ہے
زمیں نے آج تک سوچا نہ دیکھا

کبھی جاوید یہ دنیا سے پوچھو
یہاں کیا دیکھنا تھا کیا نہ دیکھا

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

مرا دل جب تمہارے بن رہا تھا
پرندے آتے جاتے گِن رہا تھا

یہاں تو شام تک رُکنا تھا اُس کو
چلا ہے وہ جب آدھا دن رہا تھا

زباں کے ذائقے بدلے ہوئے تھے
محبت کا مزہ لیکن رہا تھا

بدل کر، گاؤں والا آ گیا ہے
پرانے دیس کا ساکن رہا تھا

اسی سے میرا دل روشن ہوا ہے
مرے گھر اک سیہ باطن رہا تھا

غم و ادراک سے تحفے ملے تھے
اکیلا پن مرا محسن رہا تھا

گزر جاتے ہیں ہنستے کھیلتے جو
وہ میرے پاس اتنے دن رہا تھا

اُسے دیکھا تو دیکھا احتیاطاً
مرا ایمان ثاقب چھن رہا تھا

◆

انتظار باقی

(جھنگ)

گفتگو اُن سے رہے، بات کسی شکل میں ہو
اک ملاقات، ملاقات کسی شکل میں ہو

ہم ترا ساتھ نہ چھوڑیں گے سرِ راہ کبھی
ہم سفر! صورتِ حالات، کسی شکل میں ہو

کاٹنا اس کا بڑی بات نہیں ہے پھر تو
بس ترا شہر ہو، خواہ رات کسی شکل میں ہو

ریشہ ریشہ ہے بدن، روئی دُھنک رکھی ہے
کات دے جسم مرا، کات کسی شکل میں ہو

ہاتھ پھیلانے میں کچھ عار نہیں ہے مجھ کو
گر ترا ہاتھ ہو، خیرات کسی شکل میں ہو

یہ فقط میرا مقدر تھا کہ جو مجھ کو ملا
درد سوغات ہے، سوغات کسی شکل میں ہو

جو جنازہ میرے جذبوں کا اٹھا ہے دل سے
ایک بارات ہے، بارات کسی شکل میں ہو

ایک بنیادی تقاضا ہے مودّت اس کا
اک عبادت ہے، بھلے نعت کسی شکل میں ہو

مستجابی کے لیے عجز ہے لازم ہر دم
چاہے پھر حرفِ مناجات کسی شکل میں ہو

توڑ دیتی ہے یہ پسپائی مکمل باقیؔ
رات تو مات ہے، خواہ مات کسی شکل میں ہو

◆

نوشی گیلانی

(آسٹریلیا)

سفر ملال کا ہے اور چل رہی ہوں مَیں
غبارِ شب کی اداسی میں ڈھل رہی ہوں مَیں

عجیب برف کی بارش بدن پہ اُتری ہے
کہ جس کی آگ میں چُپ چاپ جل رہی ہوں مَیں

پھر اِک چراغ جلا شام کی حویلی میں
پھر ایک درد سے آخر سنبھل رہی ہوں مَیں

یہ رکھ رکھاؤ اسے جاننے نہیں دے گا
کہ اپنے آپ میں کیسے پگھل رہی ہوں مَیں

یہ عشق سچ سے جدا کیسے ہو گیا جاناں
اب اس سوال سے باہر نکل رہی ہوں مَیں

بس ایک عشق مِری ذات پر صحیفہ ہو
مِرے خدا یہ عقیدہ بدل رہی ہوں مَیں

○

جاوید زیدی

(یوایس اے)

زیست ہے محبت کا تماشہ ہے
زندگی یار کیا تماشہ ہے

سوچئے زندگی کے بارے میں
یہ تماشہ بڑا تماشہ ہے

سبھی دنیا میں یوں اکیلے ہیں
ملنا جُلنا بڑا تماشہ ہے

بھائی، بہنیں ہیں ماں ہے باپ کہیں
رشتے ناطے، بھلا تماشہ ہے

اے مِری جان اے شریکِ حیات
ارے دنیا بڑا تماشہ ہے

ختم ہوتے نہیں کبھی رشتے
خون کا جا بجا تماشہ ہے

ہنستے چہرے بھی غم اُٹھاتے ہیں
تُو بھی خوش رہ مزا تماشہ ہے

○

رحمٰن فارس

(لاہور)

اِس سے پہلے کہ کوئی اِن کو چُرا لے، گِن لو
تُم نے جو درد کیے میرے حوالے، گِن لو

چل کے آیا ہُوں، اُٹھا کر نہیں لایا گیا مَیں
کوئی شک ہے تو مرے پاؤں کے چھالے گِن لو

جب مَیں آیا تو اکیلا تھا، گِنا تھا تُم نے
آج ہر سمت مرے چاہنے والے گِن لو

مکڑیو! گھر کی صفائی کا سَمے آ پہنچا
آخری بار در و بام کے جالے گِن لو

زخم گننے ہیں اگر میرے بدن کے، یاراں!
تُم نے جو سنگ مِری سَمت اُچھالے، گِن لو

اب نہیں کرتا کسی پر بھی بھروسہ کوئی
گر نہیں مُجھ پہ یقیں، شہر میں تالے گِن لو

مَے کدے میں کئی مشکوک سے لوگ آئے ہیں
ان کو پِلوا دو مگر اپنے پیالے گِن لو

تُمھیں کرنی ہے گر احباب کی گنتی فارس!
آستینوں میں چُھپے دُودھ کے پیالے گِن لو...

○

آفتاب مضطر

(کراچی)

میری گوندھی پَڑی مٹّی پئے تکمیل تو دے!
کُوزہ گر شکل کسی شکل میں تشکیل تو دے!

مکتبِ شوق دو اک روز کی تعطیل تو دے
باقی ہوم ورک میں کر لینے کی تسہیل تو دے

مجھے فتراکِیِ ک عہدِ وفا سہل ہے خوب
نظری عُقدگی اک تھوڑی ذرا ڈھیل تو دے

کچھ تو دے عندیہ مبہم ترا فحوائے کلام
قیل و قالی کا مجھے قول نہ دے، قِیل تو دے

دلِ سادہ وَرقی پر تُو کوئی اسم تو پھونک!
مجھ سَپیدی کو تری یک سخنی نیل تو دے

میں نے کب مرہمی خواہی کا کیا ہے اظہار
اندمالی نہیں کر، زخم مگر چھیل تو دے!

زخم اٹھائے ہوئے منہ، دیکھتا ہے منہ ترا، دیکھ!!
آیتی ہونٹ سے تُو زخم کا منہ کیل تو دے!

پئے نظارگی و دید ہے اب چشمِ دو نیم
پوشِشِ گریہ نہ دے، کوششِ تکمیل تو دے

آئینہ چہرے پہ مضحک ہے بہت ان دنوں اب
چہرہ خوانی کے سوا اب علم کی تحصیل تو دے

سنگِ خارا ہی بتا، موم نہ کہہ، گل نہیں گِن!
دلِ مضطر کو کسی طور کی تمثیل تو دے

○

فیصل عظیم

(کینیڈا)

وہ تارِ عنکبوت آیا کہاں اب تک گمانوں میں
مگر کچھ مکڑیوں کی سرسراہٹ سی ہے کانوں میں

پھر اپنی بھوک اُگائی جائے گی کاغذ کے پیڑوں پر
ابھی تو ہاتھ بانٹے جارہے ہیں باغبانوں میں

زمیں زادوں کو اب مٹّی سے تو وابستہ رہنے دو
خدارا فصلِ نو کا ذوق رہنے دو کسانوں میں

سَروں سے آسماں بھی کیا ہٹایا جانے والا ہے
شبیہیں مہر و مہ کی ٹانکتے ہو کیوں مکانوں میں

نہ پنجے ہیں، نہ پر ہیں اور نہ ہے پرواز کی طاقت
جو نغمہ سنج ہونا ہو تو لکنت ہے زبانوں میں

چلا آتا ہے بستی میں لیے زنبیل فتووں کی
تُو ایسا کر، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

یہ عجیب عہدِ زوال ہے
جو حرام تھا، وہ حلال ہے

ہے جو لوٹ مار مچی ہوئی
بھلا کس کو کس کا خیال ہے؟

اِسی دوڑ میں ہیں مگن سبھی
کہ پرایا، اپنا ہی مال ہے

جو اصول تھے، وہ بھلا دیے
کوئی خوف، ڈر، نہ ملال ہے

یہ ہے اپنی عمر کا ماحَصَل
وہ عروج تھا، یہ زوال ہے

ہمیں حفظ تو ہیں سبھی سبق
عمل ان پہ کرنا محال ہے

نہیں ہم میں اب تو کوئی کمال
یہی ایک ہم میں کمال ہے

فقط اپنے دائرے میں ہیں بند
ہمیں کب کسی کا خیال ہے

ذرا دیکھیے تو مِری وفا !
کوئی اور ایسی مثال ہے ؟

کسے یومِ حشر کا ڈر ریاضؔ
کیا تمہارا بھی یہی حال ہے؟

○

دروازہ

آصف عمران

(لاہور)

لمحوں کی ڈھلوان پر پھسلتی ہوئی شام کی تاریکی ایک فاتح کی حیثیت سے اس شہر کی گلیوں میں داخل ہو رہی تھی اور وہ گرد آلود کھڑکی کے پردے پر سر ٹِکائے ناصر کو سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تھکاوٹ کا غبار اُس کے وجود کے گرد لپیٹ کر مضبوط حصار قائم کرتا جا رہا تھا اور ذہن تھکاوٹ کے بوجھل پن کو محسوس کرتے ہوئے نیم غنودگی کی کیفیت کی غار میں اُترتا جا رہا تھا۔ دراصل سونیا نے ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ آئندہ زندگی کی خواب آلود فضا کے بارے سوچ کر خوشی کے ساتھ ساتھ عجیب سا خوف بھی محسوس کر رہی تھی۔ نامعلوم اندیشوں کے پرندے اُس کے ذہن کے گھونسلے کے چاروں طرف اُڑ رہے تھے۔ سڑک سنسان تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ناصر سارے پروگرام کو حتمی شکل دے کر اُس کے گھر سے نکلا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ جب وہ سڑک پر چلتا تو اُس کے جوتے آہٹ پیدا کرتے اور جب وہ کچے راستے پر اُترتا تو یک لخت خاموشی چھا جاتی۔ سونیا کی زندگی میں آنے والی خوشیاں بھی کچے پکے راستوں پر چلتی ہوئی اُس کے دل کی دھڑکنوں کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔ اچانک سونیا کے دل نے خواہش کی کمند ناصر کے حرکت کرتے وجود کی طرف پھینکی کہ وہ مڑ کر دیکھے تا کہ وہ ایک ہوائی الوداعی بوسہ اُس کی طرف اُچھال سکے۔ اُس نے ابھی سوچا ہی تھا کہ ناصر ایک لمحے کے لئے رُکا اور مڑ کر سونیا کے گھر کی طرف دیکھنے لگا تب سونیا کو یقین ہو گیا کہ ناصر واقع ہی اُسے پیار کرتا ہے۔ اور وہ اُس کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکرائی اور فضا میں اپنا ہاتھ لہرایا۔ سڑک پر گہری ہوتی تاریکی میں شاید ناصر دیکھ بھی نہ سکا ہو مگر وہ خوشی سے سرشار ہو گئی۔ تب اُس نے شام گہرے سایوں میں گرد کے اُڑتے ذروں کا راستہ روکنے کے لئے کھڑکی بند کر کے پردہ آگے کھینچ دیا اور خود دیوار کے ساتھ رکھے آرام دہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اور سامنے دیوار پر لگی ماں کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ ماں کی یاد نے اُسے اُداس کر دیا۔

وہ ماضی کے گہرے سایوں میں گم ہوتی گئی اور پھر اُس کے ذہن کی سکرین پر ماں کی گزری ہوئی زندگی کی فلم کی تصویریں اُبھرنے لگیں۔ یہ سوچ کر دکھی ہو گئی کہ ماں کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکی اور گھر سنبھالنے کی ذمہ داری کا بوجھ اُس کے کندھوں پر آ پڑا۔ اُس کا باپ ایک سخت مزاج آدمی ہے۔ بیوی کی مستقل بیماری کی وجہ سے اُن کی طبعیت پر چڑچڑاپن حاوی ہو چکا تھا۔ ماں سے اکثر جھگڑتے رہتے۔ جب بھی ماں اُن کی بات نہ مانتی اور کوئی دلیل دے کر قائل کرنے کی کوشش کرتی تو وہ ناراضگی کی سب حدیں پار کر جاتے۔ اور ہم دونوں بہن بھائی سہم کر ایک کونے میں دبک جاتے۔ ماں آنسو بہاتی تو گھر کا ماحول اُداسی کی چھاؤں میں چھپ جاتا۔ پاپا لڑ جھگڑ کر گھر سے باہر نکل جاتے اور جب رات کو دیر گئے گھر واپس آتے تو اکثر نشے میں جھوم رہے ہوتے۔ پاپا کے شوق اور ماں کی بیماری کی وجہ سے گھر میں مالی مسائل دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر بھائی گھر چھوڑ کر کسی ورکشاپ پر کام کرنے لگا تھا اور وہاں پر ہی رہتا تھا۔ بھائی کے گھر چھوڑنے کی وجہ سے ماں سخت پریشان ہوئی اور مسلسل بیمار رہنے لگی۔ وہ اکثر سونیا کو بتاتی کہ اُسے خوفناک قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔ ایک دن اُس نے بتایا کہ رات کی گہری تاریکی میں جب اُس کی آنکھ کھلتی ہے تو مجھے کمرے کی تاریکی میں کسی بھوت پریت کی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ کئی سائے دیواروں پر رقص کرتے نظر آتے ہیں اور کئی خوفناک درندے اندھیرے کے گرد باد کی طرح گھوم گھوم کر دیواروں کو ٹکریں مار کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے لگتا کہ ابھی گھر کا دروازہ ٹوٹ جائے گا اور یہ گھر بکھر کر ہوا میں اُڑ جائے گا۔ ہم سب ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے ہونگے۔ میں کسی گہری غار میں گر گئی ہوں اور مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ پاپا ماں کی باتیں سن کر کہتے کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ ہر وقت الٹی سیدھی چیزوں کے بارے میں سوچتی رہتی ہو۔ ہمارے گھر کی دیواریں بہت محفوظ اور دروازہ بہت مضبوط ہے اس کو کچھ نہیں ہوگا۔ بہر حال تم اس طرح کرو کہ پادری صاحب کو ہر ماہ گھر آنے کے لئے کہہ دو تا کہ گھر میں مل کر عبادت کیا کریں۔ پاپا کی ایسی باتیں سن کر سونیا بہت خوش ہوتی۔ ماں اکثر کہتی کہ سونیا بیٹے۔ اب تم بڑی ہو رہی ہو تمہارا بھائی بہت لاپروا لڑکا ہے اس کو گھر کی کوئی فکر نہیں ہے۔ میں بیمار رہتی ہوں میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ سانسوں کی مالا کب بکھر جائے۔ تمہیں ہی اس گھر کا اور اپنے پاپا کا خیال رکھنا ہے۔ گھر کے دروازے سے باہر انسانوں کا ایک جنگل آباد ہے جس میں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں۔ تمہارے پاپا مزاج کے سخت ہیں مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔ بالکل اخروٹ کی مانند۔ اوپر سے بہت سخت مگر اندر سے بہت نرم۔ دراصل ماں پاپا کو بہت پیار کرتی تھیں مگر سونیا ہمیشہ پاپا سے ڈری ڈری رہتی۔ اسی لئے وہ ایک باپ اور بیٹی کے درمیان رشتے کی گرماہٹ کی شدت کو محسوس نہ کر سکی۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر ماں کو کچھ ہو گیا تو میں اور پاپا اس گھر میں کیسے رہ سکیں گے۔

اور پھر ماں کی زندگی کے آخری دن کا آغاز شدید سردی اور دھند سے ہوا۔ رات دیر تک برف باری ہوتی رہی اور ماں کی طبعیت بہت خراب ہو گئی۔ ان کو سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ماں کی طبعیت کا سن کر بھائی کل شام کو آ گئے تھے۔ کمرے میں تمام چیزوں پر اُداسی اور گھٹن کی جھلک نمایاں تھی۔ پاپا بستر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھے غور سے ماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اُداسی کی گہری دُھند چھائی ہوئی تھی۔ سونیا کی آنکھوں میں نمی کی وجہ سے ماں کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تب پاپا کی کمزور سی دم توڑتی آواز نے کمرے کی خاموشی کی چادر کو چاک کر دیا۔ بیٹا اب ہمیں ڈاکٹر کو بُلا لینا چاہیے اور ہاں پادری صاحب کو بھی فون کر دو کہ وہ بھی آ جائیں تا کہ مل کر سب دعا کریں۔ بھائی نے ماں کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر کچھ محسوس کر کے باہر جانے کے لئے دروازے کی

طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا کہ منجمد سورج انتہائی سرد مٹی کا گولہ بن چکا ہے۔ تب سرد ہوا کی لہریں کمرے میں داخل ہوکر دیواروں سے چپک گئیں۔ بھائی تیزی سے باہر نکل گیا۔ سڑک کئی فٹ جمی برف کے نیچے دفن تھی۔ ہر طرف برف کی سفیدی محیط تھی۔ سخت برف کے اُوپر نرم برف کی موٹی تہہ بچھی ہوئی تھی اور اُس کے قدم اس نرم برف میں اندر دھنس رہے تھے اور اُسے چلنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ ہمت کر کے ساری طاقت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا کیونکہ اُس کی ماں کی زندگی کا سوال تھا۔ اُسے ہر حال میں ڈاکٹر کو ساتھ لے کر جلد از جلد واپس آنا تھا۔ سونیا نے قریب ہوکر ماں سے پوچھا۔ امی آپ کہاں پر تکلیف محسوس کر رہی ہیں؟

سب جکہ۔ پورے جسم میں۔ سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ میں ساری رات سو نہیں سکی ہوں۔ اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔ سردی بہت ہے ہیٹر جلا دو۔ اچانک ماں کو کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ کھانستے کھانستے نڈھال ہوگئیں۔ سونیا کو آواز کسی گہری غار سے آتی محسوس ہوئی۔ موت کا خیال آتے ہی سونیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ ماں تو وقفوں میں مر رہی ہے۔ موت کے لہراتے سایوں کو کمرے میں چاروں طرف گھومتے دیکھ کر سونیا شدید خوف میں مبتلا ہوگئی۔ اُس نے اس خوف کے طوفان کے سامنے اپنی ہمت کا بند باندھنے کی بار بار کوشش کی تاکہ اس طوفان کو اپنے ذہن کے آنگن سے باہر روک دے۔ مگر ہر مرتبہ یہ خوف زیادہ شدت سے اُچھل کر سامنے آ جاتا۔ وہ سوچنے لگی کہ ماں کی بیماری ایک وحشی اور منہ زور جانور ہے جو ابھی ماں کو زمین پر پٹخ دے گا۔ اور پھر یہ بدمست جانور موت کا روپ دھار کر ابد تک ماں کے جسم کو تار تار کرتا رہے گا۔ جبکہ ماں کی آنکھوں میں زندہ رہنے کی خواہش اب ضد کی شکل میں اُبھر رہی ہے۔ ڈوب رہی ہے۔ اور پاپا خاموشی سے اُداسی کی دلدل میں دھنستے جا رہے تھے۔

یخ بستہ نالوں کے کنارے خزاں رسیدہ درختوں کی شاخوں کے نیچے اور سردی سے ٹھٹھرے ہوئے آسمان کو سر پر اُٹھائے سفید نرم برف کی تہہ کے نیچے دفن شدہ راستوں پر چلتے ہوئے ڈاکٹر اور پادری صاحب آگے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ بھائی ٹھنڈے ہاتھوں کو زندگی کی حرارت کی پوشاک پہنانے کے لئے ہیٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کو گہری نظر سے دیکھا اور معائنہ شروع کیا۔ دل کی دھڑکن، کم ہوتا بلڈ پریشر اور ڈوبتی نبض کو چیک کیا۔ پھر بند ہوتی آنکھوں کے پپوٹوں کو اُوپر اُٹھا کر آنکھوں کے صحرا میں زندگی کے آثار تلاش کرنے لگا۔ ماں جی کہیں درد تو نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹر نے پیار سے پوچھا۔ ماں نے سر ہلا کر نہیں میں جواب دیا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے دروازہ کھول دینے کا کہا۔ ان کو سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس لئے سردی کے باوجود بھائی نے دروازہ کھول دیا۔ ایک لمحہ کے لئے ماں کا چہرہ پُرسکون ہوگیا۔ ماں نے پاپا کی طرف غور سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر انجکشن لگانے کے لئے ماں کے بازو میں وین تلاش کرنے لگا مگر ہر کوشش پر سرنج کی سوئی وین میں داخل ہونے میں ناکام رہی۔ ڈاکٹر مایوس ہوگیا۔ سونیا نے مضبوطی سے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگتا ہے بات ختم ہو رہی ہے۔ پاپا نے ڈاکٹر کے پاس آ کر مایوسی سے کہا۔ ہاں۔ مین بھی ایسا ہی دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہم سے دور جا رہی ہیں۔ پادری صاحب آپ دعا کریں خدا ہم سب کو ہمت اور صبر عطا کرے۔ ڈاکٹر نے پادری صاحب کو قریب بلایا اور خود اپنا بیگ سمیٹنے لگا۔ تب پاپا بھی آگے بڑھے اور ماں کے چہرے پر جھک کر بڑی بے بسی سے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں سوال چھلک پڑا۔ کیا واقع ہی ہم کو چھوڑ کر جا رہی ہو۔ خاموشی۔ سونیا کو محسوس ہوا کہ ماں آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہنے کے لئے تو نہیں ملے تھے۔ آخر ایک کو تو پہلے جانا ہی تھا۔ نیم وا آنکھیں جواب دیتے دیتے بند ہوگئیں۔ ہر چہرے پر اُداسی نے ڈیرے ڈال لیے۔ پادری ساحب نے آگے بڑھ کر دعا کی اور ماں کو اپنے کہے ہوئے الفاظ دہرانے کو کہا۔ ماں نے ہونٹ ہلائے لیکن کوئی ان کی آواز نہ سن سکا۔ سونیا حسرت سے ٹکٹکی باندھے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اچانک کسی خیال پر وہ چونک گئی اُسے یوں لگا جیسے کوئی انوکھی بات ماں کو حیران کر رہی ہے۔ تب ماں نے ایک گہری اور آخری سانس لی۔ اُس کے جسم کے پنجرے کا دروازہ کھلا اور پرندہ اُڑ گیا۔ اُس کی زندگی کی تسبیح کی ڈور جھٹکے سے ٹوٹ گئی اور سانسوں کے دانے بکھرے اور پھر کھلے دروازے سے فضا کی بیکراں وسعتوں میں کھو گئے۔ ڈاکٹر ماں کی آنکھوں کے دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے لگے تو اُس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی حیرت ایک لمحہ کو عیاں ہو کر ہم سب کو عمر بھر کے لئے بے چین اور تنہا کر گئی۔ سونیا کی ساری آہیں اور کراہیں اور دعائیں گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی خدا سے کی گئیں درخواستیں، فرش پر پیشانی ٹیکتی منتیں، سماجتیں سب دھواں کی مانند اُٹھتی ہوئی کمرے کی فضا میں کھو گئیں۔ گہری خامشی نے کمرے کے ماحول کو اُداسی کی کثیف فضا میں بدل دیا۔ سونیا اور بھائی پاپا کے گلے جا لگے۔ ماں کے آخری سانسوں کی خراشیں ان کی آنکھون میں چبھتی ہوئی ان کے رخساروں پر گیلی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

پادری صاحب نے ہمیں تسلی دینے کے لئے کہا کہ خدا ہمیں زندگی دیتا ہے اور اپنے وقت پر واپس بلا لیتا ہے۔ ہمارا جسم خاک ہے اور زندگی کے دم کے نکل جانے کے بعد پھر خاک ہو جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ اس مقام پر آ کر ہم سب بے بس ہو جاتے ہیں اور صرف خدا کی مرض پوری ہوتی ہے۔ خدا کو پسند آیا تو اُس نے ہماری عزیزہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ اب آپ صبر کریں اور بچوں کو سنبھالیں۔ پادری صاحب نے پاپا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ انسانی جسم کی کمزوریاں اور زندگی کی مجبوریاں ساری عمر ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ انسان کے فانی ہونے اور کائنات میں کسی فرد کی وقتی موجودگی اور دائمی عدم موجودگی کی حقیقت سے خدا ہمیں کیا سکھانا چاہتا ہے۔ جبکہ اُس نے پانی اور مٹی اور آگ اور ہوا کو آپس میں ایسے جوڑا کہ انسانی وجود مکمل ہوا اور اُسے خود مختاری کا اختیار دے دیا۔ دماغ میں خواہش گناہ کی رکھ دی اور عقل کو نیکی کی راہ پر چلنے کی ہدایت کر دی۔ خواہش کی طرف رجحان اور نیکی کی طرف ہدایت۔ اور خود مختاری کا اختیار۔ یہ سب کسی عظیم کیمیا دان کا ہی کارنامہ ہے۔ دنیا کا کوئی انسان آج تک اس اختیار کی وضاحت نہیں کر سکا مگر ہمیشہ سے اس دنیا کے اسرار جاننے کے لئے متحرک رہا ہے۔ اور ان سب چیزوں مین سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز

موت ہے۔ جس کو ہم آج تک جان نہیں سکے۔ اس لئے اس کو حقیقت مانتے ہوئے ہمیں ہر حال میں اُس کی رضا میں خوش رہنا چاہیے۔ خدا ہمیں صبر اور تسلی عطا کرے۔ اور ہمیں اُن کے آخری سفر کی تیاری کرنی چاہیے۔ اب میں چلتا ہوں بعد میں پھر آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

دروازے پر دستک کی آواز نے سونیا کے گرد ماں کی یادوں کے حصار میں شگاف ڈال دیا تو سونیا دروازہ کھولنے کے لئے کمرے سے نکلی اور دروازہ کھولا تو پاپا اندر آئے۔ اُنہوں نے سر سے پاؤں تک سونیا کو ایک نظر غور سے دیکھا تو وہ ڈر گئی۔ اُسے لگا جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ کیونکہ اُس نے آج پہلی بار پاپا کی غیر موجودگی میں ناصر کو گھر بُلایا تھا تا کہ بدلی ہوئی صورت حال کا تجزیہ کر کے اپنی آئندہ کی زندگی کا پروگرام بنا سکیں۔ دراصل پاپا کو ناصر سے ملاقاتوں کا پتہ چل جانے کے بعد اُنہوں نے سونیا کی سخت نگرانی شروع کر دی تھی۔ وہ حیران تھی کہ پاپا کو پتہ کیسے چلا؟ اب ماں کو فوت ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں اور بھائی گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ پاپا ملازمت سے ریٹائیر ہو چکے ہیں۔

صرف پینشن کی قلیل سی رقم گھر چلانے کے لئے ناکافی تھی۔ اور پھر پاپا کا پینے پلانے کا الگ خرچہ تھا۔ پاپا نے کئی جگہوں پر کام کے لئے کوشش کی مگر ان کو کوئی کام نہ ملا جس کی وجہ سے وہ پریشان بھی رہتے اور اُن کی طبیعت میں چڑ چڑے پن کا غبار گہرا ہو چکا تھا۔ بار بار مانگنے پر بھائی کبھی کبھار ان کی مالی مدد کر دیتے تھے۔ گھر میں مالی پریشانیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ان مشکل حالات میں اگر کبھی کبھی کوئی رشتہ دار مہمان آ جاتا اور کھانے میں گوشت یا سبزی کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی تو پاپا مہمانوں کے سامنے ہی آسمان سر پر اُٹھا لیتے، وہ شرمندہ ہوتی۔ اس طرح اپنی بے عزتی پر آنسو اُس کی آنکھوں کے دائروں سے اُچھل کر باہر آ جاتے۔ اور رخساروں کے میدان میں اِدھر اُدھر گھومتے رہتے۔ مگر اس کو تسلی دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس مشکل صورت حال میں بھی وہ گھر کی رونق کو آباد رکھے ہوئے تھی۔ سونیا جب بھی گھر کے اخراجات کے لئے پاپا سے پیسے مانگتی تو وہ ناراض ہو جاتے اور گھر کا خرچہ دینے کی بجائے کہتے کہ تمیں گھر چلانے کا سلیقہ نہیں آتا۔ پیسے بے دردی سے خرچ کر دیتی ہو۔ خود پیسے کماؤ تو تمہیں پتہ چلے کہ پیسے کتنی محنت سے کمائے جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ یہ بات یکسر بھول جاتے کہ میں خود بھی تھوڑا بہت کماتی ہوں۔ گھر کے مالی مسائل جب بہت بگڑ گئے تو سونیا نے اپنی پڑوسن سے بات کی کہ اُسے کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ گھر کے مالی وسائل میں اضافہ ہو۔ اُس کی پڑوسن نے بتایا کہ یہاں سے دوسری گلی میں ایک تاجر رہتا ہے۔ دونوں بزرگ میاں بیوی ہیں اور ان کے پاس ان کے دو پوتے ہیں جن کی دیکھ بھال کے لئے اُنہیں ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ دوسرے دن جب سونیا ملازمت کے لئے تاجر کے گھر گئی تو تاجر کی بیوی نے بتایا کہ اُس کا بیٹا اور بہو ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ اب اُن کے بچے ہماری ذمہ داری ہیں۔ دونوں بچے سکول جاتے ہیں۔ ان کی نگہداشت اور ان کے ہر کام کی ذمہ داری تمہاری ہو گی۔ گھر کے باقی تمام کاموں کے لئے دوسری خادمہ موجود ہے۔ اور غور سے سنو ہر انسان کو دوسرے انسانون کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کسی نہ کسی سطح پر ہم سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔۔ اسی لئے ہم سب ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ اگر بچے تم سے خوش رہے تو مجھے بھی تمہاری مدد کرنے میں خوشی محسوس ہو گی۔ سونیا نے جب پاپا کو بتایا کہ وہ سامنے والی گلی میں تاجر کے گھر کام کرنے لگی ہے۔ یہ سُن کر پہلے تو وہ ناراض ہوئے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔ سونیا نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام سنبھال لیا۔ وہ صبح صبح آتی، بچوں کو تیار کرتی، ناشتہ کرواتی، لنچ بکس ساتھ دیتی اور ان کو سکول بس پر سوار کرواتی اور پھر واپس آ کر کچھ وقت مالکن کے ساتھ گزارتی۔ سکول سے واپسی پر بچوں کو کھانا دیتی، آرام کرواتی، ہوم ورک کرواتی پھر اگلے دن کے لئے یونیفارم تیار کرتی۔ یوں وقت تیزی سے گزرنے لگا۔

پھر ایک دن سونیا اپنے کام میں مصروف تھی کہ ایک ہنس مکھ جوان لڑکا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ دوسری خادمہ کا بھتیجا تھا جو اکثر اپنی پھوپھو سے ملنے آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا نام ناصر ہے اور وہ ایک کمپنی میں کام کرتا ہے۔ کام کے سلسلے میں اُس کا دوسروں شہروں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناصر کو دیکھ کر سونیا کے دل میں زندگی کے مثبت پہلوؤں کا خیال آیا۔ ناصر سے ملاقات والی صورت حال اتنی انوکھی اور پُر کیف تھی کہ ناصر نے اُس کی زندگی میں وہ دریچہ کھول دیا۔ جہان سے اُس نے پہلی بار پھول اور تتلیاں دیکھی تھیں۔ نئے خواب، محبت اور خوش دلی کی محفلیں۔ سونیا کی سوچ اور انداز بدلنے لگے۔ ناصر کا آنا جانا بڑھنے لگا تو مالکن نے سونیا کو سمجھایا کہ سوچ سمجھ کر آگے بڑھے۔ آج کل کے لڑکے بہت تیز ہیں۔ اُس کے پاپا نے بھی سونیا کے انداز اور اعتماد میں آنے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور پھر ایک دن انہوں نے ناصر کو گیٹ پر سونیا سے باتیں کرتے دیکھ لیا اور اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ ایک دن سونیا کام ختم کر کے گھر پہنچی تو پاپا کو اپنا انتظار کرتے پایا۔

سونیا۔ میں تو تمہیں سمجھدار لڑکی سمجھتا تھا لیکن۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟

کچھ بھی نہیں۔ یہ کہ۔ کچھ بھی نہیں پاپا۔ سونیا گھبرا گئی۔

کیا کچھ نہیں۔ وہ لڑکا کون ہے؟ پاپا نے سخت لہجے میں پوچھا۔ تم اُس سے ملنا چھوڑ دو۔

دیکھو۔ جب مناسب وقت آئے گا تو میں خود تمہاری شادی کسی کام کے لڑکے سے کروا دوں گا۔ تم اُس سے دور رہو۔ پاپا نے تند لہجے میں حکم سُنا دیا۔ اور سونیا خاموشی سے سنتی رہی۔

تو پھر۔ پاپا کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔ میں یہ معاملہ ختم سمجھوں۔ سونیا خاموش رہی اور سر جھکا کر آنکھوں کی جھیل میں اچھلنے والے آنسوؤں کے قطروں کو جھیل کے کناروں کے اندر رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اچھا۔ چلو ایک کپ چائے بنا کر لاؤ۔ تم سب نے دماغ خراب کر دیا ہے۔ شاید اس وقت پاپا زیادہ سختی دکھا کر گھر کے ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سونیا بالغ لڑکی ہے۔ خود کماتی ہے کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہے۔

اگر بغاوت پر اُتر آئی اور اُس کے ساتھ چلی گئی تو میں کیا کروں گا۔ سونیا کے بغیر تو یہ گھر بکھر جائے گا۔ یہ سوچ کر وقتی طور پر وہ خاموش تو ہو گئے مگر سونیا کے گھر چھوڑنے کے اندیشے کا تیر ان کے دل میں پیوست ہو گیا۔ پاپا کے روز بروز بدلتے رویے کو سونیا نے شدت سے محسوس کیا۔ وہ ہر وقت مشکوک نظروں سے اس کی نگرانی کرتے رہتے۔ سونیا کو اگرچہ گھر میں کئی سہولتیں میسر تھیں۔ سر پر اپنے گھر کی چھت، باپ کا آسرا اور خاندانی تحفظ۔ ان سب کے باوجود وہ گھر سے بیزار ہونے لگی۔ وہ سوچتی تھی کہ اب میں چوبیس سال کی ہو چکی ہوں۔ میرا اپنا گھر ہونا چاہیے۔ بھائی گھر سے جا چکا ہے اور پاپا ہر وقت مجھ پر شک کرتے رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں گھر کی دیکھ بھال کرتی رہوں اور اُن کو سنبھالتی رہوں۔ میری حیثیت تو ایک خادمہ کی سی ہے۔ پاپا نے تو میری ماں کی زندگی میں بھی اُنہیں کوئی بڑی خوشی عطا نہیں کی تھی۔ ماں کی عمر بھر کی قربانی اور اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹنے کا کیا صلہ ملا تھا۔ سوائے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وقفوں میں مرنے کے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے تو میں بھی ماں کی طرح وقفوں وقفوں میں مرتی رہوں گی۔ کیا یوں ہی کڑھتے رہنا میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ ہر وقت کام کرتے رہو اور وقفوں میں مرتے رہو۔ ان حالات میں مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ کیوں نہ وہ شادی کرے اپنا گھر بنائے اور اُسے قائم رکھے۔ سونیا سوچتی کہ اُس کے لئے اپنے نئے گھر کے حالات بہت مختلف ہوں گے۔ ناصر کے ساتھ نئے شہر میں نئی شادی شدہ زندگی۔ مسز سونیا ناصر۔ ایک معزز گھریلو خاتون۔ یہ سوچ کر وہ زیرِ لب مسکرا دیتی۔ سونیا زندگی کے گزرے ہوئے تلخ دنوں کی یادوں کو ذہن سے نکال کر آنے والے دنوں کی روشن صبحوں کے بارے میں خواب دیکھتی اور خوش ہو لیتی۔ پاپا کی سختی کے باوجود سونیا نے ناصر کو گھر سے باہر ملنا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک دن پاپا نے ان کو تفریح گاہ میں گھومتے دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے ان دونوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور اُونچی آواز میں بولنے لگے۔ سونیا میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اس لڑکے سے نہ ملا کرو۔ اور تم وعدہ کر کے بھی باز نہیں آئی ہو۔ چلو گھر چلو۔ اور پھر سونیا کا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرنے لگے۔ وہ پاپا کی طبعیت سے واقف تھی اس لئے تماشہ بننے کی بجائے خاموشی سے ساتھ چلنے لگی۔

انکل آپ میری بات تو سُنیں۔ ناصر نے کچھ کہنا چاہا مگر پاپا نے اُسے سختی سے جھڑک دیا اور سونیا کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ سونیا نے کئی بار مڑ کر ناصر کی طرف دیکھا مگر ناصر کچھ بھی نہ کر سکا۔ تھک کر ایک بینچ پر بیٹھ کر سونیا کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ سوچنے لگا کہ سونیا کتنی مجبور تھی۔ اور میں کس رشتے سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روکتا۔

میں آج کل کے لڑکوں کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ گھر پہنچ کر پاپا سونیا کو سمجھانے لگے، یہ آوارہ لڑکے بھولی بھالی لڑکیوں کو سبز باغ دکھاتے ہیں اور محبت کے جھوٹے جال میں پھانس لیتے ہیں۔ چند دن دل بہلاتے ہیں ان کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور جب دل بھر جائے تو لڑکی کو روتے دھوتے چھوڑ کر کسی نئے شکار کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ مگر پاپا۔ ناصر ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ سونیا نے شادی کے خیال کا تیر پاپا کی سماعت کی دیوار کی طرف چھوڑ دیا۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ وہ بد بخت تمہاری زندگی خراب کر دے گا۔ لیکن پاپا۔ سونیا نے کچھ کہنا چاہا تو پاپا نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

تم اس سے کبھی نہیں ملو گی۔ سن رہی ہوناں۔ اگر تم، نے اُسے دوبارہ ملنے کی کوشش کی تو تمہیں گولی مار دوں گا۔ پاپا یکدم آپے سے باہر ہو گئے۔ سونیا پاپا کا غصہ دیکھ کر سہم گئی۔ تم گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔ میں ابھی ایرک کو بلاتا ہوں۔ میں اُس سے تمہاری شادی کر دوں گا اور وہ گھر داماد بن کر رہے گا۔ پاپا نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا جو سونیا پر ایک بم کی طرح گرا۔ وہ روتی ہوئی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سونیا ایرک کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ پاپا کا نالائق بھانجا ہے جو روزانہ کی بنیاد پر مزدوری کرتا ہے وہ جب بھی گھر آتا تو سونیا اُس سے دور دور ہی رہتی اور آج وہ ایک خوفناک خواب بن کر اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا ہے۔ وہ بستر پر لیٹی روتی رہی۔ سوچتی رہی۔ اور پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر نا جانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ صبح اُٹھ کر تیار ہونے لگی تو پاپا نے پوچھا کہ تیار کیوں ہو رہی ہو۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں مالکن کو بتا آؤں کہ میں اب نوکری نہیں کر سکتی تا کہ وہ اپنا انتظام کر سکیں اور پھر ان دنوں کی تنخواہ کا بھی حساب کرنا ہے۔ سونیا نے جوتی پہنتے ہوئے جواب دیا۔ پاپا چند لمحے خاموش رہے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ سونیا خاموش رہی۔

سونیا گھر سے نکلی تو پاپا بھی پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ راستے میں پاپا نے بتایا کہ آج وہ اپنی بہن کے طرف جائیں گے۔ سونیا سمجھ گئی کہ پاپا نے ایرک والی بات صرف غصے کی حالت مین نہیں کی بلکہ یہ ان کا حتمی فیصلہ ہے اور وہ اس پر جلد عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ مالکن کے گھر پہنچ کر سونیا اندر چلی گئی تو پاپا واپس چلے گئے۔ سونیا نے مالکن کو کل کے تمام واقعات بتائے اور یہ بھی کہ پاپا اسی ہفتے اس کی شادی ایرک سے کر دیں گے۔ جبکہ وہ ناصر سے محبت کرتی ہے اور صرف اُسی سے شادی کرے گی۔ اس لئے میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مالکن نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے سوچ سمجھ کر کرے اور سونیا کی اچھی خاصی مالی مدد بھی کر دی۔ سونیا نے ناصر کو فون کر کے دوپہر کو ملنے کے لئے گھر بلایا تا کہ آئیندہ کا پروگرام بنا سکیں۔

اُداسی کی چادر اوڑھے سونیا گھر پہنچی تو پاپا پھوپھو کے گھر جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ پاپا گھر سے نکلے تو سونیا نے گھر کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور تمام چیزوں کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ یہ گھر۔ یہ چیزیں۔ وہ ان چیزوں کو جھاڑتے پونچھتے جوان ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لٹکی ہوئی ماں کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ماں تم نے ساری عمر اس گھر کو جوڑے رکھا۔ تکلیفیں برداشت کیں۔ مشکل وقت گزارہ مگر کبھی بھی وہ فیصلہ نہ کر سکی جو مجھے کرنا پڑ رہا ہے۔ ماں میں شرمندہ ہوں کہ تجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کر سکی۔ اُس کے سامنے پاپا کا چہرہ بھی آیا جو تیزی سے بوڑھے ہو رہے تھے مگر ساتھ ہی ان کے کل کے رویے اور فیصلے نے سونیا کے دماغ میں بغاوت کی آگ لگا دی تھی۔ وہ

دیر تک گھر کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی رہی اور ان سے وابستہ اپنی یادوں پر سے وقت کی گرد کے ذرے جھاڑتی رہی اور اُسے اپنی مرحوم ماں سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد آیا کہ اُس کے بعد وہ ہر حالت میں اس گھر کو بکھرنے سے بچائے گی۔ یہ وعدہ اُس کو اندر سے کمزور کرنے لگا تو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ ناصر کے آنے مین ابھی دیر تھی۔ اُس نے مضبوط دل سے پاپا کے نام خط لکھا جس میں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ سونیا نے یہ خط اپنے تکیے کے نیچے رکھا اور تیزی سے بیگ میں اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگی۔ خط لکھنے کے بعد اُس کے دل کا بوجھ اُتر چکا تھا۔ اُسے اپنی خوشی کا احساس ہونے لگا۔ نامعلوم اندیشوں کا خوف ضرور تھا مگر پچھتاوے کا بالکل احساس نہ ہوا۔ اُسے ہر حال میں اس ماحول سے نجات حاصل کرنی تھی۔ اپنی خوشیوں کے لئے آزاد ہونا تھا۔ ناصر اُسے سنبھال لے گا۔ خوشی سے زندہ رہنا اُس کا بھی حق ہے۔ اُس نے بیگ سمیٹ کر ایک طرف رکھا۔ گھڑی پر وقت دیکھا۔ ناصر کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھنے لگی اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا۔ دروازے پر دستک کی آواز سُن کر سونیا تیزی سے دروازے کی طرف گئی اور ناصر کے اندر داخل ہوتے ہے اُس کے گلے لگ گئی۔ اُسے اپنی خوشی۔ اپنی آزادی صرف ناصر کی بانہوں میں نظر آ رہی تھی۔ اُسے ہر حال میں اس ماحول سے نکلنا تھا۔ اس گھر کی گھٹن سے نکلنا تھا۔ اُنہوں نے جلدی جلدی اپنے پروگرام کو حتمی شکل دی۔ ناصر نے سونیا کو ضروری باتیں سمجھا دیں۔ اُن کو یہ بھی فکر تھی کہ کہیں پاپا جلدی گھر واپس نہ آ جائیں۔ پاپا اگر ان دونون کو اس وقت گھر میں اکیلے دیکھ لیں تو غیرت کے نام پر جان سے ہی مار دیں۔ ناصر یہ سوچ کر ایک لمحے کے لئے خوفزدہ ہوا پھر سنبھل کر بولا۔ سونیا اب مجھے چلنا چاہیے۔ کل وقت مقررہ پر ہماری ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہوگی۔ فکر نہ کرنا میں باقی سب انتظامات کرلوں گا۔ ناصر بہت محتاط تھا اسی لئے گھڑی کی طرف دیکھ کر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سونیا نے اُسے گلے مل کر الوداع کہا۔ وہ باہر نکلا تو سونیا خود کھڑکی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

اگلے دن کی صبح سونیا کی زندگی میں تبدیلی کی صبح تھی۔ اس گھر کی گھٹن سے نجات اور پاپا کی غصیلی نظروں سے آزادی کی صبح۔ وہ سب یادوں کی پرچھائیوں کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئی منزل کے خواب کی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اُس نے بڑے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ پاپا کو چائے دی۔ وہ اپنی ساری فکروں اور اضطراب کو دل میں چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی کسی حرکت یا کام سے پاپا کو شک ہو جائے۔۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح پاپا کو کچھ دیر کے لئے باہر بھیجے۔ اور جب اُس کے گھر سے نکلنے کا وقت ہو گیا تو اُس نے ضد کر کے پاپا کو دوپہر کے کھانے کا سامان لانے کے لئے بازار بھیج دیا۔ اور خود اُن کے نام کا لکھا ہوا خط ان کے کمرے میں رکھ کر اپنا بیگ اُٹھایا اور تیزی سے سنسان گلی میں پہنچ گئی۔ جہاں ناصر نے ایک ٹیکسی کا انتظام کیا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اُس ٹیکسی میں سوار ہو گئی اور گھر کے دروازے کو حسرت سے دیکھا۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت رش تھا۔ اس ہنگامہ خیز ہجوم میں اس کا وجود قطعی غیر نمایاں اور فضا میں ایک ذرے کی مانند تھا۔ وہ پلیٹ فار پر پہنچ کر ایک بینچ پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر ناصر کو دیکھنے لگی۔ ٹرین کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ٹرین کے انتظار میں بیٹھے کئی لوگ پٹڑی کے قریب جا کر دیکھتے مگر ٹرین نظر نہ آنے پر مایوسی کا ہار گلے میں پہنے واپس اپنے بینچ پر آ کر بیٹھ جاتے۔ ناصر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اچانک سونیا کے دماغ میں اس خیال کا دھماکہ ہوا کہ اگر ناصر نہ آیا تو میں کیا کروں گی۔ یہ سوچ کر وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ پھر سنبھل گئی تو اس کی نظریں لوگوں کے ہجوم میں ناصر کو تلاش کرنے لگیں۔ سونیا کو اپنے اندر ایک قدیم اور مضبوط گھر ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اُس کے دماغ میں سوچوں کا ہنگامہ برپا تھا۔ ماں سے کیا ہوا وعدہ۔ بھائی کی محبت۔ پاپا کا بوڑھا ہوتا ہوا چہرہ اور گھر میں تنہا وقفوں میں مرتا ہوا آدمی۔ گھر کے صحن میں اُس کی بچپن کی کھیلتی ہوئی یادیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ ماں کی روح گھر کی دھلیز پر کھڑی اُسے واپس بلا رہی ہیں۔ تب اُس نے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ کر خدا سے دعا کی کہ خدا اُسے ہمت دے اور سیدھا راستہ دکھائے۔ دعا مانگنے کے بعد بھی اُس کے ہونٹ دیر تک لرزتے رہے۔ اچانک فضا میں ٹرین کی لمبی سیٹی نے پلیٹ فارم پر زندگی کی پرسکون بساط الٹا دی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے ناصر ہاتھ میں دو ٹکٹ لیے کھڑا تھا۔ سب لوگ تیزی سے اپنا اپنا سامان اُٹھائے ٹرین کی طرف بڑھنے لگے۔ یکدم شدید شور شرابہ شروع ہو گیا۔ ناصر نے سونیا کا بیگ اُٹھایا اور کہا۔ اُٹھو سونیا۔ جلدی کرو۔ ٹرین زیادہ دیر نہیں رُکے گی۔

سونیا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ٹرین سامنے کھڑی تھی۔ سونیا کے ذہن میں ایک خیال نے تیزی سے جنم لیا۔ یہ ٹرین کہاں سے آئی ہے؟ مجھے نہیں معلوم یہ کہاں جائے گی۔ اس کی منزل کون سی ہے؟ یہ تو ہر شہر کے پلیٹ فارم پر رُکتی ہے، لوگ اُترتے ہیں۔ نئے مسافر سوار ہوتے ہیں اور یہ نئے شہر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ کئی لوگ ٹرین بدلنے کے لئے دوسرے پلیٹ فارم کی طرف چل دیتے ہیں۔ یہ ٹرین مسافروں کو متحرک رکھتی ہے۔ بالکل زندگی کی ٹرین کی طرح۔ مجھے نہیں معلوم میں اس گھر میں کیسے آئی؟ کیوں آئی؟ زندگی کی ٹرین میں سوار اس گھر سے غائب ہو جاؤں گی۔ نامعلوم ہواؤں میں گم ہو جاؤں گی۔ اور ناصر اسی طرح کسی دوسری ٹرین میں سوار ہو جائے گا۔ سونیا گہری سوچوں میں گم ہو گئی۔ تب ناصر نے اُس کو بازو سے پکڑا اور بینچ سے اُٹھانے کی کوشش کی۔ آؤ سونیا۔ اُٹھو جلدی کرو۔ ورنہ ٹرین چھوٹ جائے گی۔ ناصر نے پریشانی سے کہا۔

نہیں۔ سونیا زور سے چلائی اور دوسرے ہاتھ سے بینچ کو پکڑ لیا۔ میں نہیں جا سکتی۔ یہ ناممکن ہے۔ میری کوئی منزل نہیں۔ میں ہواؤں میں گم ہو جاؤں گی۔ سونیا نے پورے اعتماد سے اُسے جواب دیا۔ ناصر اُس کی منتیں کرنے لگا۔ سونیا میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ ہم بہت خوش رہیں گے۔ سونیا۔ پلیز۔ آ جاؤ۔ یہ تمہارے لئے خوشی کا آخری موقع ہے۔ ناصر نے زبردستی بازو کھینچ کر اُٹھانے کی کوشش کی مگر سونیا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ دوسرے ہاتھ کی بینچ پر مضبوط گرفت کی سختی سے اُس کی انگلیوں کے جوڑ درد کرنے لگے۔ ٹرین نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔ ناصر کمپنی کا بہت سا سامان اس ٹرین میں اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ اس

لئے اُس ٹرین کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ناصر کی ساری منتیں اور درخواستیں سونیا کو راضی نہ کر سکیں۔ ناصر نے بائیں طرف دیکھا کہ سونیا کے پاپا بھاگتے ہوئے اُس کی طرف آ رہے ہیں۔ اور پھر ناصر مایوسی کی حالت میں بھاگ کر ٹرین پر سوار ہو گیا۔ سونیا ٹرین کو رفتہ رفتہ نظروں سے دور ہوتے دیکھتی رہی۔ اُس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ناصر کے لئے نہ کوئی الوداعی کیفیت تھی، نہ کوئی وابستگی تھی، نہ کوئی پہچان تھی اور نہ ہی افسوس کی کوئی جھلک۔ بیگ اُٹھانے کے لئے سونیا دائیں ہاتھ گھومی تو سامنے پاپا کو کھڑے دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔ میں نے کہا تھا ناں کہ آج کل کے لڑکے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے ناں۔ پاپا نے دور جاتی ٹرین کی طرف دیکھ کر کہا۔ سونیا خاموش رہی۔ چلو اب گھر چلیں۔ میں جلدی میں گھر اسی طرح کھلا چھوڑ آیا تھا۔ پاپا نے بیگ ہاتھ میں پکڑ لیا تو سونیا آگے بڑھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ اور پچھتاوے کے دو موٹے موٹے آنسو اُس کے رخساروں پر واضح لکیر بناتے ہوئے زمین میں جذب ہو گئے۔

مقدمہ

تقسیم ہند سے پہلے پنجاب کے دل لاہور سے ’’پرتاب‘‘ نام کا ایک اخبار نکلا کرتا تھا جو کہ پرتاب نام کے ایک ہندو کا تھا وہی اس کا مالک بھی تھا اور چیف ایڈیٹر بھی،

ایک دن پرتاب نے سرخی لگادی: تمام مسلمان کافر ہیں، لاہور میں تہلکہ مچ گیا، پرتاب کے دفتر کے باہر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا جو مرنے مارنے پر تیار تھا، نقصِ امن کے خطرے کے پیش نظر انگریز کمشنر نے پولیس طلب کر لی، مجمعے کو یقین دلایا گیا کہ انصاف ہوگا اور مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے گی، تمام مکاتب فکر کی مشترکہ کمیٹی کے پچاس آدمیوں کی مدعیت میں پرچا کٹوا دیا گیا۔ چالان پیش کیا گیا اور مجسٹریٹ نے جو کہ انگریز ہی تھا، پرتاب سے پوچھا یہ اخبار آپ کا ہے؟ جی میرا ہے!

اس میں جو خبر چھپی ہے کہ مسلمان سارے کافر ہیں اپ کے علم اور اجازت سے چھپی ہے؟

جی بالکل!

آپ اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں؟

یہ جرم ہے ہی نہیں تو میں اس کا اعتراف کیسے کر سکتا ہوں، مجھے تو خود مسلمانوں نے بتایا ہے جو میں نے چھاپ دیا ہے، صبح ہوتی ہے تو یہ لوگ سپیکر کھول کر شروع ہوتے ہیں کہ سامنے والی مسجد والے کافر ہیں، وہ ظہر کے بعد شروع ہوتے ہیں تو عشا تک ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ فلاں مسجد والے کافر ہیں اور اتنی قطعی دلیلیں دیتے ہیں کہ میں قائل ہو گیا کہ یہ واقعی کافر ہیں اور مجھے یقین ہے کہ عدالت بھی یقین کرنے پر مجبور ہو جائے گی بس اگلی تاریخ پر فلاں فلاں محلے کے فلاں فلاں مولوی صاحبان کو بھی بلا لیا جائے اور جن 50 آدمیوں کی مدعیت میں پرچا کاٹا گیا ہے انہیں بھی اگلی پیشی پہ بلا لیا جائے تو معاملہ ایک ہی تاریخ میں حل ہو جائے گا۔ اگلی پیشی پر تمام متعلقہ مولویوں کو جو کہ صبح شام دوسرے فرقے کے لوگوں کو مدلل طور پر کافر قرار دیتے تھے اور پرتاب نے جن کا نام دیا تھا، باری باری کٹہرے میں طلب کیا گیا۔ مجمع میں تمام افراد کو کہا گیا کہ دیوبندی، اہل حدیث اور بریلوی الگ الگ کھڑے ہوں!

بریلوی مولوی سے قرآن پر حلف لیا گیا، جس کے بعد پرتاب کے وکیل نے اس سے پوچھا کہ دیوبندوں اور اہل حدیثوں کے بارے میں وہ قرآن وسنت کی روشنی میں کیا کہے گا؟

مولوی نے کہا کہ یہ دونوں توہینِ رسالت کے مرتکب اور بدترین کافر ہیں, پھر اس نے دیوبندیوں اور اہلِ حدیثوں کے بزرگوں کے اقوال کا حوالہ دیا اور چند احادیث اور آیات سے ان کو کافر ثابت کر کے فارغ ہو گیا، جج نے پرتاب کے وکیل کے کہنے پر اہل حدیثوں اور دیوبندیوں سے کہا کہ وہ باہر تشریف لے جائیں!

اس کے بعد دیوبندی اور اہلِ حدیث مولویوں کو یکے بعد دیگرے حلف لے کر گواہی کے لئے کہا گیا، دونوں نے بریلویوں کو مشرک ثابت کیا اور پھر شرک کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا، پھر تینوں کو ایک ساتھ بلوایا اور کہا آپ تینوں کا شیعہ کے متعلق کیا خیال ہے؟

تینوں نے مشترکہ طور پر کہا جناب ہم تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ شیعہ ہماری نظر میں پکے کافر ہیں، پھر مجسٹریٹ نے سب کو عدالت سے باہر بھیج دیا،

اس کے بعد پرتاب کے وکیل نے کہا کہ مجسٹریٹ صاحب آپ نے خود سن لیا کہ یہ سب ایک دوسرے کو کافر سمجھتے اور ببانگ دھل کہتے بھی ہیں اور کافر ہو کر عدالت سے نکل بھی گئے ہیں' اب عدالت میں جو لوگ بچتے ہیں ان میں سے مدعیوں کے وکیل صاحب بھی ان تینوں فرقوں میں سے کسی ایک فرقے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں' لہذا یہ بھی کافروں میں سے ہی ہیں' باقی جو مسلمان بچا ہے اسے طلب کر لیجئے تا کہ کیس آگے چلے؟

مجسٹریٹ نے کیس خارج کر دیا اور پرتاب کو باعزت بری کر دیا اور پرتاب اخبار کو بھی دوبارہ بحال کر دیا۔

کاغذات

محمد علیم اسماعیل

(مہاراشٹر)

کتنے خوش حال تھے سبھی، لیکن اب ہر طرف ماتم ہی ماتم ہے۔ لوگوں کو گھروں سے گھسیٹ کر یہاں ڈال دیا گیا ہے۔ جہاں انسانوں کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ موبائل فون اور کیمرے پر پابندی، میڈیا والوں کو بھی یہاں آنے کی اجازت نہیں۔ بند دروازوں میں شنوائی ہوئی۔ فریاد سنے بغیر ہی فیصلہ ہوا اور قصوروار ٹھہرا دیا گیا۔ یہاں موجود سبھی لوگ بس خدا کے بھروسے زندہ ہیں، ویسے تو ان سبھی کے دل دنیا کی ہر شئے سے اچاٹ ہو گئے ہیں۔ یہاں حیرت انگیز اموات کا سلسلہ شروع ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی کی موت ہو جاتی ہے۔ رشتے داروں کو اطلاع دیے بغیر ہی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ کیا یہاں کے کھانے میں ایسا کچھ ملایا جا رہا ہے؟ جو یہاں رہنے والوں کو دھیرے دھیرے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔ ایک بڑے سے کمرے میں تقریباً پانچ سو لوگوں کو رکھا گیا ہے۔ زندگی جہنم سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ جسے موت آ گئی سمجھو اسے چھٹکارا مل گیا۔ یہ انتظامیہ بڑی ظالم ہے۔ یہ لوگ ہمیں بوجھ سمجھ رہے ہیں، ہم پر ہو رہے ذرا سے خرچ کو نقصان سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں موت سے پہلے ہی مار دینا چاہتے ہیں۔

ایک دن دوپہر کے وقت سپاہی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ باقی سپاہی کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اتفاق سے دروازہ بھی کھلا تھا۔ یہ میرے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ میں آہستہ آہستہ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ اور تیس، چالیس قدم چل کر گھاس میں چھپ گیا۔ گھاس کافی اونچی اور ہری بھری تھی۔ چاروں طرف، دور دور تک پھیلے ہرے بھرے جنگل میں، میں چھپ چھپ کر خراماں خراماں آگے بڑھتا رہا۔ دوپہر سے رات ہو گئی۔ میں بہت دور نکل آیا تھا۔ شاید اب سپاہی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے یا پھر انھیں ابھی تک کوئی خبر ہی نہ ہوئی ہو۔

میں اب تقریباً خطرے کے علاقے سے باہر تھا۔ گلا سوکھ رہا تھا، حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ دور ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ وہاں پانی دیکھ کر میں من ہی من خوش ہوا۔ میں قریب پہنچنے ہی والا تھا کہ وہاں دو سپاہی کھڑے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھ کر میں دور ہی رُک گیا۔ پیاس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو وہ جا چکے تھے۔ میں نے پیٹرول پمپ کے باہر موجود مٹکے سے پانی پیا اور سکون کی سانس لی۔ وہاں سے سیدھا پیدائش و موت کے اندراج کے شعبے میں گیا، لیکن کامیابی نہیں ملی۔ میں حیران و پریشان، نامعلوم راہوں پر چلتے چلتے نڈھال ہو گیا تھا۔ پرانے کاغذات حاصل کرنے کے لیے سرکاری آفسوں کے چکر کاٹتے کاٹتے بیزار ہو گیا تھا۔

ایک روز ایک ہوٹل پر، اُن سپاہیوں کی ایک گاڑی نظر آئی۔ جسے دیکھ کر میں ایک کھیت میں چھپ گیا۔ میں بہت تھک چکا تھا یا کمزور ہو گیا تھا۔ میں کافی وقت بیٹھا رہا۔ آنکھیں خود بہ خود بند ہونے لگیں، میں کھیت میں ہی لیٹ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ میں کافی وقت سوتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے دھواں چھٹنے لگا اور تین تصویریں ابھر کر سامنے آئیں۔ وہ بیوی بچوں کی تصویریں تھیں۔ جو میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بیوی کے چہرے پر ناامیدی اور بچوں کے چہروں پر معصومیت صاف نظر آ رہی تھی۔ پھر بیوی نے کہا:

”میں نے دیکھا، آپ چلے گئے۔ اچھا کیا آپ نے، لیکن دونوں بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔“

یہ سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوٹل کی طرف دیکھا۔ وہ سپاہی اپنی جیپ میں بیٹھے، چابی لگائی اور گاڑی گنگنانے لگی۔ وہ چلنے کے لیے تیار تھے۔ انھوں جیسے ہی اپنی نظریں اوپر اٹھائیں، سامنے میں کھڑا تھا۔ انھوں نے مجھے پکڑا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ چار پانچ سپاہیوں نے میرے پیروں پر خوب ڈنڈے برسائے۔ اب میرے لیے چلنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ پھر مجھے وہیں لا کر پٹخ دیا گیا جہاں سے میں بھاگا تھا۔

بیوی فرش پر پڑی تھی۔ اس کی نیم وا آنکھیں مسلسل مجھے دیکھ رہی تھیں۔ جب میں یہاں سے بھاگا تھا تب وہ چل پھر رہی تھی لیکن اب اٹھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی دھیرے دھیرے کمزور ہو رہی تھی۔ اس کے آس پاس دونوں لڑکے بیٹھے تھے۔ مار کی وجہ سے میرے پیر سوج گئے تھے اس لیے میں بیٹھے بیٹھے گھسٹتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں لڑکے دوڑ کر میرے پاس آئے اور سینے سے چمٹ گئے۔ جیسے ہی میں قریب پہنچا بیوی نے حسرت بھری نگاہیں مجھ پر ڈالیں، اور پوچھا:

”کاغذات لائے؟“

”میں پیدائش و موت اندراج آفس گیا تھا۔ پتا چلا کہ ابا کی پیدائش کے وقت کا ریکارڈ دستیاب نہیں۔ اس وقت کا ریکارڈ آگ لگنے سے جل گیا تھا۔ ابا جس اسکول میں پڑھے تھے، وہاں بھی کچھ نہیں ملا۔ اسکول والے کہتے ہیں، بہت سارا پرانا ریکارڈ سیلاب میں بہہ گیا تھا اور جو بچ گیا وہ اب پڑھا نہیں جا رہا ہے۔ کوتوال کے رجسٹر کی تو حالت بہت بری ہے۔ اس کے کاغذ خود بہ خود ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ کاغذات کے لیے میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن پچاس/ساٹھ سال پرانے کاغذات ملنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ جو کاغذات ہمارے پاس ہیں، ان میں درج ہمارے نام ایک دوسرے سے میچ نہیں ہو رہے ہیں۔“

میں نے پیروں کو سمیٹتے ہوئے پیٹ میں لے لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ لیا، پھر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے چھت کو گھورنے لگا۔

''میں نے سنا ہے عورتوں کے لیے الگ سے ایک سینٹر بنایا جا رہا ہے۔'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی، اور چہرے سے ایک انجانا سا خوف جھلک رہا تھا۔

''ہاں۔ بہت جلد وہ ہمیں الگ الگ کیمپوں میں رکھیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر بچے کس کے ساتھ رہیں گے؟''

''پتا نہیں۔''

میرے لڑکے نے ایک ساتھ کچھ سوال کیے:

''ہم اپنے گھر کب جائیں گے پاپا؟ پاپا یہ این آر سی کیا ہوتا ہے؟ اس میں ہمارا نام کیوں نہیں آیا؟''

''اب تجھے کیسے سمجھاؤں بیٹا، ابھی تو چھوٹا ہے، لیکن آج کل لوگ ایک اچھی مثال دے رہے ہیں، فرض کرو تم نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے ایک چوکیدار رکھا تھا۔ اب وہ چوکیدار تم سے یہ ثابت کرنے کہہ رہا ہے کہ تم ہی اس گھر کے مالک ہو۔ اور مالکانہ حق ثابت کرنے کے لیے پچاس سال پرانے کاغذات مانگ رہا ہے۔''

''کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟ یہاں رہا نہیں جاتا، دم گھٹتا ہے۔'' بیوی کے چہرے پر فکر کے بادل گھرے ہو گئے تھے اور آواز کسی گہرے کنویں سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔

''کہاں جائیں گے!!! ہم تو برسوں سے یہیں کے رہنے والے ہیں۔ پر اب یہ ثابت کرنے کے لیے ثبوت کہاں سے لائیں!!! یہاں انسانوں سے زیادہ اہمیت تو کاغذات کی ہو گئی ہے۔''

میرے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی، لیکن میں مجبور تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے تھوڑا جوش میں آ کر خاموش بیٹھ گیا۔

پھر میں سوچنے لگا، 1971 سے پہلے کی زمین کے کاغذات کہاں سے لاؤں؟ میرے باپ دادا تو غریب مزدور تھے۔ وہ جس جھونپڑپٹی میں رہتے تھے، وہ جگہ سرکاری تھی۔ میں نے جو زمین اپنی زندگی میں خریدی ہے اس کے کاغذات منظور نہیں کیے جا رہے ہیں، کیونکہ وہ 1971 کے بعد کے ہیں۔ عجیب قانون ہے حکومت کا!!! عوام کے ووٹوں سے اقتدار حاصل کیا۔ اب اسی سے کہتے ہیں، ثابت کرو کہ تم اسی ملک کے شہری ہو۔ ہماری شہریت چلی گئی، زندگی بھر کی محنت کا اثاثہ ضبط کر لیا گیا۔ کیا غریب ہونا کوئی گناہ ہے؟

''ہم کب اس حراستی کیمپ (Camp Detention) سے باہر نکلیں گے؟''

بیوی نے ناامیدی ظاہر کی۔ پھر اس کی سانسیں تیز ہوتی چلی گئیں اور آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔

- بقیہ -

خاکِ شفا

چرچ آف سردھنا کی تعمیر کا ذمہ اٹلی کے نامور آرکیٹیکٹ انتھونی ریگھلانی کو سونپا گیا۔ ریگھلانی نے کئی نامور بھارتی آرکیٹیکٹ کی ہمراہی میں اطالوی مجسمہ ساز ادموتا ڈولینی کے تراشے ہوئے قیمتی پتھر بحری جہازوں کے ذریعہ کلکتہ منگوائے جہاں سے یہ قیمتی پتھر ہاتھی، گھوڑوں، خچروں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں کے ذریعہ سردھنا منگا کر گیارہ سال کی طویل عرصہ میں چرچ آف سردھنا کی تعمیر مکمل کی۔

چرچ آف سردھنا کا طرزِ تعمیر سینٹ پیٹری سلکا آف روم سے مشابہت رکھتا ہے جو ہندوستان میں اپنی طرز کی واحد اور منفرد مسیحی عبادت گاہ ہے جس کی تعمیر پر اُس زمانے میں چار لاکھ روپے کی خطیر رقم خرچ کی گئی۔ یاد رہے اُس زمانے میں مزدور کی یومیہ اجرت چار آنہ ہوا کرتی تھی۔

گرجا گھر میں اکّا دکّا آدمی کے سوا کوئی دکھائی نہ دیتا تھا لہٰذا آگے کی منصوبہ بندی طے کرنے کا اس سے بہتر مقام اور وقت کیا ہو سکتا تھا۔

چھوٹے پیرزادے نے صاف لفظوں میں بتلا دیا تھا کہ پھوپھی کے علاوہ اُن کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے جس کے گھر وقت گزاری کے لیے جایا جا سکے۔ کافی وقت اس مغز پچی میں گزر گیا، کسی کے ذہن میں کوئی پناہ گاہ یا چھپنے کے لیے محفوظ مقام نہ آ رہا تھا۔ اسی اثناء میں یونیفارم میں ملبوس نوجوان لڑکیوں کی کھچا کھچ بھری روڈویز کی نیلی بس گرجا گھر کے گیٹ میں داخل ہوتی نظر آئی۔ تینوں لڑکے سب کچھ بھول کر بس کی جانب اشتیاق سے بڑھنے لگے۔

* * *

سوراخ

ولاء جمال العسیلی

(قاہرہ)

آج پھر سنیچر ہے۔۔ کتنا مشکل دن ہوتا ہے یہ۔ اس دن مجھے چھ بجے صبح کو جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ اپنے شوہر اور بچوں کے لئے ناشتہ تیار کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ لیسنز جانے کے لئے بچے کیا پہنیں، دوپہر کے کھانے میں کیا کھائیں، اور اسی طرح سے دن کے دوران درجنوں فیصلہ کرنے پڑتے ہیں۔ میں بھی اوروں کی طرح اپنے بچوں کے لئے بہت فکرمند رہتی ہوں، خاص طور پر جب وہ اس دن ٹیوشن کے لیے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔ دن بھر میرے دل ودماغ کو سکون نہیں ملتا، جب تک کہ میرے سب بچے گھر واپس نہیں آجاتے ہیں۔ پریشانی کے ساتھ ساتھ میرے کاندھے پر گھر کا پورا کام کاج سنبھالنے کا بوجھ دوگنا ہوجاتا ہے۔ اگر سچ کہوں تو سانس لینے کی فرصت نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے میرا مزاج بھی چڑچڑا ہوجاتا ہے۔

پانچ بجے شام کے وقت میں کپڑے تہہ کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں دستک سن کر دروازہ کھولنے کے لئے بھاگی۔ میری یہ عادت ہے کہ دروازہ کھولنے سے پہلے دوربینی سوراخ سے دروازے پر کھڑے ہوئے شخص کو دیکھتی ہوں، تاکہ جان سکوں کہ کون ہے۔ حسب معمول میں نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو میری منجھلی بیٹی دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر ایک مرد اور ایک کم سن لڑکی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے دروازے کھول کر اپنی بیٹی کو اندر داخل کیا اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ کھولتے وقت دونوں اجنبیوں نے جب مجھے دیکھا تو اس مرد نے لڑکی سے کہا کہ ’لگتا ہے غلطی ہوگئی ہے شاید، یہ وہ فلیٹ نہیں ہے جو ہم چاہتے تھے‘۔ پھر دونوں سیڑھیاں اترنے لگے۔

لڑکی خوبصورت تھی اور تقریباً پندرہ سولہ سال کی لگ رہی تھی۔ جبکہ مرد کی عمر تقریباً تیس پینتیس سال کی رہی ہوگی۔ پتہ نہیں کیوں مجھ میں تجسس پیدا ہوا، اس لئے میں نے پھر سے دوربینی سوراخ سے جھانکنا شروع کیا۔ اچانک ہی میں نے دونوں کو چپکے چپکے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اور چونکہ میرا فلیٹ عمارت کی آخری منزل پر ہے، اس لئے دونوں چھت پر چلے گئے۔ دوربینی سوراخ سے جھانکتے ہوئے میں انتظار کر رہی تھی کہ دونوں جلد ہی نیچے اتریں گے، کیونکہ اوپر کوئی اور فلیٹ نہیں تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس سے میرا تجسس اور خوف مزید بڑھ گیا۔ میں تقریباً دس پندرہ منٹ انتظار کرتی رہی، اس درمیان میں نے عمارت کے چوکیدار کو اور اس کے ساتھ چار لوگوں کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان لوگوں میں ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ایک بڑی سی چھڑی پکڑے ہوئے تھا۔ سب عمارت کی چھت کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت میں کافی پریشان تھی، میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے!!۔

میری آنکھیں اب بھی دروازے کے دوربینی سوراخ سے لگی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی میری آنکھیں نہیں جھپکیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی انہونی نہ ہو جائے اور میں اس سے ناواقف رہوں، خاص طور پر اس لئے کیونکہ میری بڑی بیٹی ابھی تک گھر سے باہر تھی۔ اور اس کے آنے کے دوران کہیں عمارت کی سیڑھیوں پر کوئی حادثہ نہ ہوجائے، یا کچھ ہو نہ جائے اور کہیں وہ لوگ مجھ پر اور میرے بچوں پر حملہ نہ کر دیں اور کہیں دروازہ نہ توڑ دیں۔ میں اسی سوچ میں الجھی ہوئی تھی کہ اچانک میں نے عمارت کے چوکیدار کو سیڑھیاں اترتے اور چیختے ہوئے سنا: “اے حرام زادے! مجھے تم دونوں پر پہلے ہی شک ہوا تھا جب میں نے تم دونوں کو دیکھا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے عمارت کی طرف جا رہے ہو۔ ان دنوں ہر جگہ پر آوارہ نوجوانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ روز تم جیسوں کو دیکھتا ہوں، اے کمینے! تم دونوں کو عمارت کی چھت کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ملی، کہ تم اپنی جنسی ہوس کی آگ بجھا سکو!! بدمعاش!!”۔

چوکیدار کی بات سن کر میں اپنا توازن کھونے لگی۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے ہونٹ خشک ہوگئے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں! صرف یہ جملہ دہرانے لگی: ’رحم کر میرے رب۔۔۔‘

میں دروازے کے دوربینی سوراخ سے سارا منظر دیکھ رہی تھی، ایک مرد لڑکی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا اور لوگ ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے لڑکی کا دوسرا ہاتھ پکڑ کے اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ لڑکی درد سے کراہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی کوششوں کے بعد وہ لوگ لڑکی کو اس سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان میں سے کسی نے لڑکی سے کہا: “اپنے گھر جاؤ! یہاں سے بھاگ جاؤ!”

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ بلکہ وہ کہہ رہی تھی کہ “اسے بھی چھوڑ دیں، میں اس کے ساتھ کسی اور جگہ پر نہیں جاؤں گی، قسم سے سیدھے اپنے گھر جاؤں گی” لیکن لوگوں نے اس کی بات نہ سنی، بلکہ اسے نیچے جانے کے لئے دھکا دیتے رہے۔ لڑکی نے کئی بار ان لوگوں سے التجا کی، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخرکار وہ نیچے اتر گئی۔

لڑکی کے جانے کے بعد لوگوں نے اس مرد کی جم کر پٹائی کی، خوب مارا۔ پھر اسے اپنے ساتھ لے کر نیچے چلے گئے۔ میں بھاگ کر جلدی سے بالکونی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا کہ سڑک پر چوکیدار لڑکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے قریب لا رہا تھا لیکن لڑکی نے اس کو جھٹک دیا اور ایک رکشہ پر سوار ہوکر چلی گئی۔ اس منظر کو دیکھ کر میں کافی الجھن میں آ گئی۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی!!!

تھوڑی دیر بعد، باقی لوگ سڑک پر نمودار ہوگئے اور وہ پٹائی کرنے کے بعد مرد کو ایک گاڑی میں بٹھا کر لے گئے، سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں گئے؟! مجھے محسوس

ہوا کہ شاید قریبی پولیس اسٹیشن لے جائیں گے!!

میں پورے منظر کو دیکھ کر کافی پریشان ہوئی اور اس بارے میں سوچنے کی مزید ہمت نہیں کر سکی۔ اس واقعہ کے بعد میرے ذہن میں کئی سوال الجھن پیدا کر رہے تھے۔ کیوں اس مرد نے لڑکی کا ہاتھ اس قدر مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا!! کیا وہ آدمی واقعی اس لڑکی سے پیار کرتا تھا!! اسے اس کی فکر تھی!! یا وہ چاہتا تھا کہ لڑکی اس کے ساتھ رہے، تا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے بچائے، خاص طور پر لڑکی کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی دیکھنے کے بعد!!۔

گھر کے کام کاج میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ، آج کل کے ناجائز جنسی تعلقات کی اصل وجہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا یہ موبائل کی وجہ سے ہوتا ہے! جو اس دور میں ہم سب کے پاس دستیاب ہے اور یہ ہماری بدقسمتی اور پریشانیاں لے کر آیا ہے۔ رات ڈھلتے ہی عورت اور مرد میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں تک ملاقات کی جگہ اور وقت کا تعلق ہے.. تو ان کی پسندیدہ جگہ ریستوراں اور کیفے ہوتے ہیں، جہاں وہ اپنی ملاقات کی خواہش پوری کر لیں اور اپنی ہوس کی آگ کو کچھ پل کے لیے بجھا دیں۔ اور اس طرح وہ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خدا ان کو دیکھ رہا ہے، گویا وہ خدا کی موجودگی کو محسوس نہیں کرتے!!!

رات ڈھل چکی۔۔ اوہ کتنا مشکل دن تھا!! تھکاوٹ کی وجہ سے سنیچر کو حسب معمول سب سو گئے۔ اور میں نے اپنا تھکا ہوا جسم بستر پر پھینک دیا، اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر مجھے نیند نہیں آئی، میری آنکھ کافی دیر تک کھلی رہی۔ آج جو کچھ ہوا اس سے مجھے رات کو خوفناک بھوتوں اور ڈراؤنے خوابوں میں بدل دیا ہے، جس سے میں اپنی آنکھیں بند کرنا شروع کر دی تو مجھے گھیر لیتے ہیں۔

آج کے واقعہ نے میرا ذہنی سکون چھین لیا۔ میرے ذہن میں یہ سوالات اٹھ رہے تھے کہ کیوں لوگوں نے صرف اس مرد کو سزا دی۔ شاید اس لئے کہ وہ عمر دراز تھا اور لڑکی سے بڑا لگ رہا تھا!!! اس مرد کے پاس لڑکیوں کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟!۔ کیا وہ ان مردوں کی طرح انہیں اپنی میٹھی میٹھی باتوں اور جھوٹے وعدوں سے دھوکہ دیتا ہے اور اگر اسے اپنی مرضی کی چیز مل جائے تو وہ دوسری لڑکی کی تلاش میں لگ جاتا ہے اور اس طرح وہ مذہب اور حیا سے باز نہیں آتا۔ وہ ایک وحشی درندے کی مانند ہے، جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے اپنے شکار کی تلاش میں صحرا میں بھٹکتا رہتا ہے؟ اس کے ایک اشارے اور دھوکے میں لڑکی اس کے جال میں آجاتی ہے اور وہ اپنا فون نمبر اس لڑکی کی طرف پھینک دیتا ہے، وہ اسے کال کرتا ہے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار کرتا ہے۔ اپنی میٹھی باتیں سنانے لگتا ہے، جن سے لڑکی محبت اور جذبے کی دنیا میں تیرنے لگتی ہے۔ وہ اپنے فریب سے لڑکی کے دل پر قبضہ کر لیتا ہے، یہ کہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے چھوڑ نہیں سکے گا، کیونکہ وہ اس کے لیے ہوا کی طرح ہے، اگر وہ اس سے جدا ہو جائے، وہ مر جائے گا!! اور چونکہ لڑکی بھولی ہے اور اس محبت میں دھوکہ کھا جاتی ہے تو وہ اس پر مسحور ہو جاتی ہے، وہ اس سے بہت لگاؤ محسوس کرتی ہے اور اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔ جس پر وہ یقین رکھتی ہے اور خواہشات کا تبادلہ کرتی ہے، اور جب اس بدکار کو لگتا ہے کہ لڑکی پک گئی ہے اور توڑنے کے لیے تیار ہو گئی، تو وہ اسے نگل جاتا ہے جیسا کہ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیا کرتا ہے؟؟؟

میں بھی اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہی تھی، جس کے پتے کھلے، جوانی پھولی، وہ غافل ہو کر پرہیزگاری کی باڑ کو بھلا چکی تھی، اس لیے خواہش کی جھیل میں تیر گئی اور نہ جانے اس پر کیا گزرے گی۔ وہ آزادی کے ساتھ زندگی گزارتی ہے، بغیر کسی پابندی یا نگرانی کے، اور والدین کی طرف سے اعتماد کی باڑ اسے نتائج کی قدر کیے بغیر کسی بھی نام نہاد بوائے فرینڈ کو لینے پر مجبور کر سکتی ہے، اور شیطان آزادی اور خود اعتمادی کی باڑ سے ٹکرا جاتا ہے۔ اور یہ کہ یہ معمول کی بات ہے، لڑکی دوڑتی ہے اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور کال آتی ہے، وہ اس کے پاس جاتی ہے اور جہاں چاہے جاتی ہے، اور والدین کو کچھ نہیں معلوم، کیونکہ وہ ان سے جھوٹ بولتی ہے!!!!

میں بستر سے اٹھ کر اپنی بیٹیوں کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ سب نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میرے اندر کی کشمکش کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں اس زمانے میں خود کو اور اپنی بیٹیوں کو کیسے محفوظ رکھ سکوں گی؟!!! اس دنیا میں کیسے انہیں احمقانہ کاموں سے بچا سکوں گی؟!

سماج میں جو بدعنوانی پھیلی ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟! کیا اب اس جنسی بے راہ روی کے طوفان کو روک پانا ممکن نہیں؟!

اگر چوکیدار کو کوئی رشوت دے دیتا ہے تو وہ خاموش رہے گا اور غلط کام چلتا رہتا ہے؟!

کیا معاملہ صرف مار پیٹ سے حل ہونے والا ہے؟!

اب میں بدلتی ہوئی دنیا کو زیادہ گہرائی سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے آج اپنی آنکھوں سے عفت کی راہ سے انحراف کی قیمت دیکھی ہے۔ فضول اور تماشا کا نتیجہ بھی دیکھا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ دروازہ کا سوراخ روز بروز بڑا ہوتا جا رہا ہے۔

اردو زبان

اگر آپ اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں تو عشق کر لیں اور اگر عشق کرنا چاہتے ہیں تو اردو زبان سیکھ لیں۔

خشونت سنگھ

نگاہِ حسرت

توصیف بریلوی

(علی گڑھ)

لِلی کے بارہا کہنے پر ایک دن اس کا شوہر وکی اپنا بڑا سا پورٹریٹ لے کر گھر آیا اور بیوی کو دکھاتے ہوئے اس نے کہا:

”یہ دیکھو میرے ایک دوست نے میری تصویر بنائی ہے۔ وہ بہت اعلی درجے کا مصور ہے اور اس کی مصوری کا چرچا بیرون میں بھی ہے۔ نہ جانے کیسے اس نے میرے لیے وقت نکالا۔ اب تو خوش ہو؟“

تصویر کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے لِلی نے کہا......”بہت خوب!...... یہ تو مصوری کا اعلی نمونہ ہے۔ لگتا ہے آپ کے دوست کے ہاتھوں میں جادو ہے۔ ویسے آپ کا یہ دوست رہتا کہاں ہے؟ آپ نے اپنے سارے دوستوں سے ملوایا لیکن ان چھپے رستم کو چھپائے کیوں رکھا؟“

”کیا بتاؤں......وہ بہت مصروف آدمی ہے۔ مجھ سے ہی بڑی کم ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کئی شہروں میں تو اس کے گھر اور دفاتر ہیں، کس وقت کس شہر میں ہوگا یہ تو صرف اسی کو معلوم ہوتا ہے۔ کافی دولتمند بھی ہے لیکن گھمنڈ نہیں ہے۔ ہماری شادی کے پہلے ہی میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک سفر کے دوران ہوائی جہاز میں میرے قریب ہی بیٹھا تھا اور تب سے لے کر آج تک اتنی کم مدت میں میرا ایسا دوست بن گیا ہے کہ جیسے ہم دونوں کا بچپن ساتھ میں گزرا ہو۔ بہت دلچسپ باتیں بھی کرتا ہے۔“ وکی نے مسکراتے ہوئے اپنے دوست کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

”اپنے جگری دوست کو کبھی گھر پر بھی نہیں بلایا آپ نے؟“ لِلّی نے کہا۔

”ابھی بتایا نہ جناب مصروف ہی اتنے رہتے ہیں کہ ہر بار ٹال جاتے ہیں۔ جب ہمارے شہر میں ہوتے ہیں تو ملنے کے لیے دفتر آ جاتے ہیں یا مجھے اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔ ہماری شادی کے وقت بھی جناب کا کسی ضروری کام سے باہر جانا ہوا تھا۔ بہت دلچسپ آدمی ہے ملواؤں گا کسی دن۔“ کہتے ہوئے وکی مسکرایا۔

”اب تو خوش ہو نہ؟“ لِلّی کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وکی نے پوچھا۔

”بہت خوش ہوں۔ آپ کے ساتھ کوئی پریشانی مجھے چھو بھی نہیں سکتی۔ آپ کی یہ خوبصورت تصویر میں بیڈروم میں لگاؤں گی تاکہ سونے سے پہلے، جاگنے کے بعد اور دن میں بھی کئی بار آپ کا عکس دیکھتی رہوں۔ میں چاہتی ہوں ہمارا ہونے والا بچہ آپ کی طرح ہو، بالکل آپ جیسا۔“ کہتے ہوئے لِلّی اپنے شوہر سے لپٹ گئی۔

تصویر بیڈروم میں آویزاں ہو چکی تھی اور لِلی اسے اکثر دیکھا کرتی۔ وکی کے دفتر جانے کے بعد وہ یا تو آرام کرتی نہیں تو ٹیلی وژن پر اپنی پسند کا کوئی پروگرام دیکھتی۔ دیکھ بھال کے لیے ملازمہ تھی ہی۔ وکی بھی دفتر سے فون کر کے حال چال پوچھ لیتا تھا۔ آرام و آسائش، سہولیات، مال و دولت اور اس سب سے بڑھ کر بے انتہا محبت کرنے والا شوہر بھی تھا۔ ایسے میں کوئی اپنی قسمت سے کیسے نالاں ہو سکتا ہے؟

ایک دوپہر لِلی کو اپنے کمرے میں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ وہ گھبرا گئی اور خود کو تسلی دینے لگی کہ کمرے میں اس کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس نے ملازمہ کو بھی کمرے میں بلا لیا اور اس سے باتیں کر کے اپنی گھبراہٹ کو زائل کرنے لگی۔ اس نے یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتائی تو اس نے مسکرا کر لِلی کو آرام کرنے کی صلاح دی۔ کمرے میں اسے کوئی گھور رہا ہو، ایسا اکثر لگنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے کمرے میں لگی ہوئی تصویر کو بغور دیکھا۔ اس تصویر پر چلائے گئے موقلم کے نشانات اور رنگوں کی تہوں کو دیکھا۔ آخر کار تصویر کی آنکھوں کو دیکھا تو اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ تصویر تو اس کے شوہر کی ہے لیکن آنکھیں......آنکھوں پر جا کر اس کی نگاہیں قبولیت کی سند نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے اپنے شوہر کی دیگر تصویروں کو جو کیمرے سے لی گئی تھیں ان میں آنکھوں کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ بیڈروم میں آویزاں تصویر کی آنکھیں اس کے شوہر کی ہرگز نہیں ہیں۔ جب سارا معاملہ وکی کے گوش گزار کیا تو اس نے اپنے دوست کے فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

”پیاری لِلی تم خوامخواہ واہمہ پال رہی ہو۔ وہ بہت اچھا اور پیشہ ور مصور ہے۔ اس کے پاس تو وقت ہی نہیں تھا، وہ تو تمہاری خواہش کی وجہ سے میں نے اس سے کہا تب کہیں میری تصویر بنانے کے لیے راضی ہوا۔“

”وہ میں نہیں جانتی......لیکن اس تصویر میں آنکھیں کسی اور کی ہیں۔“ کہتے ہوئے لِلی کمرے کی طرف جانے لگی۔ وکی اسے سمجھانے کے لیے اس کے پیچھے گیا اور ان سب فضول باتوں سے بچنے اور ہونے والے بچے کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔

بات آئی گئی ہو گئی اور وکی کی تصویر کمرے میں ہی آویزاں رہی۔ لِلی اس تصویر کی طرف نہیں دیکھتی تھی بلکہ اس سے کترا کے نکلتی اور کمرے میں رہتے وقت چور نگاہوں سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھتی۔ اس نے کمرے سے تصویر کو ہٹانے کے بارے میں سوچا بھی لیکن یہ سوچ کر نہیں ہٹائی کہ اول تو اس نے خود ہی اپنے شوہر سے تصویر کے لیے ضد کی تھی اور تصویر ہٹانے سے وکی کے ناراض ہونے کا اندیشہ بھی تھا حالانکہ وکی ایسا نہیں تھا۔ وہ تو اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔

جیسے جیسے لِلی کے پیٹ میں ابھار آ رہا تھا ویسے ویسے ولادت کا دن بھی نزدیک آ رہا تھا جس سے دونوں میاں بیوی بے حد خوش تھے اور بے صبری سے منتظر بھی۔ ایک دوپہر غنودگی کی حالت میں اس کی نظر وکی کی تصویر پر پڑی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کلامی میں کہا:

”آخر اس تصویر کی آنکھوں سے میں اتنا خائف کیوں ہوں؟“

اس سوال کا جواب تو خود اس کے پاس نہیں تھا لیکن غور و فکر کے بعد ایک جانا پہچانا چہرہ اس کے ذہن میں ابھرا اور وہ سوچ کی وادی میں اترتی چلی گئی……

وہ لِلی کے کالج کا پہلا سال تھا۔ جب اس کی ملاقات کالج کے ذہین مگر ضدی لڑکے ٹونی سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہر مضمون میں اول آتا تھا اور مصوری تو جیسے اس کے خون میں تھی۔ وہ اپنے شوق کے لیے کسی بھی حد تک چلا جاتا تھا۔ کسی سے جھگڑا ہو جانے پر اس کا مذاق اڑانے کے لیے اس کا کارٹون بنا دیتا اور اگر کسی پر مہربان ہو جاتا تو اس کی تصویر کو کچھ ایسا روپ دیتا جس سے لگتا کہ وہ کوئی اساطیری کردار ہو جس سے لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ وہ اپنی مرضی کا مالک تھا کئی بار اپنے اساتذہ کو بھی لاجواب کر چکا تھا اس لیے اس کی درجے میں غیر حاضری پر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ استاد پڑھا رہے ہوتے اور وہ آرٹ گیلری میں بیٹھ کر مصوری کے فن پر کوئی کتاب کا مطالعہ کرتا یا پھر کمال الدین بہزاد، لیونارڈو داونچی، مائکل اینجلو، پکاسو، ایڈورڈ ہاپر، ایم. ایف. حسین اور صادقین جیسے مصوری کے عالموں کے بنائے ہوئے شاہکاروں کو دیکھتا اور ان پر نوٹس بناتا۔ اس دوران سگریٹ اس کے ہونٹوں یا انگلیوں کے درمیان دبا رہتا جس کی وجہ سے اس پر کئی بار جرمانہ بھی دینا پڑا تھا۔ آرٹ گیلری میں ایک تصویری نمائش کا انعقاد ہوا تھا جس میں شہر کے دوسرے کالجوں کے طلباء نے بھی حصہ لیا تھا۔ لِلی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گئی تھی حالانکہ اسے فنِ مصوری میں دلچسپی نہیں تھی۔ لِلی کو وہاں بہت سی تصویریں پسند آئی تھیں لیکن ٹونی کی پینٹنگ بہت زیادہ پسند آئی تھی۔ ریمارکس بک میں اس نے دل سے داد دی۔ اس نمائش میں سب سے زیادہ توجہ کا مرکز ٹونی کی ہی پینٹنگ بنی تھی۔ اس وجہ سے لِلی اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ دونوں میں دوستانہ مراسم بڑھنے لگے تھے کہ تبھی ٹونی کا اصل روپ اس کے سامنے آ گیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ آرٹ گیلری میں اس کا تنازعہ ایک لڑکی سے ہو گیا تھا۔ ٹونی نے اس لڑکی کی قد آدم برہنہ تصویر بنا کر رات میں کسی وقت چوراہے پر نصب کر دی تھی۔ سب کو پتا تھا کہ یہ کام کس کا ہے لیکن کوئی بھی ٹونی کے خلاف جانے کی ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے جب طلباء متحد ہوئے اور ان کے دباؤ بنانے پر پرنسپل نے ٹونی کو کالج سے نکال دیا۔ اس واقعے کے بعد لِلی نے قسم کھائی تھی کہ آئندہ ٹونی سے نہیں ملے گی۔ لیکن وہ اتنی آسانی سے کیسے مان جاتا۔ کالج میں اس پر پابندی تھی لیکن باہر لِلی کا انتظار کرتا اور اس کے باہر نکلنے پر اس سے اپنی بے گناہی بیان کرتا رہتا۔ لِلی اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتی اور اپنے گھر کی راہ لیتی۔ کئی بار وہ لِلی کے گھر بھی پہنچ گیا تھا جسے لِلی کے گھر والوں نے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ آخر تنگ آ کر ٹونی کے باپ نے اسے مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیج دیا تھا۔ یہ سارا واقعہ یاد آتے ہی لِلی کے سامنے ٹونی کی تصویر مجسم ہو گئی۔ اس بار اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہوا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید یہ غلط فہمی ہو۔ اس کے شوہر اور ٹونی کا کیا تعلق؟ اس کی زچگی عنقریب تھی اس لیے وہ اپنا ذہن ایسی باتوں سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا شوہر وکی بھی اسے کوئی فکر نہ کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔ لِلی نے ایک فیصلہ سختی سے کیا کہ وہ اب اپنے کمرے میں اس تصویر کو نہیں رہنے دے گی اور اس نے ایسا کیا بھی۔ وکی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اس لیے وہ اور بھی مطمئن ہو گئی۔ وہ ہر طرح کی فکر سے خود کو آزاد رکھنے کی کوشش کرنے لگی تاکہ اس کے ہونے والے بچے پر کوئی منفی اثر نہ پڑے۔

لِلی نے ایک خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ وکی اور لِلی دونوں کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔ وکی اپنے دفتر سے جلدی گھر آنے لگا تاکہ اپنے مستقبل کے ساتھ کھیل سکے۔ لِلی بھی بچے کو کبھی گود میں لٹا کر باتیں کرتی تو کبھی اسے پالنے میں لٹا کر جھولا جھلاتی اور کبھی اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کے نازک ہونٹوں اور گالوں کو چھوتی۔ ایک ملازمہ ہمہ وقت کمرے کے باہر بیٹھی رہتی جو لِلی کی آواز پر فوراً اندر جاتی اور بچے کو سنبھالنے میں اس کی مدد کرتی۔ بچے کے چہرے کی جلدی سلوٹیں اب کم ہونے لگی تھیں اور اب وہ اپنی آنکھیں بھی کھولنے لگا تھا۔

ایک دن لِلی نے بچے کو کسی طرح سلایا اس وقت ملازمہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ بچے کو اچھی نیند مل سکے اس لیے اس نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر روشنی مدھم کر دے۔ اتنے میں اسے باہر کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ملازمہ کو آواز لگاتے ہوئے وہ کمرے کے باہر گئی اور کچھ ہی دیر میں ملازمہ کو وہاں نہ پا کر واپس آئی تو دیکھتی ہے کہ بچہ ہاتھ پیر چلا رہا ہے اور بس جاگنے ہی والا ہے۔ وہ بچے کے قریب پہنچی اور بچے نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گئی اور ڈر کر دیوار سے جا لگی۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جو کچھ ہی دن قبل تک اسے تصویر سے گھورا کرتی تھیں۔ بچہ اب رو رہا تھا اور لِلی ساکت اور جامد حالت میں دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔

Traffic Signal

As received:This is unique and astonishing.There is a famous road junction in Gulberg Lahore called Firdous Market Chowk. It connect Cavalry ground with Gulberg.Recently the traffic lights at this Chowk went out of order.The traffic police or the department concerned did not take any notice or took any step to rectify the fault.After about two weeks the baggers who's used to beg at this Chowk pooled up the money and got new traffic lights installed. When I inquired it from one of the begger he said they were facing huge financial loss as the vehicles would not stop at the Chowk.To top it the traffic police also faced a financial crunch because their share also went down so they prompted the baggers to pool the money and get new traffic lights installed.

سسٹم سے جنگ

ندیم راعی

(مرادآباد)

وہ بہت خوبصورت، خوبرواور موڈرن لباس زیب تن کئے ۲۸ر سالہ لڑکی تھی کھلے چاک کالانگ جمپر جس کے نیچے جینز پہنے وہ غضب کی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے بغور دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا اور پھر بار بار میں اسے کنکھیوں سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ اس کے چہرے سے میری نظر ہٹ ہی نہیں رہی تھی وہ بھی مجھ پر سرسری نظر ڈال لیتی اور میں اپنی نظریں اِدھر اُدھر کر لیتا جیسے میری توجہ اس پر ہے ہی نہیں۔۔۔ زہیب نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا ''یہ مسکان صاحبہ ہیں میری کلوز فرینڈ اور یہ ارشد ملک یہاں کے معروف ایکسپورٹر۔۔۔'' اس نے شرماتے ہوئے اپنا حنائی ہاتھ اپنے ماتھے تک لاتے ہوئے مجھے آداب کیا اور نیچے سے اوپر تک میرا سرسری جائزہ لیا۔ میرے لئے یہ کوئی نہیں بات نہیں تھی۔ اکثر وبیشتر لڑکیاں مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا کرتیں پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے جھینپتے ہوئے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔۔۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تعلیم یافتہ مہذب اور آئیڈیل لڑکی تھی جسے پانے کیلئے ہر اک قطار بند ہو جائے اور اسے پاکر اپنا حاصل زندگی سمجھ لے میں نے بھی ایسی ہی لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانے کے خواب بنے تھے۔ جو گھر میں رہے تو لجائی شرمائی گھونگھٹ میں زینت خانہ اور محفل میں جائے تو جانِ محفل بن جائے تاہم میں بھی کسی سے یا زہیب سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا موڈرن اسمارٹ ہینڈسم برسر روزگار تیس سالہ وجیہہ نوجوان۔۔۔ مجھ پر سیکڑوں لڑکیاں مرتی ہیں۔ میں کسی کو لفٹ ہی نہیں دیتا یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے کسی کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ فی زمانہ لڑکیوں کو اپنے دام میں پھنسانا بہت آسان ہے۔ جب آپ کے پاس تمام موڈرن ذرائع ہوں قیمتی ملبوسات موبائل نجی فلیٹ اور گاڑی اور پیسے کی ریل پیل۔۔۔؟ اگر میں توجہ کرنے پر تل جاؤں تو ایک سے ایک موڈرن اور خوبصورت لڑکی میرے آگے پیچھے گھومتی نظر آئے اور چالو لڑکیاں تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔۔۔؟

''کچھ پیسے خرچ کرو تو میری یہ گرل فرینڈ۔۔۔ تمہاری۔۔۔؟

زہیب کے یہ الفاظ سن کر میری محویت ٹوٹی اور میں نے مسکان کو بغور دیکھا اس نے شرما کر سر جھکا لیا اس کے چہرے سے ندامت کی قوس وقزع کے رنگ صاف جھلک رہے تھے اس کا چہرہ اس طرح مائل ہو گیا تھا اس کی نگاہیں اس کے پیر کے انگوٹھے پر تھیں جو دوسرے انگوٹھے سے اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ شاید یہ غیر متوقع الفاظ اسے گراں گذرے۔۔۔ لیکن زہیب نے میرے خیالات کے تاج محل کو ریت کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا میں حیران تھا کہ وہ۔۔۔ لیکن اس کی معصومیت حسن وشباب اور بھرے پرے جسم کو دیکھ کر میں خود کو روک نہ پایا اور صرف اتنا ہی کہہ سکا ''کل انہیں میرے فارم ہاؤس کے فلیٹ پر بھیج دینا جتنا پیسہ انہیں چاہیے مل جائے گا۔ زہیب نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ لڑکی پیشے ور نہیں ہے بلکہ ان کی کچھ مجبوریاں ہیں اور ان کی مجبوریوں کے سلسلے کا میں پہلا شخص ہوں؟ اور میرے پاس نہ ان کی ضرورت بھر پیسہ ہے اور نہ ہی دیگر وسائل۔۔۔''

میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے جو مجھے ورثے میں ملا گو میرے والد محترم ایک متوسط گھرانے سے تھے۔ ذمہ داریوں نے ان سے ان کی تعلیم چھین لی۔ دن رات کی محنت سے پہلے کارخانہ قائم کیا اور پھر اپنے تیار کردہ پرڈوکس کا ایکسپورٹ شروع کر دیا۔ لکھنے پڑھنے اور ایکسپورٹ ڈوکوہنس وبینکنگ کے لئے تعلیم یافتہ ملازمین سے کام لیا اور مینوفیکچرنگ سے لیکر ایکسپورٹ پیکنگ تک کے نشیب وفراز والد محترم نے سر کئے۔

ہم بہن بھائی بچپن سے ہی انگلش کانوینٹ کے اسٹوڈنس رہے میں نے گریجویشن کیا انگلش ٹائپ کمپیوٹر وغیرہ سیکھی اور ڈوکومینٹس وبینکنگ کا سارا کام سنبھال لیا ساتھ ہی دوران تعلیم مینوفیکچرنگ اور پرڈوکشن کی مہارت حاصل کر لی تھی اب ان سب ذمہ داریوں کے پیش نظر اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ اس طرح کے عشق وشق یا پھر عیاشی جیسے فالتو کام کئے جائیں لیکن ماحول صحبت اور فطرت انسانی نے مجھے بہکا دیا تھا۔

مسکان ٹھیک صبح ۸ر بجے میرے فلیٹ پر آگئی تھی۔ جھیل سی آنکھیں شہابی رنگ، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، گول مٹول چہرہ، درمیانہ قد، گداز بھرا پڑا سینہ، جو ٹاپ سے نکلنے کے لئے بے تاب نظر آرہا تھا۔ جینز کی بیلٹ کے اوپر کھلی نابھی میرے ہوش اڑا رہی تھی۔ میں نے معلوم کیا کہ اسے یہاں پہونچنے میں کسی طرح کی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے فرج سے پانی نکال کر اس کے روبرو رکھ دیا بعدہٗ کولڈ ڈرنگ اور پچاس ہزار روپیہ کے نوٹوں کی ایک گڈی اسے دیتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ تمہاری مجبوری۔۔۔؟

یہ میری زندگی کے پہلے انمول لمحات تھے جسے میں نے پیسے دے کر حاصل کئے تھے۔ میں نے تو اس کا نہ پتہ معلوم کیا تھا اور نا ہی دوبارہ ملاقات کے بارے میں کوئی گفتگو ہوئی تھی۔ شاید وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ پہلی اور آخری ملاقات ہو تاہم زہیب کا دیا ہوا اس کا موبائل نمبر میرے موبائل کی فون ڈائری میں ضرور درج تھا۔ وہ مجھے سیراب کر کے تقریباً ۲ر بجے دن واپس چلی گئی تھی۔

ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بہنوں کی تو شادی کر دی گئی چھوٹا بھائی نیویارک (امریکہ) میں فرم کا دفتر کھولے امپورٹ ایکسپورٹ کی کارگذاریوں میں مصروف ہے اور میں یہاں ایکسپورٹ سے منسلک تمام نشیب وفراز سے آہنگ ہوں۔ میرے والدین نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ ہمارا گھر فرم اور کاروبار شہر میں ٹاپ پر نہ تھا تو کسی سے کم بھی نہیں تھا۔ لیکن میرے والدین نے

میرے لئے لڑکی میڈیم گھرانے سے چنی۔۔۔ میرے والدین میری شادی پر اپنے سارے ارمان نکال لینا چاہتے تھے اس سلسلے میں کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے اور سسٹم کے مطابق لڑکی والوں سے بھی توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کی شایان شان انتظامات کریں ان کے باراتیوں کی تواضع دان جہیز ان کی شان کے مطابق ہو۔

آج میری شادی تھی رسم سہرہ نوابی انداز میں ادا کیا جا رہا تھا۔ دونوں بہنیں اور بہنوئی راجہ رانی بنے ہوئے تھے۔ دونوں بہنوں کو سہرا بندھائی کی رسم میں تحفتاً سونے کے کنگن وقیمتی کپڑے اور بہنویوں کو رسم گھوڑا چڑھائی میں سینٹرو گاڑیاں دی گئی تھیں علاوہ ازیں رشتہ داروں پر تحفوں کی بوچھار کی جارہی تھی۔

''ایک سرکاری ملازم نے بارات کا بہترین استقبال کیا ہوگا۔ کون سی ایسی شہ نہ تھی جو باراتیوں کی خاطر مدارت سے مبرہ ہو اور پھر جہیز بھی مقدور بھر ماسوا چار پہیوں کی گاڑی کے سونا چاندی، فرج، موٹر سائیکل، اے سی، تہرین سہانپوری، فرنیچر سبھی کچھ تو ہوگا جو نی زمانہ شادیوں میں رائج ہے اور ایک سسٹم کے تحت پیر پسارے ہے بیٹیوں کا باپ تمام عمر کی جائز و ناجائز کمائی ہوئی دولت اس سسٹم کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے اور ساتھ ہی خود کو قرضوں کے پہاڑ کے نیچے دبا لیتا ہے اور باقی عمر اس قرض کو ادا کرتے کرتے گذر جاتی ہے۔۔۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا تھا والدین اور بارات کا استقبال و من چاہا جہیز ان کے خواب وارمان سب کے سب میرے ذریعہ سسٹم کے خلاف جنگ چھیڑنے کی نذر ہو گئے تھے۔ وہ یہ کہ میں نے شادی کی ایک غریب پریوار کی لڑکی سے صرف پانچ افراد لے جا کر نکاح پڑھوا کر اور بنا جہیز میں کے دلہن کو اپنے گھر لے آیا جسے مجبوراً میرے والدین کو بھی قبول کرنا پڑا لیکن رسم سہرا اور ولیمہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ ادا کیا گیا۔

آج تقریب ولیمہ شہر کے سب سے بڑے اے سی میرج ہال میں جاری وساری تھا۔ دوست احباب رشتہ دار دولہا دولہن کو منہ دکھائی میں تحفے و اپنی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ دلہن سبز پری بنی سبز جوڑے اور رامپوری جڑاؤ سونے کے گہنوں سے لدی آسمان سے اتری پری لگ رہی تھی جو لانگ کرسی پر اپنے شوہر نامدار کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ جن پر نہ صرف بہنیں بہنوئی ماں باپ و دیگر رشتہ دار واری واری تھے بلکہ مہمانان بھی اس شاندار جوڑی کی تعریفوں کے پل باندھنے میں لگے تھے۔ چہار سو دولہن کی معصومیت وخوبصورتی کا چرچا تھا وہیں دولہا کے خوبرو ہینڈسم وجیہی نوجوان ہونے کی ستائش بھی تھی۔ دولہا دولہن ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے پر تلے تھے۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ہر کوئی اللہ تبارک تعالیٰ کے گن گان کر رہا تھا کہ اس نے کیسی پرفیکٹ، جوڑی بنائی ہے نہ کوئی ماشا بھر کم نہ کوئی ماشا بھر زیادہ۔۔۔؟ یہاں یہ اسم بامسمیٰ ہے کہ جوڑیاں اللہ تبارک تعالیٰ بناتا ہے اور تبھی بنا دیتا ہے جب یہ دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ زہیب بھی تقریب ولیمہ میں آیا ہوا تھا۔ وہ مختلف اقسام کے ذائقہ دار کھانوں اور مشروب سے لطف اندوز وسیراب ہو کر دولہا دولہن کے اسٹیج کی طرف بڑھا حالانکہ اسٹیج کی ساری کارگذاریاں مختلف جگہوں پر لگے اسکرین پر نظر آرہی تھیں۔ دولہا تو سینہ تانے بیٹھا تھا لیکن دلہن شرمائی لجائی سر جھکائے تھی جس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ زہیب اسٹیج کے ٹھیک سامنے پہونچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ دلہن کی کرسی پر بیٹھی کوئی اور نہیں بلکہ اس کی گرل فرینڈ ''مسکان'' ہے۔

☆

- بقیہ -

مٹی

نمازِ جنازہ کے بعد میت کو قبر کے پاس دفنانے کے لیے رکھا گیا اور لوگ ایک قطار میں آ کر سائیں کے سفید بے داغ کفن پر پھولوں کا نذرانہ دے کر اپنے غم کا اظہار کر کے ایک جانب چلے جاتے۔ چچا عظیم قطار میں سب سے آخر میں کھڑے ہو کر اپنی باری پر آئے اور اپنی میٹھی گولیوں والی جیب سے مٹھی بھر مٹی نکال کر کفن پر بکھیرتے ہوئے اپنی گرجدار آواز میں بولے، سائیں جی، جاتے جاتے یہ تھوڑی سی مٹی تو اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ اسی زمین کی مٹی کے حصول کے لیے آپ نے میرا ہنستا بستا گھر اُجاڑا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ نے مجھے بے گھر و بے سروسامان کیا تھا اور میری راتوں کی نیند اور دن کا سکون چھین لیا تھا۔ چچا کی آواز قبرستان کے سوگوار اور خاموش ماحول کو کاٹتی ہوئی ہر شریکِ جنازہ کے کانوں میں کسی بندوق کی گولی کی طرح جا لگی۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے ایک جانب چل پڑے اور لوگ مردے کو دفنانے لگے۔

☆

‘‘ بچپن کی بگیا ’’

نویدسروش

(میرپورخاص)

وہ جو ملنے کے بہانے آئے تھے　　ضرب وہ دل پر لگانے آئے تھے
کچھ تو میرے ہم نشیں کر اعتبار　　لوگ مجھ کو آزمانے آئے تھے
خواہشوں کا پاس کیا رکھتے میری　　اپنا ہی دکھڑا سنانے آئے تھے
تا کہ خوابوں کا تسلسل ٹوٹ جائے　　نیند سے مجھ کو جگانے آئے تھے
راس جب صحرا نوردی آ گئی　　مجھ سے ملنے کچھ دوانے آئے تھے
ڈر گئے سن کر میرے دل کی صدا　　جو مرے دل کو دکھانے آئے تھے
دنیا داری میں مگن جب تھا سروشؔ　　دوست کچھ ملنے پرانے آئے تھے

◆

ارشدسعید

(آسٹریلیا)

رو رہی ہے ساری خلقت اس طرف دل ایک ہے　　بے بسی کا کیا کہوں میں سب کی مشکل ایک ہے
لکھ رہے ہیں سارے غزلیں مل رہی ہے داد پھر　　حسن و عشق اپنی جگہ ہیں تیری محفل ایک ہے
ناو بھی پانی میں ڈوبے قتل ہوں خشکی پہ بھی　　یہ زمیں ہے وہ سمندر جس کا ساحل ایک ہے
ہجر کی راتیں ہیں لمبی وصل کے دن تھوڑے ہیں　　اے غمِ دل عشق میں دونوں کا حاصل ایک ہے
دیکھ لی شیشوں کی دنیا ہم نے ارشد اب بہت　　سچ ملے گا جس میں بس وہ آئنہ دل ایک ہے

◆

مادھوکوشک

(چندی گڑھ)

دل میں ہر دم چبھنے والا کانٹا صحیح سلامت دے　　آنکھیں دے یا مت دے لیکن سپنا صحیح سلامت دے
ہمیں یدھ آتنک بھوک سے ماری دھرتی بخشی ہے　　آنے والی پیڑھی کو تو دنیا صحیح سلامت دے
بچے بھی اب کھیل رہے ہیں خطرناک ہتھیاروں سے　　بچپن کی بگیا کو کوئی گڑیا صحیح سلامت دے
دعویٰ ہے میں اک دن اس کو دریا کر کے چھوڑوں گا　　کھلی ہتھیلی پر آنسو کا قطرہ صحیح سلامت دے
آدھی اور ادھوری حسرت کب تک زندہ رکھے گی　　کاغذ پر ہی دے پر گھر کا نقشہ صحیح سلامت دے
بھیڑ بھری محفل میں سب کی الگ الگ پہچان تو ہو　　اس لیے ہر اک اِنساں کو چہرہ صحیح سلامت دے

◆

جاناں ملک

(راولپنڈی)

روح میں غم کے تلاطم سے نمی بنتی ہے
خواب ٹوٹیں تو یہ اشکوں کی لڑی بنتی ہے
کیمرہ وقت کی رفتار دکھاتا ہے مجھے
اب مری عمر سے تصویر بڑی بنتی ہے
یہ الگ بات کہ تو ہجر کو آزار نہ مان
غم کی تشریح وگرنہ تو یہی بنتی ہے
اب تو پوروں میں ترے نقش اتر آتے ہیں
اپنی تصویر بناؤں تو تری بنتی ہے
ساعتِ ہجر سے جب ہو کے گزرتا ہے وجود
تب کہیں جا کے فقط ایک گھڑی بنتی ہے
اب تو بھیگی ہوئی آنکھوں میں ترے چہرے کی
کبھی بنتی نہیں تصویر کبھی بنتی ہے
میرے اظہارِ تمنا پہ تبسم کیسا
کیا مری بات پہ اے دوست ہنسی بنتی ہے
وہ اگر دور ہو تو پھر یہی خلوت جاناں
خطۂ چشم میں ساون کی جھڑی بنتی ہے

◆

ڈاکٹر مسعود جعفری

(حیدرآباد، دکن)

تو جو آیا تو اتر آئے ستارے سارے
جگمگانے لگے دریا کے کنارے سارے
اسی رستے سے نکل پڑتا ہے چشمہ کوئی
سوکھ جاتے ہیں جہاں اشک ہمارے سارے
اس نے جاتے ہوے مڑ کر جو مجھے دیکھ لیا
تر بہ تر ہو گئے آنکھوں کے کنارے سارے
روک پاتا ہی نہیں آنکھ کا دریا میں بھی
ٹوٹ جاتے ہیں جہاں غم کے سہارے سارے
مرے کندھے پہ زمانے نے صلیبیں رکھیں
آسمانوں سے فرشتے بھی پکارے سارے
ترے ہی نام لکھیں میں نے سہانی راتیں
ترے ہی نام کئے میں نے ستارے سارے
کیسے رہ پاوگے دنیا میں اکیلے مسعود
ایک اک کر کے چلے جائیں گے پیارے سارے

◆

فہیم اختر

(برطانیہ)

بھلا کس بات کی خاطر مجھے اب آزمائے گا
فریب اور جھوٹ، مکاری سے کوئی کیا ڈرائے گا
وہ دعوی کرتا ہے دنیا کو انگلی پر نچانے کی
علاوہ اس کے اک نادان کو اور کیا سجھائے گا
بھلے چرچہ ہے اس کا مدتوں سے شہر میں لیکن
یہ شہرت، نام، عہدہ قبر میں کب کام آئے گا
سدا سے برسرِ پیکار ہے باطل سے حق گوئی
کوئی کرب و بلا کی جنگ کو کیسے بھلائے گا
چھپائے پھرتے ہیں خنجر وہ اپنے آستینوں میں
بھلا پھر دوستوں سے ہاتھ کوئی کیا ملائے گا
فہیم اب شہر ہے ویران اور تاریک گلیاں ہیں
سو بس تو ہے جو ان بجھتے دیوں کو پھر جلائے گا

◆

اصغر شمیم

(کولکتہ)

جو دعویٰ کر رہے تھے زندگی کا   سہارا لے رہے ہیں خودکشی کا
اندھیرے سے میں گھبراتا نہیں ہوں   پتہ جب سے ملا ہے روشنی کا
میں صحرا میں کھڑا ہوں ہاتھ باندھے   خیال آیا جو مجھکو بندگی کا
وہی تو جی رہے ہیں زندگی کو   جو مقصد جانتے ہیں زندگی کا
محبت بانٹنے آئے ہیں ہم تو   ملا ہے درس ہم کو آشتی کا
اکیلے گھر میں بیٹھے بیٹھے اصغر   میں کب تک شور سنتا خامشی کا

○

فریاد آزر

(نئی دہلی)

ہوا نے کتنا جاں لیوا رویہ کر رکھا ہے   مگر ہم نے بھی جینے کا تہیا کر رکھا ہے
مسائل سے کہو اتنا نہ اب مجھ کو نچائیں   کہ میں نے زندگی بھر تا تا تھیّا کر رکھا ہے
ہمارے جیسے سادہ لوح مارے جا رہے ہیں   یہاں ہشیار لوگوں نے تقیہ کر رکھا ہے
ابھی بھی بازوؤں میں زور باقی ہے ہمارے   کہ ہم نے مدتوں تک ہیّا ہیّا کر رکھا ہے
تو کیا دورِ قیامت آ گیا شعری ادب پر؟   کہ ہر شاعر نے اب خود کو گویّا کر رکھا ہے
اگر حالات نے گردش میں نیّا کر رکھی ہے   تو ہم نے عزم و ہمت کو کھِویّا کر رکھا ہے
یہ کس دورِ جہالت میں چلے آئے جہاں پر   سبھی نے جینے کا مقصد روپیہ کر رکھا ہے

○

احمد سوز

(ممبئی)

زندگی ڈیزائن کیجیے   اور ہونا فائن کیجیے
امن ہی میرا مشن ہے   آپ مجھ کو جوائن کیجیے
سیکھ لیجے مست رہنا   اپنا ہر پل وائن کیجیے
راستے ٹیڑھے تو ہوں گے   اپنے اسٹپ لائن کیجیے
ایک ہی انساں ہیں سارے   سب کو پھر کمبائن کیجیے
پڑ رہے ہیں مانند رشتے   پھر سے ان کو شائن کیجیے
آیئے گپ شپ کریں کچھ!   ساتھ میرے ڈائن کیجیے

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

جو بچا تھا مکان میں سب کچھ
لے لیا اسی نے دان میں سب کچھ
میرے سچ میں اثر نہیں کچھ بھی
اس کے جھوٹے بیان میں سب کچھ
شاعری اس کو کیا سناؤں میں
کہہ دیا اس نے کان میں سب کچھ
چاہیے حضرت بلال کا درد
ہے وگر نہ اذان میں سب کچھ
راز کوئی بچا نہیں تیرا
آ گیا میرے دھیان میں سب کچھ
بات کرتا ہوں پھول جھڑتے ہیں
سچ ہے اردو زبان میں سب کچھ
بِن پروں کے ہے قدر کیا تیری
ہے پرندے اُڑان میں سب کچھ

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیار پور)

تھتھرتی ہے زمیں سورج بھی اب کم کم نکلتا ہے
غریبوں کا بڑی مشکل سے یہ موسم نکلتا ہے
ہمارے زخم اپنی اک الگ پہچان رکھتے ہیں
فقط راتوں کو دکھتے ہیں لہو پیہم نکلتا ہے
سفر میں اجنبی لوگوں سے ہرگز ڈر نہیں لگتا
یہاں تو جان کا دشمن کوئی ہمدم نکلتا ہے
یہاں انسانوں کے دکھ درد کا حل کون کرتا ہے
یہاں اکثر نیا نعرہ نیا پرچم نکلتا ہے
کوئی ٹوٹا ہوا گھر بارہا سپنے میں آتا ہے
تو اس کے ملبے سے اکثر کوئی البم نکلتا ہے

ذکی طارق بارہ بنکوی

(بھارت)

وہ حب جس کی ذکی تمثیل بحرِ بے کراں تک ہے
مآل اس کا بھی صد افسوس بس اک داستاں تک ہے
مکاں سے لامکاں تک ہے زمیں سے آسماں تک ہے
ہماری ذات کی وسعت خدا جانے کہاں تک ہے
مری خانہ خرابی پر نہ جا قسمت ہے یہ میری
مری تخئیل کی تعمیر بھائی لا مکاں تک ہے
تو پھر کیونکر نہ خوشبو دیں وجود و فن کی میراثیں
علاقہ ہی مرا جبکہ چمن سے گلستاں تک ہے
ملاقاتوں میں تیری والہانہ پن نہیں ملتا
تو کیا تیری محبت محض اے ہمدم زباں تک ہے
گریزاں ہے وہ میرے نام کی پرچھائیوں سے بھی
نہیں معلوم تھا مجھ سے اسے نفرت یہاں تک ہے
نشانہ جس کا بس میرا تنِ نازک ہے اے یارو
رسائی ایسے ہر اک تیر کی اس کی کماں تک ہے
مجھے مت دیکھ تو پرواز کی عظمت پہ رکھ نظریں
مری گردِ سفر تاروں کی دلکش کہکشاں تک ہے

* * *

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میامی)

قسط......۴

’’آج غصّے میں وہ بیٹھے ہیں خدا خیر کرے!‘‘

’’اماں کون بیٹھا ہے غصّے میں، اور بیٹھا ہے تو کیوں؟‘‘ (نورو چائے والے نے پیر صاحب کے ڈرائیور ننھے خان کو چائے کا گلاس تھماتے ہوئے کریدنے کی کوشش کی)

’’ہمارا نام تو دنیا جانتی ہے مگر آپ کو ننھا بننے کا شوق کیوں چرانے لگا؟‘‘

’’اچھے بھلے سریلے گانے کی بھد اُڑاؤ گے تو ہر کسی کا دل ننھا منّا بننے کو چاہے گا۔‘‘

’’اچھا جی! یہ بات ہے تو بنو، دل کھول کر بنو۔ کل کو اگر میں لاتوں کے بجائے سر کے بل چلنے لگوں تو کیا کرو گے۔‘‘

’’لگتا ہے، پیر صاحب نے آج پھر نام پوچھ لیا جناب کا۔‘‘

’’میاں پیر صاحب ہوں گے اپنے گھر کے، کسی کا دیا نہیں کھاتے بارہ، بارہ گھنٹے چوتڑ گھسنے کے بعد چند روپلّی دیویں، بات بے بات روب اس طرح جھاڑیں جیسے لاٹ صاحب کے بعد ان سے بڑا اپھنّے خان پیدا نہیں ہوا‘‘ ننھے خان کے بگڑے تیور دیکھ کر نورو چائے والے نے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

’’یونہی اول فول بکتے رہو گے یا کچھ بتلاؤ گے بھی!‘‘

’’میاں بتلانے والی کوئی بات ہو تو بتلاویں (ننھے خان نے ڈکار لیتے ہوئے بات جاری رکھی) اچھی بھلی گاڑی کھڑی کر کے گیا تھا رات کو، وس کے بعد کس نے ماں۔۔۔ مجھے کیا پتہ؟‘‘

’’کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا؟‘‘

’’میاں ایسی ویسی، کہویں رات کو پیٹرول کی ٹینکی کھُلی رہ گئی اور کسی نے اس میں ماچس کی تلی سلگا کے پھینک دی!‘‘

’’ماچس کی تیلی، پٹرول کی ٹینکی میں، پھر کیا ہوا؟‘‘

’’ہونا کیا تھا، بھک سے اُڑ گئی، تھانیدار کو الگ سے پانچ سو روپے دینے پڑے۔ لو بھلا بتلاؤ (ننھے خان نے بات کو جاری رکھا) میاں! ایک دفعہ کو مان لو پیٹرول کی ٹینکی مجھ سے کھُلی رہ گئی مگر اُس بیٹی۔۔۔ کے جنے کو اُس کی میّا نے بتلایا تھا یا کسی لگی سگی نے کہ جاڑے کی سسرتی رات میں اُسے پیٹرول کی کھُلی ٹینکی بھی ٹپاتی دے گئی اور اُس کی جیب سے ماچس بھی جن بن کے برآمد ہو گئی۔ کسی کا غصہ کسی پر اُترانا کہاں کی شرافت ہے!‘‘

’’بھئی واہ، کیا کہنے، بہت بڑھیا۔ اسے کہتے ہیں نہلے پہ دہلا۔ نیچے سیّاں کی دکان اوپر بلماں کا مکان تو سنا تھا مگر خلیفہ کے سامنے ایک اور خلیفہ پہلی بار دیکھا ہے:

خوب گزرے کی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

’’اماں! کہاں خلیفہ عبدالرشید اور کہاں نورو چائے والا، یہ تو مخمل میں ٹاٹ کے پیوند والی بات ہوئی‘‘

’’تو پھر یہ چوکڑی کیوں جمی ہے‘‘ (نورو چائے والے کے جواب پر بلّن میاں نے گرہ لگائی)

’’چوکڑی واکڑی کچھ نہیں، غریب اپنی بپتا بیان کر رہا تھا۔‘‘

’’یہ بات ہے تو لگاؤ جھٹ پٹ دو گلاس ایک خلیفہ عبدالرشید کا اور ایک اپنے ہوا ہوائی کا!‘‘

’’اماں کیا فرمایا ہوا ہوائی بمبئی والے؟‘‘

’’جی جی، ہوا ہوائی بمبئی والے، جو ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں۔‘‘

’’آپ محفل کو گرمایئے، میں جسم کو گرمانے کا سامان کرتا ہوں۔‘‘

’’لو بھئی خلیفہ! خوش ہو جاؤ۔ اپنے ہوا ہوائی بمبئی والوں کے آنے کی خوشی میں آج کا ناشتہ نورو محمد عرف نورو چائے والے کی طرف سے نوش جان کیجیے۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے مگر خود کہاں رہ گئے شیطان کے خالو!‘‘

’’اگر ہم شیطان کے خالو ہیں تو ایک عدد شیطان کی خالہ کا بندوبست آپ پر لازم بلکہ فرض ہوا‘‘

’’یہ بات ہے تو ابھی بلوائے لیتے ہیں اپنے بانکے مرزا کو‘‘

’’سمجھ نہیں آ رہا آپ کے جواب کی میں روشنی میں، آپ کے ذوقِ سلیم کی داد دی جائے یا آپ کی بدذوقی پر نوحہ پڑھا جائے۔‘‘

’’اماں نور محمد! جو بن پہ آئی محفل کو کیش کراؤ کیش، جہاں تک سوال عیش کا ہے تو وہ دن ہوا ہوئے جب خلیل خان فاختہ اُڑاتے تھے۔ ویسے بھی خالہ نصیباً کل کسی سے کہہ رہی تھیں ’’کمبخت نے میرے ہوتے ہوئے بڑھاپا ضائع کر دیا‘‘ (جیسے ہی چھکن میاں کے ری ایک جملے پر نورو چائے والے نے منہ کھولنے کی کوشش کی) نواب شبّن مرزا نور محمد کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئے:

’’اماں کیا غضب کرتے ہو یہ مواقع بار بار نہیں آتے۔‘‘

ہاں تو خلیفہ صاحب! بالا ہی بالا غوطے لگاتے رہیں گے یا ہمیں بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا موقع فراہم کریں گے‘‘

’’خبر اچھی نہیں ہے‘‘

’’لونڈے پکڑے گئے کیا؟‘‘

زیادہ گرم کھانے سے منہ جلنے کا اندیشہ ہوا کرتا ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھایئے، ٹھنڈا کر کے۔

’’خیر سے دشمنوں کے مزاج تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’اماں ہم اخبار کی بات کر رہے ہیں‘‘

’’کُلیہ میں گڑ پھوڑنے کے بجائے منہ سے کچھ پھُوٹیے حضور‘‘ (خلش دہلوی کی برہمی کو بھانپتے ہوئے)

’’آپ کے وہ بھی بھاگنے کے درپے ہیں!‘‘

’’مثلاً! ہمارے دولہا بھائی یا برادرِ نسبتی؟‘‘

’’اماں یہاں جان پہ بنی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔‘‘

’’تو یوں کہیے نا: تمہیں اٹھکیلیاں سوجھی ہیں اور ہم بیزار بیٹھے ہیں‘‘ (دلارے میاں نے پھبتی کسی)

’’پہلے ہی دلّی کم اُجڑی تھی کہ اب جوش صاحب بھی!‘‘

’’اِنَّ لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون!‘‘

’’اماں باؤلے ہوئے ہو!‘‘

’’جوش صاحب ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں‘‘

’’ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں، پر کہاں؟‘‘

’’پاکستان‘‘

’’پاکستان، پر کیوں؟‘‘ (فائق بجنوری کی آواز میں حیرت سے زیادہ ملال نمایاں تھا)

’’بس میاں! کیا عرض کریں اور کیا نہ کریں، یوں سمجھو وقت دعا آن پہنچا ہے۔‘‘

’’یوں اچانک بیٹھے بٹھائے جوش صاحب کو پاکستان کی یاد کیوں ستانے لگی۔ پاکستان اتنا ہی عزیز تھا تو سینتالیس میں چلے گئے ہوتے!‘‘

’’سینتالیس میں جاتی اُن کی جوتی (قاضی رفیع الدین نے غصّہ کو قابو کرتے ہوئے) اُس وقت زمین، جائیداد، کھیتی باڑی، باغ بغیچوں کے مالک تھے۔ جب سے حکومت ہند نے زمینداری نظام پر ضرب لگائی ہے تب سے جوش صاحب کے دل میں پاکستان کی محبت ہمکنے لگی ہے۔‘‘

’’کیوں پاکستان میں ہنڈی بٹ رہی ہے کیا؟‘‘

’’بٹ نہیں رہی تو نایاب بھی نہیں ہے۔ وہ ہے نا کیا نام ہے مصطفےٰ زیدی، وہ جوش صاحب کا بڑا احواری ہے۔‘‘

’’کون مصطفےٰ زیدی؟‘‘ (ماسٹر اخلاق صاحب کے استفسار میں بہت ساری حیرت بھی اُمڈ آئی تھی)

’’یہ صاحبزادے پہلے تیغ الہٰ آبادی کے نام سے جانے جاتے تھے اور فراق کے بہت منظورِ نظر تھے۔ ازاں بعد پاکستان چلے گئے اور مقابلے کا امتحان دے کر پاکستان کی سول سروس کا حصہ بن گئے۔ سنا ہے! آج کل ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور وہی جوش صاحب کو طرح طرح کی ترغیبات دے کر پاکستان بلانے پر بضد ہیں۔‘‘

’’آپ کے خیال میں، جوش صاحب تیغ الہٰ آبادی، یعنی مصطفےٰ زیدی کے بھرّے میں آ کر پاکستان چلے جائیں گے۔‘‘ (کفایت علی کے سوال کے جواب میں خلیفہ عبدالرشید نے دائیں، بائیں تلاش کر کے رومال سے منہ صاف کر کے دل گرفتگی سے کہا)

’’اللہ ہی بہتر جانتا ہے! پنڈت جی پوری کوشش کر رہے ہیں جوش صاحب کو روکنے کی‘‘

’’پنڈت جی؟‘‘ (دلارے میاں کے سوال پر خلیفہ عبدالرشید لمبی آہ بھرتے ہوئے گویا ہوئے)

’’اماں اپنے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو‘‘

’’اچھا، اچھا‘‘

سنا ہے پچھلے دنوں پنڈت جی نے جوش صاحب کو کھانے پر بلا کر قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر جوش، میں نہ مانو کی ہٹ پر قائم رہے۔ جس کے جواب میں پنڈت جی نے دوٹوک طور پر جوش صاحب سے دریافت کیا۔ آپ پاکستان جانا کیوں چاہتے ہیں؟‘‘

’’اس لیے کہ مجھے ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے‘‘ (جوش صاحب کا جواب سن کر پنڈت جواہر لال نہرو سکتے میں آ گئے اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فکر مندی سے جوش صاحب کو مخاطب کر کے بولے)

’’جوش صاحب! آپ کو بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اور مجھے پاکستان میں آپ کا‘‘

’’اس کا مطلب ہے، ٹائیں ٹائیں فِش!‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے۔ نہرو جی اتنی جلد ہمت ہارنے والے کہاں ہیں۔ (قاضی شہاب الدین کے سوال پر خلیفہ عبدالرشید سنجیدہ نظر آ رہے تھے) اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے ذمے جوش صاحب کو روکنے کا کام سونپا گیا۔ مولانا جید عالم دین، مشّاق سیاستدان اور جہاندیدہ انسان ٹھہرے۔ چند دن بعد ہی مولانا نے پنڈت جی کو صاف صاف بتلا دیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں۔ پنڈت جی نے وجہ دریافت کی تو مولانا نے نپے تلے لفظوں میں پنڈت جی کو دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا ’’معاملہ کچھ لو کچھ دو کا ہے۔ اگر آپ اُدھر والوں سے بڑھ کے بولی لگا سکتے ہیں تو لگا دیجیے۔ کم از کم میں اس حق میں نہیں۔‘‘

پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد اوائل عمر سے ایک دوسرے کے ہمنوا ہم خیال یعنی گہرے دوست رہے ہیں۔ جوش کے باب میں پنڈت جی نے مولانا کی رائے پر صاد کرنے کے بجائے ایک کوشش اور کرنے کی ٹھانی۔ اس

بار اُن کا انتخاب کوئی اور نہیں اُن کی اپنی بیٹی محترمہ اندرا گاندھی تھی۔ ہر چند محترمہ کو اپنے والد صاحب سے اُردو زبان و ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا مگر مولوی مدن کی سی بات نہ تھی جس کا اظہار محترمہ نے اپنے والد صاحب سے یہ کہتے ہوئے کیا:

’’اردو زبان اور ادب مجھے بہت پسند ہے مگر جوش صاحب کی گاڑھی اردو میرے سر سے گزر جاتی ہے‘‘

’’اس کے لیے تمہیں کسی مناسب اُستاد کی تلاش کرنا چاہیے‘‘ (پنڈت جی نے بیٹی کی مشکل کا حل بتلایا)

بیٹی نے اُلٹا باپ کی جانب سوال لڑھکا دیا:

’’یہ مسئلہ بھی آپ ہی کو سلجھانا ہوگا۔‘‘

’’ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ بھئی اپنے وہ ہیں نا! زار صاحب!‘‘

’’زار صاحب؟‘‘ (بیٹی کے چہرے پر سوالیہ شکن دیکھ کر نہرو جی گویا ہوئے)

’’بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری بیٹی اپنے زار صاحب کو نہیں جانتی۔ بھئی زار صاحب دہلی یونیورسٹی، شعبہ اسلامیات اور شعبہ اردو کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔‘‘

’’زار، ہوں، یہ کیا نام ہوا؟‘‘

’’اوہ ہو، ایسے ہی موقعہ کی مناسبت سے یہ محاورا وجود میں آیا ہوگا‘‘

ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا

’’بھئی زار اُن کا تخلص ہے پورا نام تربھون ناتھ زتشی المعروف زار دہلوی ہے۔ اُن کے والد محترم پنڈت منوہر ناتھ زتشی زار صاحب کی طرح بڑے قادر الکلام شاعر اور عاشقِ اردو تھے۔‘‘

’’اور وہ نوجوان کون ہے جو اکثر آپ کی طرح سفید شیروانی میں سرخ گلاب لگائے آپ سے ملنے آتے ہیں۔ اُن کے نام کے ساتھ بھی پنڈت اور زتشی وغیرہ لگتا ہے؟‘‘

’’بھئی کمال کرتی ہو تم، وہ اپنے زار صاحب کے اکلوتے صاحبزادے گلزار دہلوی ہیں جس زمانے میں شہزادہ فرخ سَیر نے علم و ادب کی ترویج میں مشاورت کی غرض سے ہمارے خاندان کو کشمیر سے دہلی طلب کیا تھا اُنہیں دنوں زار صاحب کا خاندان بھی اسی سلسلے میں دہلی بلایا گیا اور ہمارے خاندان کی طرح زار صاحب کا خاندان بھی دہلی کا ہو کر رہ گیا۔‘‘

’’بڑی دیر سے ایک سوال ہمارے ذہن میں کُلبلا رہا ہے۔ اجازت ہو تو۔۔۔!‘‘

’’بسر و چشم ارشاد کیجیے‘‘ (خلیفہ عبدالرشید نے منمناتے ہوئے کہا)

(ہوا ہوائی بمبئی والے نے خالص لکھنوی انداز میں سوال دریافت کرنے کے بعد پتلون کی پچھلی جیب سے پانا ما کی چمچماتی ڈبی نکال کر محفل میں شریک لوگوں کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے خود بھی لش پش کرتے لائٹر سے سگریٹ سلگا کر ناک اور منہ سے دھواں چھوڑنے کے بعد)

’’بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ پینتیس کروڑ کی آبادی والے ملک کا پردھان منتری اتنا فارغ کیوں ہے کہ ایک شاعر کے ملک چھوڑ کر جانے پر سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہے۔‘‘

’’پہلی بات تو یہ پلّے باندھ لیجیے کہ جوش صاحب کوئی ہما شما شاعر نہیں بلکہ اردو شاعری بلخصوص اردو نظم کی شناخت اور آبرو ہیں۔ دوسری نامناسب بات آپ نے پردھان منتری کی دلچسپی پر طنز کا نشتر چلاتے ہوئے کی۔ بندہ پرور! لیڈر ایک دو روز یا چند الیکشن جیت کر نہیں بن جاتے۔ لیڈ کرنے کے لیے، رہنمائی کرنے کے لیے، علم، تجربہ، برداشت، دور بینی اور دور اندیشی کے ساتھ اعلیٰ ذوقی لازمی ہوا کرتی ہے۔ نہرو خاندان کی علم دوستی سے کوئی کور دماغ ہی ناواقف ہوگا۔ ۱۹۱۶ء میں نہرو جی کی شادی ہوئی تو بے پناہ علمی، ادبی اور تہذیبی ورثہ رکھنے والے نہرو خاندان نے انگریزی اور ہندی کے مقابلے، اردو زبان میں دعوت نامہ چھپوانا اور بٹوانا ضروری جانا‘‘ (فائق بجنوری نے خلیفہ عبدالرشید کو انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہوئے سارا زورِ بیان سرف کر دیا)

’’تمنا ہے کہ بتقریب شادی خانہ آبادی برخوردار جواہر
لال نہرو ساتھ دختر پنڈت جواہر مل کومل، بمقامِ دہلی، بتاریخ
۷۔ فروری ۱۹۱۶ء تقریب مابعد، تواریخ ۸، ۹ فروری ۱۹۱۶ء
جناب مع عزیزان شرکت فرما کر مسرت و افتخار بخشیں‘‘

پنڈت موتی لال نہرو
آنند بھون۔ الہٰ آباد

نہرو جی کی زندہ دلی اور اعلیٰ ذوقی ہر صاحب دل جانتا ہے مگر اردو زبان و ادب کی حلاوت اور شیرینی سے تو گاندھی جی بھی پہلو نہ بچا سکے:

مورخہ ۹۔ جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین۔

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کے بارے یعنی میں کیا لکھوں۔ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ’’سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا‘‘ پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ اور دورانِ قید تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپ کا
موہن داس کرم چند گاندھی

’’بھائی میاں! جانے والے کو خدا حافظ کہنا دلّی کی پرانی روایت ہے ہاں مگر آنے والوں کو خوش آمدید کہنا روایت ہی نہیں دلّی کی تہذیب کا خاصہ بھی ہے۔‘‘

’’قربان جاؤں، مدت بعد بولے، مگر ایسے بولے، چلو جانے دو،

سیانے کیویں زندوں پرمُردوں کی مثال دینا بدشگنی ہوا کرتی ہے۔ ویسے حضور کا اشارہ ہے کس جانب؟‘‘ (فخری باربر نے بانکے مرزا کو مخاطب کر کے پانی پانی کر دیا)

’’جایئے ہم نہیں بتلاتے، آپ کا اندازِ گفتگو بالکل اُن کی طرح ہے!‘‘

’’اُن کی، کن کی؟‘‘ (بلّن میاں نے آنکھ میچ کر)

’’کٹنیوں کی طرح اور کس کی طرح!‘‘

’’ہم اگر غلطی پر نہیں ہیں تو تمہارا اشارہ خانصاحب بڑے غلام علی خاں کی طرف ہونا چاہیے!‘‘

’’اللہ خیر کرے، کیا ہوا خانصاحب کو؟‘‘

(خلیفہ عبدالرشید کی نشاندہی کے جواب میں خلش دہلوی نے پہلو بدلتے ہوئے دریافت کیا)۔

’’جو ہوا، اچھا ہوا، اللہ نے دلّی کو اجڑنے سے ایک بار پھر بچالیا!‘‘

’’خلیفہ صاحب! یہ موقع پہیلیاں بجھوانے کا قطعی نہیں ہے‘‘

’’خاطر جمع رکھیے حضرت! ہمارا بھی پہیلی بجھوانے کا قطعی ارادہ نہیں۔ ہم تو سیدھی سیدھی اطلاع دے رہے ہیں کہ برصغیر کے سب سے باکمال گویئے خانصاحب بڑے غلام علی خان جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، ہندوستان واپس تشریف لے آئے ہیں۔‘‘

’’واللہ یہ معجزہ کیونکر ہوا؟‘‘ (کفایت علی کے استفسار میں اشتیاق نمایاں تھا)

راوی کے بقول کراچی ریڈیو اسٹیشن پر خانصاحب کا طوطی بول بلکہ چہک رہا تھا کہ ایک دن اسٹیشن ڈائریکٹر نے خانصاحب کو بلا کر چند غزلیں تھماتے ہوئے کہا:

’’خانصاحب یہ ڈائریکٹر جنرل ذوالفقار بخاری کا کلام ہے جس قدر جلد ہو ان کی دھن ترتیب دے لیجیے۔ میری خواہش ہے کہ ان غزلوں کو یوم آزادی کے موقع پر نشر کیا جائے۔‘‘

(کچھ دیر تو خانصاحب سکتے کے عالم میں رہے، کبھی ہاتھ میں تھامی چٹوں، کبھی کُرسی میں دھنسے اسٹیشن ڈائریکٹر کو دیکھتے)

’’کس سوچ میں پڑ گئے خانصاحب؟ جلدی کیجیے، وقت کم ہے‘‘

(ایک مرتبہ پھر خانصاحب نے جواب دینے میں تاخیر کی)

’’آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’جی، میری طبیعت تو ٹھیک ہی ہے مگر بخاری صاحب کی طبیعت کے ساتھ دماغ بھی خراب ہوگا ہے‘‘

’’کیا غضب کرتے ہیں خانصاحب! آہستہ بولیے آہستہ، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کسی نے سُن لیا تو آپ کے ساتھ میری نوکری بھی چلی جائے گی۔‘‘

’’اجی لعنت بھیجئے ایسی نوکری پر۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہیں خانصاحب؟‘‘ (حیرت اور خوف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ)

’’بخاری صاحب سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ اُستاد پر ابھی اتنا بُرا وقت نہیں آیا کہ وہ آپ جیسے شاعروں کے کلام کی طرز بنائیں یا انہیں اپنی آواز میں ریکارڈ کرائیں، اللہ حافظ (آخری جملہ مکمل ہونے سے قبل خانصاحب اسٹیشن ڈائریکٹر کا دفتر چھوڑ چکے تھے)

عینی شاہدین کے بقول بخاری صاحب کے کانوں کی لَوں خانصاحب کا جواب سن کر سرخ ہوگئیں۔ اُن کے منہ سے صرف یہ الفاظ ادا ہو سکے وہ بھی دھیمی آواز میں۔

’’اُستاد کا دماغ ٹھکانے لگانا مجھے خوب آتا ہے‘‘

کراچی کے مقابلے پشاور ریڈیو اسٹیشن کا ماحول اور معاملات قطعی مختلف تھے۔ درجہ اوّل سے درجہ سوئم میں تبادلے کے باعث مشاہرہ بھی کم ہو گیا تھا۔ غم اُستاد کو مشاہرہ کا نہیں اُس ذلت کا تھا جو تیسرے درجے میں تبادلے کے باعث اُستاد جیسے پایہ کے گلوکار کو سہنا پڑی تھی۔ بقول استاد:

اس نوکری سے بہتر میں مزدوری کرنا پسند کروں گا۔ شاید اُستاد عجلت میں کوئی قدم اٹھا بھی لیتے مگر اُستاد کے قدردانوں اور نیازمندوں نے اُستاد کو اس عمل سے باز رکھا اور اُستاد کی ہر ضرورت کو اپنی ضرورت جان کر پورا کرنے میں ذرا بھی کسر نہ چھوڑی۔

اُنہیں دنوں اُستاد دامن آل انڈیا مشاعرے کے سلسلے میں دہلی گئے جو تاریخ کا یادگار مشاعرہ کہلاتا ہے۔ سامعین کی اکثریت پاکستان سے ہجرت کرنے والے شارنارتھیوں پر مشتمل تھی۔ جب اُستاد نے غزل شروع کی تو اُستاد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور پورا ہال دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا:

بھاویں مونہوں نہ کہیے پر وچوں وچی
کھوئے تسی وی او، کھوئے اسی وی آں
ایہناں آزادیاں ہتھوں برباد ہونا
ہوئے تسی وی او، ہوئے اسی وی آں
کجھ امید اے زندگی مل جائے گی
موئے تسی وی او، موئے اسی وی آں
جیوندی جاں ای، موت دے منہ اندر
ڈھوئے تسی وی او، ڈھوئے اسی وی آں
جاگن والیاں رج کے لٹیا اے
سوئے تسی وی او، سوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے
روئے تسی وی او، روئے اسی وی آں

مشاعرے کی انتظامیہ نے بھارت کے وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے مشاعرے کی صدارت کے لیے پُرزور درخواست کی تھی مگر پنڈت جی نے صاف صاف لفظوں میں معذرت کرتے ہوئے فرمایا:

”بھئی میں تو اس بات کا قائل ہوں جس کا کام اُسی کو ساجھے، دوسرا کرے تو بیوقوف باجے۔ سیاست کے حوالے سے تقریب کی صدارت کرنا تو بنتا ہے مگر جوش صاحب، فیض صاحب، فراق صاحب، خمار صاحب، زار صاحب، جگر صاحب، بیدی صاحب، مخدوم صاحب، محروم صاحب جیسے پایۂ کے شعراء کی موجودگی میں مشاعرے کی صدارت کرنا قطعی نامناسب ہے۔ میں ایک سامع کے طور پر حاضر ہو جاؤں گا۔“

پنڈت جی نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے بغیر کسی پروٹوکول بروقت پہنچ کر مشاعرے کے شرکاء کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اگلی رو میں بیٹھے پنڈت جواہر لال نہرو وزیرِاعظم ہند ہر اچھے شعر پر نہ صرف زبانی بلکہ تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے مگر اُستاد دامن کے کلام نے پنڈت جی کو اتنا متاثر کیا کہ کئی بار فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر پنڈت جی نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔

مشاعرے کے اختتام پر تمام شعراء کو باری باری مبارک باد دینے، حال احوال دریافت کرنے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو اُستاد دامن کا ہاتھ تھام کر ایک گوشے میں لے گئے اور اپنے ہاتھوں میں اُستاد صاحب کا ہاتھ تھام کر بولے:

”واہ، واہ دامن صاحب واہ، آپ نے تو کمال کر دیا۔ حالات و واقعات کو کس قدر خوبصورتی سے اشعار کا جامہ میں قلم بند کیا ہے کہ مضبوط سے مضبوط اعصاب کا مالک انسان بھی خود پر قابو رکھنے میں ناکام رہا۔ مجھے دیکھئے میں ایک سیاستدان ہوں۔ اس طرح کے حالات کا بطور وزیرِاعظم مجھے اکثر سامنا رہتا ہے مگر آج (جیب سے رومال نکال کر دکھلاتے ہوئے) مجھے بھی کئی بار آنسو صاف کرنا پڑے (یہاں تک پہنچ کر پنڈت جی نے خیالات والفاظ میں ربط پیدا کرتے ہوئے لمبا سانس لے کر وقفہ دیا اور اُستاد صاحب کا گرمجوشی سے ہاتھ دباتے ہوئے بولے) اُستاد صاحب! ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ایک بات عرض کروں:

”جی جی، شوق سے فرمایئے“ (اُستاد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا)

”اُستاد صاحب! آپ جیسے نابغۂ روزگار لوگ، روز روز پیدا نہیں ہوتے۔“

”وزیرِاعظم صاحب! آپ کی ذرّہ نوازی ہے وگرنہ میں بہت ہی ادنیٰ، بہت ہی عاجز اور بہت ہی ناچیز بندہ ہوں۔“

(اُستاد کی انکساری دیکھ کر پنڈت جی کے لہجے میں گرمجوشی نظر آ رہی تھی۔ پنڈت جی نے اپنے چہرے کو اُستاد صاحب کے کانوں کے نزدیک لاتے ہوئے آہستہ سے کہا)

”آپ یہیں ٹھہر جایئے نا، آپ کے قیام و طعام کے تمام مراحل چٹکی بجاتے طے ہو جائیں گے۔ کوٹھی، بنگلہ، گاڑی، نوکر چاکر، آپ کے آگے پیچھے ہوں گے“ (وزیرِاعظم صاحب کی پیشکش کے بعد بلاتوقف اُستاد دامن گویا ہوئے)

”وزیرِاعظم صاحب! آپ کی جانب سے عزت افزائی کے لیے سراپا سپاس ہوں (خاموشی کا وقفہ) ہم فقیر لوگ مٹی کے اسیر ہوا کرتے ہیں۔ لاہور شہر میرے خون بلکہ میری روح میں رچا بسا ہے۔ وہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے اور وہی میرا مسکن ہے اُسے چھوڑنا، اُس سے بے وفائی کرنا میرے بس میں نہیں۔“

(دامن صاحب کے دوٹوک جواب کے بعد وزیرِاعظم جواہر لال نہرو نے اُستاد کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے خانصاحب بڑے غلام علی خان کا حال احوال دریافت کیا تو اُستاد دامن نے تمام حالات من و عن اُن کے گوش گزار کر دیئے جسے سن کر پنڈت جواہر لال نہرو بہت دلگرفتہ ہوئے۔ کچھ دیر سکتے میں رہنے کے بعد پنڈت جی نے اپنے پرسنل سیکرٹری ایم او میتھائی کو بلا کر خاص ہدایات دینا شروع کر دیں۔ چند دن بعد خانصاحب بڑے غلام علی خان جب دلی کے پالم ہوائی اڈے پر جہاز سے باہر آئے تو ہندوستان کے وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو بہ نفسِ نفیس خانصاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

”مدّے پر آیئے، مدّے پہ، بشرط نہرو اور گاندھی سے جی بھر گیا ہو تب!“ (شکور صاب نے لمبی جمائی لیتے ہوئے بیزاری کا اظہار کیا)

”اماں یہ منہ پھاڑ پھاڑ کے جمائیاں تو اس طرح لے رہے ہو جیسے نئے نویلے دولہا لیا کرتے ہیں۔ چھری تلے دم لیجیے۔ مدّے پر بھی آئیں گے اور مدعی پر بھی!“

”یہ مدعی کہاں سے در آیا بیچ میں؟“ (نورو چائے والا ہاتھوں کو نچاتے ہوئے سراپا سوال بن گیا)

”اماں! آپ تو اس طرح پیچ و تاب کھا رہے ہیں جیسے رائے بہادر دیوی پرساد کے بجائے آپ کے گھر پہ ڈاکہ پڑ گیا ہو!“

”ڈاکہ، وہ بھی رائے بہادر دیوی پرساد کے گھر؟“

”آپ کے خیال میں صرف مال و دولت ہی لٹنے پر ڈاکہ پڑا کرتا ہے؟“ (خلیفہ عبدالرشید کے جملے نے محفل میں سنسنی دوڑا دی)

”دیکھو خلیفہ ہر وقت بقراط بننا کسی طور زیب نہیں دیتا صاف صاف بتلاؤ ماجرا کیا ہے؟“

”میرا منہ نہ کھلوایئے، ایک، دو نہیں تینوں صاحبزادوں نے باری باری رائے بہادر دیوی پرساد کے بیٹے بدری پرساد سے منہ کالا کیا۔ وہ بھی اُنہیں کے مکان میں۔“

”کیا اول فول بک رہے ہو خلیفہ، جانتے ہو کہ رائے بہادر دیوی پرساد کس مقام و مرتبے کی آدمی ہیں؟“

''یہ بات ہمیں سمجھانے کے بجائے اُن من چلوں کو سمجھانی چاہیے تھی جو ہیڈ ماسٹر حفیظ صاحب کے ساتھ دست درازی کرنے کے بعد، پناہ کے لیے رائے بہادر کے بیٹے بدری پرساد کے پاس جا پہنچے اور دوستی کے نام پر ایک رات کی پناہ مانگی۔ رائے صاحب کے بیٹے نے تینوں لفنگوں کو نہ صرف پناہ دی بلکہ خاطر مدارت میں کسی طرح کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ رات کے پچھلے پہر چھوٹے پیرزادہ نے دست درازی کا آغاز کیا باقی دونے بھی چاقو کی نوک پر باری باری ہوس پوری کرنے کے بعد لڑکے کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پیر باندھے اور رات کی سیاہی میں رفو چکر ہو گئے۔ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ تینوں لفنگے کافی دن سے موقع کی تلاش میں تھے۔ اُس رات بھی خاص منصوبے کے تحت رائے بہادر کے گھر پناہ کی غرض سے گئے تھے۔

''بُرا ہوا، بہت بُرا ہوا، اس کے بعد جو ہوگا اُسے سوچ کر ہی ہمیں تو ہَول آ رہا ہے۔''

''ہوگا نہیں، ہو رہا ہے۔ پیر صاحب کی گاڑی کا جلنا، دن میں تین تین بار پولیس کا بڑے پیر صاحب کے گھر چکّر لگانا، باقی دونوں لڑکوں کے گھر کے تمام مَردوں کو گرفتار کر لینا'' (خلیفہ عبدالرشید نے چھکّن میاں کی تشویش کو دو چند کر دیا) محفل میں شریک دیگر لوگ بھی آنے والے طوفان کی بابت اپنی اپنی فکر مندی کا اظہار کر رہے تھے۔''

رات کے پچھلے پہر رائے بہادر کے گھر سے منہ کالا کرنے کے بعد تینوں لفنگے دہلی سے غازی آباد تک طوفان میل میں سفر کر کے اُتر گئے۔ اُس کے بعد میرٹھ جانے والی بس میں بیٹھے مگر مودی نگر میں اُتر کر مراد نگر تک کا سفر ٹانگے میں طے کیا جہاں سے چھکڑے کے ذریعہ یہ لوگ میرٹھ پہنچے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سر دھنے جانے کا پروگرام بنا۔ سر دھنے میں بڑے پیر صاحب کی چھوٹی بہن بیاہی ہیں۔

بھتیجے کو اچانک دیکھ کر پہلے تو پھوپھی حیران ہوئی مگر جب بھتیجے نے پھوپھی کو بتلایا کہ ہماری کلاس سکول کی بس میں اپنے اُستادوں کے ساتھ تاریخی گرجا گھر دیکھنے آئی ہے۔ تینوں دوست اس بات پر متفق تھے کہ بلا سوچے سمجھے یہاں آ تو گئے ہیں مگر زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا کسی طور مناسب نہیں۔ کسی بھی وقت بڑے پیر صاحب یا پولیس کا چھاپہ پڑ سکتا ہے۔

صبح سویرے پھوپھی کے گھر پُر تکلف ناشتہ کرنے کے بعد تینوں دوست گرجا گھر جانے کا کہہ کر نکل آئے۔ اب مسئلہ تھا کہ جایا کہاں جائے۔ کافی بحث و تکرار کے بعد طے ہوا کہ دن کا وقت گرجا گھر کی سیر میں گزارتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں پچھلی رات کی طرح گاڑیاں ادل بدل کر سفر جاری رکھا جائے مگر ایک سوال پہاڑ کی مانند اُن کے سامنے کھڑا تھا کہ جایا کہاں جائے؟

مغل حکمرانوں نے انگریز فوجیوں کی چیرہ دستی سے بچنے کے لیے مغربی ممالک کی پرائیویٹ فوجی کمپنیوں کو اپنی حفاظت کے لیے مستقل طور پر ملازمت میں لے لیا تھا۔

فرانس کے رہنے والے **Walter Reinhard Sombve** کی ذاتی فوجی کمپنی کو شاہجہاں کے دورِ حکومت میں ملازم رکھا گیا۔

اس طرح کی فوجی کمپنیوں کے ملازم اور مالک اکثر دل بہلاوے کے لیے دہلی کے چاندنی چوک کے نزدیک چاوڑی بازار میں طوائفوں کے کوٹھے پر گانا سننے جایا کرتے تھے۔ اُن دنوں چاوڑی بازار میں ایک نوخیز طوائف فرزانہ کا بہت شہرہ تھا۔ والٹر بھی فرزانہ کی شہرت سُن کر اُس کے کوٹھے پر جا پہنچا اور پہلی نظر میں ہی فرزانہ کی شوخ و شنگ اور چنچل اداؤں پر فریفتہ ہو بیٹھا۔

کچھ عرصہ تک بات نام و پیام اور تحفے تحائف تک محدود رہی مگر جب یہ معلوم پڑا کہ ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' تو والٹر اور فرزانہ نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا مگر کوٹھے کی مالکہ شمشاد بیگم اُن کے راستے کی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ لہٰذا رات کی سیاہی میں دونوں نے دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

روہیل کھنڈ، آگرہ، بھرت پور سے ہوتے ہوئے بادشاہ شاہ عالم کی مدد سے ریاست سردھنا پہنچے۔

راستے میں والٹر کو کئی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا جس میں فرزانہ نے والٹر کے شانہ بشانہ بہادری کے جوہر دکھائے۔

سردھنا پہنچ کر والٹر اور فرزانہ نے سردھنا کے نواب سید امجد علی کے تعاون سے شادی کرنے کے بعد والٹر نے ریاست کی حفاظت کے فرائض سنبھال لیے اور فرزانہ جو شادی کے بعد بیگم سمبر بن گئی تھی اُس نے نواب کی معاونت کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے۔

بیگم سمبر ایک نڈر، بہادر اور ذہین خاتون تھی جس کے سبب نواب سید امجد علی نے ریاست کے بیشتر انتظامی امور اُسے سونپ دیے۔ بیگم سمبر کی نواب آف سردھنا سے وفاداری اور خلوص نے نواب صاحب کو اس حد تک متاثر کیا کہ بیگم سمبر نواب صاحب کی منہ بولی بیٹی کے مقام تک جا پہنچی۔ ۱۷۷۳ء میں نواب صاحب نے اپنی وفات سے قبل ریاست سردھنا کے ملکیتی حقوق والٹر اور بیگم سمبر کے نام منتقل کر دیئے۔

۱۷۷۸ء میں والٹر کا انتقال ہوا تو بیگم سمبر نے نہ صرف ریاستی امور احسن طریق پر انجام دیے بلکہ چار ہزار نفری پر مشتمل ریاست کی فوج کی کمان بھی سنبھال لی۔

شوہر کے انتقال کے تین سال بعد یعنی ۱۷۸۱ء میں بیگم سمبر نے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی اور اپنا نام جوہنّا نوبلس رکھ لیا۔

شوہر کی وفات کے چالیس سال بعد تک بیگم جوہنّا نوبلس بطور حکمران ریاست سردھنا کے امور انجام دیتی رہیں۔ ۱۸۲۲ء میں جوہنّا نوبلس نے اپنے شوہر کی یاد میں کیتھولک عقیدے کے تیئسویں پوپ جان پیٹری سلکا کے نام پر چرچ آف سردھنا کی بنیاد رکھی۔

باقی صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ کیجیے

نیلا گلدستہ

(میکسیکن کہانی)

- ترجمہ -

ظفر قریشی (نیویارک)

مصوری میں ماورائے حقیقت خیال کے اثر کا اظہار نسبتاً آسان ہوتا ہے اور پکاسو کے دور سے قبل کے پیرس میں مصوری یا پینٹنگ کے شعبوں میں (Surrealism) ایک باقاعدہ مہم کے طور پر داخل ہوا اور کئی برس راج کرتا رہا۔ اس دور میں جو لکھاری پیرس میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں ماورائے حقیقت اثرات کو اپنی کہانیوں میں شامل کرنا شروع کیا اور جلد ہی یہ تحریک مصوری سے نکل کر ادب میں داخل ہو گئی۔ لاطینی امریکہ کے معروف مختصر کہانیاں لکھنے والے دانشور اوکتاویو پاز نے اپنی پیرس میں رہائش کے دوران جو کہانیاں لکھیں ان میں ماورائے حقیقت واقعات کا اثر نمایاں تھا۔ اوکتاویو پاز کی کہانی ''نیلا گلدستہ'' اس دور کی نمائندہ کہانی قرار دی جاتی ہے اور آج بھی پڑھنے والے پر جھرجھری طاری کر دیتی ہے۔ یہ کہانی آج بھی کس قدر اثر انگیز ہے یہ دیکھنے کے لیے اسے پڑھنا لازم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ترجمے میں یہ اثر موجود ہے یا نہیں ہے، اس کا فیصلہ اردو میں اس کہانی کو پڑھنے والے ہی کر سکیں گے۔

☆

جب میں نیند سے جاگا تو میرا پورا لباس پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ فرش پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا اور سرخ ٹائلوں سے گرم گرم بھاپ اٹھتی دکھائی دے رہی تھی۔ چھت سے ننگا بلب لٹکا ہوا تھا اور اس کی چکا چوند روشنی میں ایک پتنگا دیوانہ وار اس کے گرد منڈلا رہا تھا۔ دو دیواروں سے منسلک رسیّوں کا بستر (Hammock) چھوڑ کر میں نیچے اترا اور ننگے پیر چلتے ہوئے کمرہ پار کیا۔ میں محتاط تھا اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ غیر ارادی طور پر میں کسی بچھو پر پیر رکھ دوں کیونکہ فرش اچانک ٹھنڈا ہو گیا تھا اور یہ ممکن تھا کہ بچھو اس ٹھنڈ سے محفوظ ہونے کی غرض سے نکل آئے۔ میں کھڑکی کے پاس کچھ لمحوں کے لیے کھڑا ہو گیا۔ کھیتوں سے آنے والی مسحور کن ہوا میں سانس لیتا رہا۔ میرے کان ان زنانہ آوازوں کی جانب متوجہ تھے جو رات میں جاگ اٹھتی ہیں۔ پھر میں منہ دھونے کے لیے واش اسٹینڈ (Wash Stand) کی طرف بڑھا اور تام چینی کے لگن میں پانی انڈیل کر ایک تولیہ گیلا کیا اور اسے میں نے اپنے سینے اور ٹانگوں پر رگڑ رگڑ کر پھیرا اور جب کچھ خشک ہو گیا تو کپڑے چھان پھٹک کر پہنے۔ میں نے ''چھان پھٹک'' اس لیے کہا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انجانے میں ایسے کوئی کپڑے پہن لوں جن میں پہلے سے کوئی کیڑا اچھا بیٹھا ہو۔ کپڑے پہن کر میں اچھلتا کودتا، سبز رنگ کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوٹل کے نگراں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو دروازے سے لگ کر بیٹھا تھا۔ اس بے چارے کی ایک آنکھ خراب تھی۔ یہ ایک خاموش طبع اور پیچھے رہنے والا آدمی تھا جو سرکنڈوں کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔

اس نے اپنی اچھی آنکھ سے مجھے دیکھا ''جناب۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' بیٹھی ہوئی آواز میں وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''میں کچھ چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں'' میں نے کہا ''کمرے کے اندر بہت گرمی ہے، میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا۔''

''مگر باہر، اب تک تو ہر چیز بند ہو چکی ہوگی۔ اور پھر یہاں گلیوں میں روشنی بھی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر آپ کمرے ہی میں رہیں۔''

میں نے اپنے کندھے اچکائے اور بڑبڑایا: ''میں ابھی واپس آتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے میں تاریکی میں نکل آیا۔ ابتدا میں تو مجھے بالکل ہی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ٹٹولتے ہوئے ہی سہی میں پتھریلی گلی میں آگے بڑھتا گیا۔ ایک جگہ رک کر میں نے سگریٹ جلائی۔ اچانک سیاہ بادلوں کے پیچھے سے چاند نکل آیا۔ سامنے چونے سے سفید کی ہوئی دیوار چمک رہی تھی۔ یکا یک طاری ہونے والی چٹی سفیدی نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا میرے قریب سے گزر گیا۔ میں املی کے درختوں کی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ رات پتوں اور کیڑوں مکوڑوں کی سرسراہٹ سے جاگ اٹھی تھی۔ لمبے سرکنڈوں کے درمیان جھینگر دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ میں نے نظریں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ستارے بھی سارے کے سارے باہر آ گئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری کائنات اشاروں کنایوں کا ایک مہیب اور مربوط نظام ہے اور بلند و بالا اجسام باہم ہم کلام ہیں۔ میرے اپنے اقدام، جھینگر کی جھائیں جھائیں، ایک ستارے کا ٹوٹنا کائنات کی گفتگو میں عرض و قفے اور جملے ہیں اور اس عجیب و غریب زبان کے ٹکڑے ہیں۔ میں اس زبان کا یک حرفی لفظ ہوں۔ لیکن وہ لفظ کیا ہے؟ کون وہ لفظ بول رہا تھا؟ اس کا مخاطب کون تھا؟ میں نے اپنے سگریٹ کا ٹوٹا گلی کے فٹ پاتھ کی جانب اچھال دیا۔ جلتا ہوا سگریٹ نصف دائرہ بناتا ہوا ایک طرف جا گرا اور ایک ننھے سے ستارے کی طرح اس کی چنگاریاں سارے میں پھیل گئیں۔

میں کافی دیر تک آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ میں خود کو محفوظ اور آزاد محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ عظیم ہونٹ واضح طور پر مجھے خوشی کا پیغام دے رہے تھے۔ رات آنکھوں کا باغیچہ تھی یا غالیچہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب میں ایک گلی پار کر رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ ایک دروازے سے کوئی نکلا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے چلتے ہوئے اپنی رفتار تیز کر دی۔ لمحے بھر میں پتھر پر جوتے کی ایڑھی کی رگڑ سنائی دی۔ گرم پتھر پر یہ رگڑ کچھ زیادہ ہی واضح تھی۔ اب میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا گو مجھے احساس تھا کہ وہ سایہ جو میرے تعاقب میں تھا اب میرے قریب آ گیا ہے۔ میں نے دوڑنا چاہا۔ میں دوڑ نہیں سکا۔ میری ٹانگیں میرا ساتھ نہیں دے

رہی تھیں۔ میں رُک گیا۔ اس سے قبل کہ میں اپنا دفاع کرسکتا مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے میری پشت پر چاقو کی نوک رکھ دی ہے اور ایک نرم آواز مجھ سے کہہ رہی تھی ’’حضرت۔ آپ ہلے تو اپنی جان سے جائیں گے۔‘‘

میں نے پلٹے بغیر پوچھا: ’’تم کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’تمہاری آنکھیں حضرت!‘‘ وہ بولا۔ اس کی آواز غیر معمولی طور پر نرم تھی جیسے وہ یہ مطالبہ کرتے ہوئے شرمندہ ہو۔

’’میری آنکھیں؟ تم میری آنکھیں لے کر کیا کرو گے؟ دیکھو۔ میرے پاس تھوڑے پیسے ہیں، یہ تم لے لو۔ یہ چھوٹی رقم کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ میں اپنے پاس موجود ہر چیز دینے کو تیار ہوں۔ مجھے قتل نہ کرو۔ جانے دو۔‘‘

’’حضرت۔ آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو جان سے نہیں ماروں گا۔ مجھے صرف آپ کی آنکھوں کی ضرورت ہے!‘‘

’’تم میری آنکھیں لے کر کیا کرو گے؟‘‘

’’یہ میری محبوبہ کی خواہش ہے۔ وہ نیلی آنکھوں کا ایک گلدستہ چاہتی ہے۔ اس علاقے میں نیلی آنکھوں والے لوگ بہت کم ہیں۔‘‘

’’میری آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔ ان کی رنگت ہلکی بادامی ہے۔ تم جس رنگ کی آنکھیں چاہتے ہو میری آنکھیں اس سے بالکل مختلف ہیں۔‘‘

’’جناب۔ مجھے بے وقوف نہ بنائیں۔ میں جانتا ہوں آپ کی آنکھیں نیلی ہیں۔‘‘

’’دیکھو بھائی۔ تم عیسائی ہو اور میں بھی عیسائی ہوں۔ تم اس طرح میری آنکھیں نہیں نکال سکتے۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’آپ اتنے ڈرپوک نہیں ہیں۔‘‘ نامعلوم شخص کا لہجہ اس مرتبہ سخت تھا۔

’’گھوم جاؤ!‘‘ اس نے حکم دیا۔

میں پلٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ایک پستہ قد اور منحنی سا آدمی کھڑا ہے۔ اس کے سر پر خالص میکسیکن انداز کی ٹوپی (Sombrero) ہے جو اس کا نصف چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک لمبا چھرا (Machete) ہے جو چاندنی میں چمک رہا ہے۔

’’ماچس کی تیلی جلا کر اپنے چہرے کے سامنے رکھو!‘‘ اس شخص نے پھر حکم دیا۔

میں نے ایک تیلی جلا کر اپنے چہرے کے سامنے رکھی تاکہ وہ میری آنکھیں دیکھ سکے۔ تیلی کا شعلہ میری آنکھوں سے اتنا قریب تھا کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس پر اس نے اپنی انگلیوں سے میری پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اب تک وہ بھی میری آنکھیں نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس مرتبہ وہ پنجوں کے بال کھڑے ہو کر میری آنکھیں بغور دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ماچس کی تیلی ختم ہونے کو آ گئی تھی اور میری انگلیاں جل رہی تھیں۔ میں نے جلی ہوئی تیلی ہاتھ سے چھوڑ دی۔

’’کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں کہ میری آنکھوں کا رنگ نیلا نہیں ہے۔‘‘

’’صاحب تم بہت چالاک ہو۔ ماچس کی ایک اور تیلی جلاؤ!‘‘ اس شخص نے پھر حکم دیا۔

میں نے ایک تیلی اور جلائی اور اس کا شعلہ اپنی آنکھوں کے قریب لے گیا۔ اس نے میری آستین پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا کہ ’’گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔‘‘

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے میرے بال مٹھی میں پکڑ کر میرے سر کو پیچھے کی طرف کھینچا اور تقریباً مجھ پر سوار ہو کر میری آنکھیں گھور کر دیکھتا رہا۔ اس کا چھرا میرے چہرے کے قریب آتا گیا حتیٰ کہ چھرے کی نوک میری ایک پلک سے ٹکرانے لگی۔ اب میری آنکھیں بند تھیں۔

’’اپنی آنکھیں کھولو۔ پوری کھولو!‘‘ اس نے چیخ کر کہا۔

میں نے آنکھیں کھولیں۔ اس نے ماچس کی ایک اور تیلی جلائی اور اس کا شعلہ میری پلکوں کے اتنا قریب لے گیا کہ پلکوں کے بال جلنے لگے۔

اچانک اس نے میرے بال چھوڑ دیئے۔ ’’تم صحیح کہہ رہے تھے صاحب۔ تمہاری آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔ مجھے معاف کر دو!‘‘

یہ کہہ کر اس نے چھلانگ لگائی اور گلی میں غائب ہو گیا۔

میں اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھپا کر دیوار کے سہارے سکڑ کر کھڑا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں وہاں سے ہٹا اور سنسان گلیوں میں سے بھاگتا ہوا آخرکار اس چوک میں پہنچا جس میں میرا ہوٹل تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے دروازے پر ہوٹل کا منیجر ابھی تک وہیں بیٹھا تھا جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اگلے دن میں نے وہ گاؤں ہی چھوڑ دیا۔

جوتی

غالب دہلی اور لکھنؤ کی اردو کے فرق پر گفتگو کر رہے تھے۔۔

کسی نے پوچھا؛ حضور میرا قلم صحیح ہے یا میری قلم؟

مرزا نے کہا؛ عورت لکھے تو میری قلم، مرد لکھے تو میرا قلم.

کسی نے پوچھا؛ جوتا صحیح ہے یا جوتی؟

مرزا تو یہی کہیں گے؛ مرد پہنے تو جوتا، عورت پہنے تو جوتی ایک صاحب نے کہا۔

مرزا نے جواب دیا؛ جی نہیں زور سے پڑے تو جوتا آہستہ پڑے تو جوتی۔

جھیل کنارے نیاگرا

پروفیسر افتخار یوسف

(راولپنڈی)

سال ۲۰۱۳ء میں جب پہلی دفعہ میَں ، میری بیگم اور میرا بیٹا سعود نیاگرا آبشار دیکھنے کے بعد ٹورانٹو لوٹ رہے تھے تو کینیڈا میں ہمارے میزبان عمران احمد اور ڈاکٹر فرح احمد نے بطور خاص وہ راستہ لیا جو Niagra on the Lake نامی چھوٹے سے شہر سے گزرتا تھا۔ بے مثال قدرتی حسن اور انسانی ذوق زیبائش کے امتزاج کا شاہ کار یہ قصبہ دل کو ایسا بھایا کہ پچھلے سال جولائی میں جب دوبارہ نیاگرا آبشار دیکھنے گئے تو ٹورانٹو واپسی پر قصداً نیاگرا شہر والا راستہ اختیار کیا۔ اس دفعہ ہمارے قافلے میں سعود کی بیگم رومیلا بھی شامل تھیں۔

کینیڈا کے صوبے اونٹیریو کا یہ خوب صورت ترین شہر جھیل اونٹیریو کے جنوب میں دریائے نیاگرا کے دہانے پر واقع ہے۔ تاریخ کے مطابق حکومتِ برطانیہ نے ۱۷۸۱ء میں اس شہر کی تعمیر کے لیے مسی ساگا قبیلے سے دریائے نیاگرا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ زمین کی چھے میل لمبی پٹی کپڑوں کے تین سو جوڑوں کے عوض خریدی۔ ۱۷۹۲ء میں امریکہ میں برطانیہ کے وفاداروں کے لیے یورپی طرز پر تعمیر کیے گئے اس شہر کو بالائی کینیڈا کے صوبے اونٹیریو کا پہلا صدر مقام بنا دیا گیا۔ یوں اسے جزیرہ نما نیاگرا کے اہم ترین معاشی، عدالتی اور انتظامی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ نئے تعمیر کیے گئے اس شہر کا نام نیوآرک رکھا گیا۔ ۱۸۱۲ء میں امریکیوں نے اس برطانوی بستی پر حملہ کیا اور اسے نیست و نابود کر دیا۔ نیوآرک کے مدفن سے جھیل کنارے نیاگرا (Niagra on the Lake) نے جنم لیا۔

کینیڈا کے صوبے اونٹیریو میں عمدہ شراب کی کشید کے مرکز کے طفور پر جانا جانے والا جھیل کنارے نیاگرا شہر نیاگرا آبشار سے تقریباً ۲۳ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آبشار سے نیاگرا جاتے ہوئے دائیں جانب دریائے نیاگرا آپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جب کہ بائیں طرف حدّ نگاہ تک انگور کے باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان باغات کا ’’بوتل بند ثمر‘‘ خواص و عوام تک پہنچانے کے لیے باغات کے اندر جگہ جگہ شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ سڑک کے کنارے بعض مقامات پر کشید کار کمپنیوں کی جانب سے دعوت نامہ قسم کے اشتہارات نظر آتے ہیں، جن پر کچھ اس مفہوم کا پیغام درج ہوتا ہے ’’ہماری کمپنی کو اونٹیریو (صوبے) میں سب سے بڑھیا شراب بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ ہمارے ہاں آیئے اور ہمارے باغات کی سیر کیجیے۔ ہم بلا معاوضہ اپنے بے مثل مشروب سے آپ کی تواضع کریں گے۔‘‘

ہم نیاگرا آبشار سے نیاگرا شہر کی طرف روانہ ہوتے ہیں، تو دو سال پہلے دیکھے گئے مناظر کی فلم چل پڑتی ہے۔ وہی سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دریائے نیاگرا، وہی انگوروں کے باغات کا لامتناہی سلسلہ، فضا میں وہی شرابی بخارات کی بُو، وہی سیّاحوں کو لاتی، لے جاتی بڑی بڑی سیّاحتی بسیں اور وہی سڑک کی دونوں جانب پھولوں سے آراستہ پارکوں کو زندگی کی رونق دیتے ہوئے مرد و زن، پیر و جواں۔ پھر اچانک منظر بدل جاتا ہے۔ آبشار سے نیاگرا شہر تک کا راستہ ٹوٹی پھوٹی سڑک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انگوروں کے باغات کی جگہ حدّ نگاہ تک دھان کے کھیت نظر آنے لگتے ہیں اور میرے سفر کا رخ چناب کنارے اپنے شہر رسول نگر (شہر کا سابقہ میرے آبائی قصبے کا شناختی نشان ہے) کی جانب مڑ جاتا ہے۔ (سفر کے دوران میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے جب گاڑی کوئی دوسرا ڈرائیو کر رہا ہو تو میں آنکھیں بند کر کے مختلف سمتوں کی مسافتوں پر چل پڑتا ہوں) دھان کے کھیت ختم ہوتے ہیں تو میَں اپنے آبائی گھر جانے کی بجائے شہر کے شمالی داخلی راستے پر واقع دربار بابا گلاب شاہ (مشہور پنجابی شاعر دائم اقبال دائم کے یہاں بابا گلاپ شاہ کا بہت ذکر ملتا ہے) پر مختصر قیام کے بعد دریائے چناب کا رُخ کرتا ہوں۔ بیلے کے علاقے مین داخل ہوتا ہوں تو رُت بدل جاتی ہے۔ چہار سو مٹر کے کھیت ہیں (مٹر رسول نگر کی سب سے بڑی نقد آور فصل ہے) لگتا ہے شہر کے سبھی مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے مٹر چننے میں مصروف ہیں۔ وہ مٹر چُن چُن کر اپنے کندھوں سے لٹکی کپڑے کی جھولیوں میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ مزے مزے سے ایک دوسرے کو قصے سناتے ہیں، گیت گاتے ہیں، چٹکلے چھوڑتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور اپنی جھولیاں بھر جانے پر انہیں پاس رکھی بوری میں اُلٹ دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مشقت نہیں کر رہے بلکہ پکنک منا رہے ہیں۔ میں اُن سب کو پیچھے چھوڑ کر دریا کے کنارے پر پہنچ جاتا ہوں۔ سال کے اُن دنوں میں دریا سکڑ کر ایک نالے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دریا کے پاٹ کا زیادہ حصّہ خشک ہو جاتا ہے۔ کنارے اور سکڑے ہوئے دریا کے پانی کے درمیان چمک دار ریت کا وسیع ساحلی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ میں دریا کے پانی تک پہنچنے کے لیے کنارے سے اُتر کر ریت پر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری ہوائی چپلیں ریت میں دھنس جاتی ہیں۔ میں زور لگا کر پاؤں اُٹھاتا ہوں تو چپلوں کی اُڑائی ہوئی ریت میرے سر اور کپڑوں پر آ گرتی ہے۔ میں اپنی چپلیں اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتا ہوں، لیکن جاتی ہوئی سردیوں کے دنوں میں بھی ریت اتنی گرم ہے کہ پاؤں جلنے لگتے ہیں۔ میں کبھی جوتے پہن کر اور کبھی ہاتھ میں پکڑ کر چلتے چلتے پانی تک پہنچ جاتا ہوں۔ اُن دنوں میں دریا پایاب ہو جاتا ہے۔ میں پانی میں پاؤں رکھتا ہوں تو ایک عجیب سی ٹھنڈک میرے جسم و جاں میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہ چناب کا جادو ہے۔ اس کی ریت جلاتی ہے اور اس کا پانی جلن پر مرہم رکھتا ہے۔ چنھاں پیر (چناب کنارے رہنے والے چناب کو پیر و مرشد کا مقام دیتے ہیں) بڑا ظالم ہے۔ چنھاں پیر بڑا مہربان ہے۔ یہ سوہنیوں کو غرقاب کر کے اُن کی عاشقی کو اَمر کر دیتا ہے۔ میں آنکھیں بند کیے چنھاں بادشاہ کے رُوبرو کھڑا ہوں، جب اچانک جھٹکے سے میری آنکھ کھُل جاتی ہے۔ سعود سیٹ پر بیٹھی اپنی امّاں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: امّی! آپ کے میاں نیاگرا کی ہوا میں بسی شراب کی بُو سے ٹُن ہو

گئے ہیں۔ اگر انہوں نے سیٹ بیلٹ نہ باندھی ہوتی تو ڈیش بورڈ سے ٹکرا گئے ہوتے۔ میں اُسے کیسے بتاؤں کہ نیا گرا کی شراب میں وہ نشہ کہاں جو چناب کے بہتے ہوئے ٹھنڈے پانی میں ہے۔

ہم جھیل کنارے نیا گرا شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔ شہر کی مرکزی دو رویہ سڑک ’’کوئین سٹریٹ‘‘ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے ہم شہر کا نظارہ کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر چل پڑتے ہیں۔ کوئین سٹریٹ یہاں کی کاروباری سرگرمیوں کا محور ہے، مگر یہ کاروباری سے زیادہ سیّاحتی مرکز لگتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف فُٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ اور سڑک کے درمیان ڈیوائڈر میں خوش رنگ پھولوں کے قطعات ہیں جو پوری کوئین سٹریٹ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ صد رنگ پھولوں سے سجی کوئین سٹریٹ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کے معماروں نے پہلے اس قطعۂ زمین پر عمدہ ترین اقسام کے پھولوں کے باغات اُگائے ہوں گے اور حسبِ ضرورت جگہ خالی کر کے وہاں عمارتیں تعمیر کی ہوں گی۔ کوئین سٹریٹ میں بلند و بالا عمارتیں نہیں ہیں۔ یہاں کے یورپی طرز کے سٹورز، ریسٹورنٹ، واین بارز اور ہوٹل دیکھ کر لگتا ہے کہ اس شہرِ جمال کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارتیں اس کے قدرتی حسن پر غالب نہ آ جائیں۔

میرے قافلے کے باقی افراد اپنے اپنے ذوق اور طلب کے مطابق کوئین سٹریٹ کا نظارہ کر رہے ہیں۔ وہ سٹورز میں داخل ہوتے ہیں۔ شوکیسوں میں سلیقے سے سجائی ہوئی اشیا کی نفاست اور خوب صورتی کی داد دیتے ہیں اور بغیر کچھ خریدے ’’خوب تر‘‘ کی تلاش میں باہر نکل آتے ہیں۔ ہمارے میزبانوں نے پہلے سے ہی تنبیہ کر رکھی ہے کہ یہاں کی اشیا صرف دیکھنے کی چیز ہیں۔ خریدنے کی نہیں۔ سیّاحوں کی بدولت کوئین سٹریٹ پر میلے کا سماں ہے۔ میرے جیسے کئی شوقیہ فوٹو گرافر ایسی جگہوں کی تلاش میں ہیں جہاں سے اس خوب صورت شہر کے حسن و جمال کو بہتر زاویوں سے کیمرے میں محفوظ کیا جا سکے۔ کوئین سٹریٹ پر وہ ہوٹل بھی موجود ہے جہاں برطانوی شہزادے چارلس نے قیام کیا تھا۔ یہ ہوٹل اُسی شہزادے کے نام سے منسوب ہے۔ مرکزی شاہ راہ سے نکلنے والی ایک چھوٹی سڑک پر نفاست سے سجائی گئی بگھیاں ایک قطار میں کھڑی ہیں۔ گئے دنوں کی یہ نوابی سواری اب بھی نیا گرا کے سیّاحوں کو شہر کی سیر کرانے کے لیے دستیاب ہے۔ میں چلتے چلتے ایک خوب صورت عمارت کے سامنے رُک جاتا ہوں۔ عمارت کی پہلی منزل کی بالکنی اور بالائی منزل کی چھت سے لٹکی ہوئی بڑی بڑی پھولوں کی ٹوکریاں دیکھ کر اُس پر **Hanging Garden** کا گمان ہوتا ہے۔ عمارت کی پیشانی پر جلی حروف میں **Shaw Cafe & Wine Bar** لکھا ہے۔ اس کیفے میں داخلے کے دروازے کے ساتھ ہی ایک پیڈسٹل پر آرائشی فوّاروں کی درمیان جارج برنارڈ شا کا مجسمہ نصب ہے۔ میں اس مجسمے کے ساتھ تصویر بناتا ہوں۔ یہ میرے لیے ایک یادگار لمحہ ہے۔ میں اُس جگہ کھڑا ہوں جہاں کبھی برنارڈ شا خود کھڑا ہوگا۔ نیا گرا کے لوگ برنارڈ شا کے دیوانے ہیں۔ نیا گرا کا شا فیسٹیول دُنیا کی معروف ترین تھیٹریکل پروڈکشنز میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اپریل سے نومبر تک شہر کے تین مرکزی تھیٹر، دی فیسٹیول، رائل جارج اور کورٹ ہاؤس جارج برنارڈ شا اور اُس کے ہم عصروں کی معروف تمایل پیش کرتے ہیں۔ کئی بڑے اداکاروں کی شرت برنارڈ شا کی تخلیقات کی مرہونِ منت ہے۔ میں بند آنکھوں سے فیسٹیول کے سٹیج پر

"The Doctor's Dilemma", "Candida" , "The Devil's Disciple", "Arms and the Man", "Major Barbars", "Man and Superman", "Pygmalion"

اور شا کی دیگر آفاقی تخلیقات کی ڈرامائی تشکیل دیکھ رہا ہوں، جب اچانک لاؤڈ سپیکر سے کان کے پردے پھاڑ دینے والا اعلان مجھے دعوت دیتا ہے۔ شابا! شابا! سوچ میں مت پڑو! جلدی کرو! عشق کی لازوال داستان ہیر رانجھا کا کھیل شروع ہونے میں بس چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ٹکٹ خریدو اور اپنے محبوب فنکاروں، بالی جٹی اور عنایت حسین بھٹی کو ہیر اور رانجھا کے روپ میں دیکھنے کے لیے اپنے ہر دل عزیز تھیٹر پہنچ جاؤ۔ شابا! شابا! دیر مت کرو! شو شروع ہونے میں بس چند لمحے باقی ہیں۔

میں آئر لینڈ کے شا (**George Bernard Shaw**) کے قدموں سے اُٹھ کر چناب کنارے بابا گلاب شاہ کی نگری، رسول نگر پہنچ چکا ہوں۔ ۹ جون (۲۷ جیٹھ) کا دن ہے۔ بابا گلاب شاہ کے دربار پر لگنے والا میلہ اپنے جوبن پر ہے۔ سورج غروب ہو چکا ہے۔ گرمی کی شدت میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ درگاہ سے متصل میلے کے میدان میں عارضی طور پر لگائی گئی دکانوں کے مالکان چیخ چیخ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کہیں گرمی کا توڑ کرنے والا شربتِ بادام بیچا جا رہا ہے اور کہیں جگر ٹھنڈا کرنے والا خاص لاہوری فالودہ پیش کیا جا رہا ہے اور کہیں حلوائی گاہکوں کو اپنی مٹھائیوں کی طرف راغب کر رہے ہیں تو کہیں کھلونے بیچنے والے ضدی بچوں کے والدین کی جیبیں خالی کرا رہے ہیں۔ زنانہ سٹالوں پر بابا کے دربار کی ونگاں چڑھانے والی کُڑیوں کا ہجوم ہے۔ جھولوں کا ٹکٹ خریدنے کے لیے لمبی لمبی قطاریں لگی ہیں۔ جب کہ سرکس اور موت کے کنوئیں کی اَڑی (داخلے کے مرکزی دروازے کے اُوپر بنائی گئی مچان نما سٹیج) پر رقاصائیں اور ہیجڑے اپنے رقص سے تماشائیوں کو محظوظ کر رہے ہیں۔ اسی سٹیج سے وقفے وقفے سے اعلان ہو رہا ہے شابا! شابا! دیر نہ کرو! سوچیں پیاتے بندہ گیا۔ ٹکٹ خریدو اور اندر آ جاؤ۔ شو شروع ہونے والا ہے شابا! شابا!

درگاہ کے اندر کثیر تعداد میں ’’بابا کے ملنگ‘‘ دھمال ڈال رہے ہیں اور درگاہ سے باہر عالم لوہار اور عنایت حسین بھٹی کے تھیٹروں کے سامنے شائقین کا ہجوم ہے۔ دونوں تھیٹروں کی ’’اڑیوں‘‘ پر ناچنے والی رقاصائیں اور ہیجڑے اپنے رقص سے تماشائیوں کو محظوظ کر رہے ہیں۔ یہ جادوگرنیاں اپنے رقص اور اداؤں سے تماشائیوں کو باندھ کے رکھتی ہیں۔ جو بالآخر ٹکٹ خرید کر تھیٹر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اپنے لڑکپن میں مَیں ہیر رانجھا، سوہنی ماہیوال اور مرزا صاحباں کی تماثیل

دیکھنے کے لیے نہ جانے کتنی دفعہ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھ کر تمام رات جاگا ہوں۔ ان تماثیل کا رومان میرے اندر کی گہرائیوں میں اب بھی موجود ہے۔

خیال کا سلسلہ ٹوٹتا ہے تو دیکھتا ہوں کہ میں ابھی تک برنارڈ شا کے مجسمے کے پہلو میں کھڑا ہوں۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ شفق کی لالی نے نیاگرا کی خوب صورتی میں ایک اور رنگ بھر دیا ہے۔ دن کی روشنی مین نیاگرا کے حسن کا جی بھر کے نظارہ کرنے کے بعد سیّاحوں کی ایک بڑی تعداد ریستورانوں میں مے خانوں کا رُخ کرتی ہے۔ میں خوب صورت جوڑوں کو شراب خانوں میں داخل ہوتے دیکھتا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ جب یہ باہر نکلیں گے تو ”من تو شدم، تو من شدی“ کی تصویر بنے ایک دوسرے کی بانہوں میں جھول رہے ہوں گے مگر یہاں حُسن کی بے باکی نظر آتی ہے نہ عشق کی بدمستی۔ لگتا ہے یہاں کے ساقی نشہ پلاتے ہوئے بھی بے اعتدالی نہیں ہونے دیتے کہ نیاگرا کے حسن کا تقدس آلودہ نہ ہو۔ میں نے جھیل کنارے نیاگرا کو دن کے وقت دیکھا ہے۔ اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ رات کے وقت مے خانوں سے نکلنے والوں کا اسلوب کیسا ہوتا ہوگا؟ میری شدید خواہش ہے کہ نیاگرا کا شبینہ حُسن دیکھوں، مگر میں رات کے جوان ہونے تک یہاں رُک نہیں سکتا، کیوں کہ ہمیں ٹورانٹو میں ایک جگہ رات کے کھانے کی دعوت پر پہنچنا ہے۔ ہم شام کے دھندلکے میں ٹورانٹو کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ جو یہاں سے ۱۲۸ کلومیٹر دُور ہے۔ کہیں قریب ہی کسی اہم سیاحتی وفد کے اعزاز میں بینڈ پر خیر مقدمی (یا الوداعی) دُھن بجائی جارہی ہے، رفتہ رفتہ بینڈ کی آواز معدوم ہوتی جاتی ہے اور اُس کی جگہ ایک اور جانی پہچانی آواز کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ ڈم ڈم ڈم، ڈم ڈم ڈم۔ آج جمعرات ہے۔ شام کا وقت ہے۔ بابا گلاب شاہ کے دربار کے دالان میں ڈھولی ہلکی تھاپ پر ڈھول بجانا شروع کرتا ہے۔ دھمالیوں کے قدم تھرکنے لگتے ہیں۔ جوں جوں ڈھول کی تھاپ تیز ہوتی جاتی ہے۔ دھمالیوں کی دھمال میں بے خودی اور والہانہ پن بڑھتا جاتا ہے۔ ڈھول کی آواز میں نہ جانے کیا جادو ہے کہ سننے والے اُس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ دالان میں دھمال ڈالنے والوں کا ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ اُن میں شہر کے دھمالی بھی ہیں اور باہر سے آئے ہوئے زائرین بھی۔ لگتا ہے ڈھولی خود بھی ڈھول کے نشے میں سرشار ہوتا جارہا ہے۔ ڈھول کی تھاپ کو قابو میں رکھنا اُس کے بس میں نہیں رہا۔ ڈم ڈما ڈم ڈم۔ ڈم ڈما ڈم ڈم۔ دھمال ڈالنے والوں کے قدم اُن کے اختیار میں نہیں رہے۔ سب پر بے خودی کی کیفیت طاری ہے۔ میں دھمالیوں سے ہٹ کر تماشائیوں میں کھڑا ہوں۔ میرے قدم ڈھول کی تھاپ پر رقص کے لیے بے تاب ہیں۔ میں انہیں ضبط میں لاتا ہوں، تو ردِعمل میں میرا رُواں رُواں تھرتھرانے لگتا ہے۔ میں بظاہر ساکت ہوں، مگر میرے خون کا ایک ایک جسیمہ ڈم ڈما ڈم ڈم کی آواز پر لبیک، لبیک کا ورد کر رہا ہے۔ سرمستی کے یہ لمحے اُس وقت مختصر ہو جاتے ہیں جب ہماری گاڑی ٹورانٹو کے مضافاتی شہر مارکھم میں ہمارے میزبانوں کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک جاتی ہے۔

یہ بات میرے لیے ایک معمّہ ہے کہ میرا شعور اور لاشعور متضاد راستوں پر کیوں چلتے ہیں۔ میں بقائمی ہوش وحواس نیاگرا آبشار اور نیاگرا شہر کی خوب صورتی کا مدّاح ہوں۔ مجھے نیویارک کے ٹائم سکوائر کی چکا چوند پسند ہے۔ امریکا کی ریاست ورجینیا کی قدرتی حسن سے مالا مال شینن ڈوباویلی (Shenandoba Valley) میں لمبی ڈرائیو پر نکل جانا اور آسٹریلیا میں فیری (Ferry) سے سڈنی ہاربر برج اور فنِ تعمیر کے شاہ کار ”اوپرا ہاؤس“ کا نظارہ کرنا میری زندگی کے یادگار تجربات ہیں مگر معلوم نہیں کیوں اُن میں سے کوئی بھی تکرار کے ساتھ میرے خوابوں میں نہیں آتا۔ میرے خواب تو مجھے میرے ”شہر“ کی اُن ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں کھینچ لے جاتے ہیں، جنہیں چھوڑے ہوئے ایک مدت ہو چکی۔ اب کبھی سال میں ایک آدھ دفعہ وہاں جاتا بھی ہوں تو میری حیثیت ایک مہمان کی سی ہوتی ہے۔ عزیز، رشتے دار اور پرانے دوست یہ سوچ کر محبتیں نچھاور کرتے ہیں کہ اگلے روز مجھے واپس جانا ہے۔ نئی نسل کے نوجوانوں کے لیے میں وہاں اجنبی ہوں۔ بازار سے گزرتا ہوں تو کچھ اس طرح کے جملے سنائی دیتے ہیں ”یہ مہر نوید اور مہر ظفر کا بڑا بھائی ہے“، ”اس نے راول پنڈی میں گھر بنا لیا ہے۔ سُنا ہے آج کل زیادہ وقت امریکہ میں رہتا ہے۔“ رسول نگر میں اپنے مختصر قیام کے بعد جب میں وہاں سے رخصت ہونے لگتا ہوں تو مجھے ایک ممتا بھری شکایت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

”بچہ! تمہارے پاس اپنی امّاں کے پاس رکنے کے لیے بس اتنے ہی دن تھے؟“ رسول نگر سے میرے رخصت ہونے پر اداس ہو جانے والی امّاں جی جب ۲۲ سال پہلے خود اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو یہ محبت بھرا شکایتی جملہ بھی اُن کے ساتھ قبر میں اتر گیا۔ اب میں وہاں سے رخصت ہوتا ہوں، تو کوئی افسردہ نہیں ہوتا۔ میں اپنے شعور میں اپنے شہر کے لیے اجنبی ہو گیا ہوں مگر میرا لاشعور چناب اور بابا گلاب شاہ کے دربار کے درمیان گردش میں رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پسِ مرگ میرے جسم کو چاہے جہاں کہیں بھی خاک نصیب ہو، میری روح میرے شہر کی ناہموار گلیوں میں چناب کے ریتلے ساحل پر اور درگاہ بابا گلاب شاہ کے آس پاس آوارہ رہے گی۔

وزیراعظم

ایک بار وِنسٹن چرچل کی بیگم کلیمین ٹائن، کسی خاکروب سے بات کرنے کو کچھ دیر رکی تو چرچل کو تھوڑی تشویش ہوئی کہ یہ اس سے اتنی دیر کیا بات کر رہی ہے؟

اس کے استفسار پر کلیمین ٹائن بولی، "یہ میرا ایک پرانا عاشق تھا۔ پاگلوں کی طرح چاہتا تھا مجھے"

جس پر چرچل نے استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کلیمین ٹائن کو جتلایا، "یعنی اگر تم اسی کے ساتھ ہوتیں تو آج ایک خاکروب کی ہی بیوی ہوتیں!

اس پر کلیمین ٹائن نے اپنا تاریخی جواب دیا:

نہیں! اگر میں اس کے ساتھ ہوتی تو آج وہ ایک وزیراعظم ہوتا!"

انگشتِ شہادت

گاڑی تمہاری آ گئی ہے

ستیہ پال آنند

(امریکہ)

بینچ پر بیٹھا ہوا ہوں
اک اکیلا، یکسر و تنہا، یگانہ
برف شاید رات بھر گرتی رہی ہے
اس لیے تو میرا اوورکوٹ، مفلر اور ٹوپی
برف سے یوں ڈھک گئے ہیں
جیسے ان کی بیخ و بن میں
اون اور برفوں کے تار و پود یکجا ہو گئے ہوں
سانس نتھنوں سے نکلتا ہے تو جیسے
برف میں تحلیل ہو کر
پھر مرے نتھنوں کے اندر تک رسائی چاہتا ہے

ہاں، بہت دقّت طلب ہے
آنکھ کے وزنی پپوٹے کا ذرا سا کھل کے باہر دیکھنا
بس ایک لمحے کے لئے ہی

ہاں، بہت دقّت طلب ہے
کھول ہی لیتا ہوں آخر

دور تک بس برف کے انبار ہیں
جو ریل کی پٹڑی کو بالکل ڈھک چکے ہیں
دائیں بائیں اور بھی کچھ بینچ ہیں
لیکن سبھی خالی پڑے ہیں
ریلوے کا یہ سٹیشن
صرف اک جانب سے آنے والی گاڑی کا کوئی ادنیٰ پڑاؤ
منتظر ہے، منجمد ہے، آدھا سویا اور آدھا جاگتا ہے
آنکھ کا وزنی پپوٹا بند ہونا چاہتا ہے
اور تب اک برف کا کورا ہیولیٰ
میری انگشت شہادت کو پکڑ کر
مجھ سے کہتا ہے۔ چلو، آؤ
اٹھو، گاڑی تمہاری آ گئی ہے

اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی

ایوب خاور

(لاہور)

اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی
اندھیرے کی مٹھی کسی سے نہیں کھل رہی
اندھیرے کی مٹھی میں بند ایک ڈبیہ ہے
ڈبیہ میں جگنو ہے
اور حبسِ بے جا میں ہے
پہرے داروں کے آپس کے جھگڑوں میں
ڈبیہ کی چابی کہیں گم ہوئی ہے
گما دی گئی ہے
کہ تالا لگا کر کے
چابی کو مٹھی کی درزوں کے اندر ہی سرکا دیا ہے کسی نے
کسی کو خبر ہی نہیں
یا پھر بتاتے نہیں ہیں جو اس راز کو جانتے ہیں

میں جس پیڑ کی سبز پتوں بھری شاخ پر آ کے بیٹھا تھا
اب وہ سیہ ہو چکی ہے
دھواں اٹھ رہا ہے
اب اس پیر کی کچھ جڑوں سے دھواں اٹھ رہا ہے
دھوئیں میں اندھیرے کی بھی سانس گھٹنے لگی ہے
نظر کچھ نہیں آ رہا
حبس کی صورتِ حال میں
وہ جگنو بجھے جا رہا ہے
اندھیرا کثافت کی میلی چکٹ ایک چادر کی مانند
مجھ سے لپٹتا چلا جا رہا ہے
میرا دم گھٹا جا رہا ہے
شاعر نکتہ داں!
اے مرے راز داں!
کون فرعون ہے
جس کے جادوگروں نے
اندھیرے کی مٹھی پہ ایسا کوئی سخت جادو کیا ہے
یہ جگنو جو بے حس اندھیرے کی مٹھی میں بند
ایک ڈبیہ کے اندر بجھے جا رہا ہے
اگر مر گیا تو؟!

’’مجھے گھر جانا ہے‘‘

- رباعیات -

مامون ایمن

(نیویارک)

غیروں کا اگر اور مگر جانا ہے   اپنوں کا بھی ہر زیر، زَبر جانا ہے
بَرفاب اثرشور، شرر جانا ہے   رنگوں سے پَرے، خاک بسر جانا ہے

○

اس شہر سے رخصت مجھے ہو جانا ہے   اِس دہر سے رخصت مجھے ہو جانا ہے
پَیراک بَنا ڈالا تھا جس نے مجھ کو   اُس لہر سے رخصت ہو جانا ہے

○

دن، رات سے رخصت مجھے ہو جانا ہے   حالات سے رخصت مجھے ہو جانا ہے
خوشیوں سے جُدا ہونا ہے مجھ کو یگ سر   صدمات سے رخصت ہو جانا ہے

○

شَہہ دار سے رخصت مجھے ہو جانا ہے   معیار سے رخصت مجھے ہو جانا ہے
جذبات سے، احساس سے ہونا ہے جُدا   افکار سے رخصت مجھے ہو جانا ہے

○

گہرائی سے رخصت مجھے ہو جانا ہے   گیرائی سے رخصت مجھے ہو جانا ہے
ہُو ہاؤ سے ہو گی نہ غرض پھر کوئی   تنہائی سے رخصت مجھے ہو جانا ہے

○

اقرار سے رخصت مجھے ہو جانا ہے   اِنکار سے رخصت مجھے ہو جانا ہے
اُس جا کے لیے، ہوگی خوشی جس جا   اظہار سے رخصت مجھے ہو جانا ہے

○

تقدیر سے رخصت مجھے ہو جانا ہے   تدَبیر سے رخصت مجھے ہو جانا ہے
تعبیر، ہر اِک خواب کا منظر تَج کر   تقصیر سے رخصت مجھے ہو جانا ہے

○

دنیا کے شعاروں سے گذر جانا ہے   عقبیٰ کی بہاروں سے سنور جانا ہے
چلنا نہیں آئندہ، ٹھہر جانا ہے   اب سانجھ بھئی ہے، مجھے گھر جانا ہے

○

قیدِ تنہائی

رضیہ اسماعیل

(یو کے)

کھول دو، کھول دو
سوچ کے بادباں کھول دو
سر اٹھا کے بہت ناز سے جانے والی ہوا نے کہا
سن کے پیغام یہ سوچ بھی سوچ میں پڑ گئی
میں تو صدیوں سے زندان خانوں میں ہوں
لب سلے ہیں مِرے، ہاتھ جکڑے ہوئے
پاؤں میں بیڑیاں
نرم و نازک سراپا ہے اک آبلہ
سلسلہ ظلم کا ہے کہ رکتا نہیں
میں نصیبوں جلی، جب سے پیدا ہوئی
قیدِ تنہائی ہے
ذرّہ ذرّہ یہاں پر تماشائی ہے
اک تعفن رچا ہے فضا میں یہاں
سانس لینا بھی اب مجھ کو دشوار ہے
اس قدر جاں گسل ہے مِری داستاں
کون یوسف کی چارہ گری اب کرے
کون یعقوب کی چشمِ بے نور میں، نور پھر سے بھرے
کوئی بھیجو مسیحا اے بادِ صبا!
تو ہوا ہے، جہاں میں تِرا راج ہے
تُو تو آزاد ہے
بیڑیاں پاؤں میں تیرے پڑتی نہیں
اس جہاں میں سبھی تیرے محتاج ہیں
مجھ سے سارا زمانہ ہی ناراض ہے
سوچ کے بادباں، اس ہوا، اس فضا میں
کھلیں بھی تو کیسے کھلیں
مجھ کو تُو ہی بتا، مجھ کو تُو ہی بتا

کہیں کوفی نہ کہلائیں

گل بخشالوی

(کھاریاں)

جہاں بھر کے مسلمانو! چلو آؤ ملیں مل کر
چلیں کشمیر میں کشمیریوں کا حال تو پوچھیں
سنا ہے کہہ رہے ہیں وہ
مسلماں تم، مسلماں ہم
تو پھر یہ بے حسی کیسی
اٹوٹ انگ ہم بھارت کے،
ہیں پاکستان کی شہ رگ
یہ سب لفظی سیاست ہے
اُٹھو کشمیر ماں دھرتی کا یہ پیغام ہے تم کو
وہ کہتی ہے میرے بیٹو!
مرے آنگن میں ظلم و جبر کے شعلے بھڑک اُٹھے
میں مقتل ہوں
مرے بچوں کے سر نیزوں پہ آ کر رقص میں دیکھو
تمہارے پھول سے بھائی
لہو میں ڈوب کر وادی میں مل کر گیت گاتے ہیں
وہ کہتے ہیں، ہمارے خون سے کشمیر میں مہکے گی آزادی
میرے بیٹو چلے آؤ
تمہاری پھول بہنوں کے سروں سے چھن گئے آنچل
پریشاں ہوں
میں اپنی بیٹوں کی لُٹتی عصمت کب تلک دیکھوں
میرے بیٹو چلے آؤ
لکھو تاریخ اپنے خون سے میرے مقدر کی
یہی ہے وقت آزادی، وگرنہ دشمن کشمیر برہم ہے
وہ میرے پھول سے بچوں کا قتل عام کر دیں گے
مری شہزادیوں کو نوچ ڈالیں گے
حقیقت ہے، یہی سچ ہے
تو پھر آؤ چلیں مل کر کوئی ایک فیصلہ کر لیں
جہاں بھر کے مسلمانو! حکمرانو
کہیں کوفی نہ کہلائیں

عظیم قائد

قیصر نجفی

(کراچی)

ہم آج بھی نہیں بھولے ہیں اس زمانے کو
جب اپنے جسموں کا ملبہ اٹھائے شام وسحر
جبیں پہ داغ غلامی لیے ملول وحزیں
دیار ہند میں پھرتے تھے قریہ قریہ ہم
نظر میں کوئی ڈگر تھی نہ کوئی منزل تھی
بزعم خود تھے سفر میں رواں دواں لیکن
بھلا چکے تھے کہ ہم کون ہیں کہاں سے ہیں
نہ تھی شناخت ہماری بہ ایں سبب کوئی
یہ اور بات کے ماتھے پہ وقت کی تھے رقم
اگر نہ ذات خدا ہوتی حامی وناصر
مثال حرف غلط کب کے مٹ گئے ہوتے
کمال پر تھا زوال اپنا یاد ہے ہم کو
خدا نے بخش دیا میر کارواں جب ایک
وہ جس کا رخت سفر تھا بقول شاعر قوم
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
تھا قول وفعل میں اس کے پیام جاں مضمر
کہ اس نے بھر دی رگ وریشۂ میں حیات نئ
بظاہر اک تن نازک تھا پر حقیقت میں
چٹان حوصلے کی عزم کا پہاڑ تھا وہ
صدا یہ آئی ہے تاریخ کے جھروکوں سے
وہ پاش پاش ہوا اس سے جو بھی ٹکرایا
اسی کی جہد مسلسل کا یہ ثمر ہے کہ ہم
ہیں ارض پاک وفلک ناز سے مشرف باد
کہو یہ ہم وطنو سب کے سب بیک آواز
عظیم قائد وبابائے قوم زندہ باد
عظیم قائد وبابائے قوم زندہ باد

○

’’باتیں ہماری‘‘

سید عدیل ہاشمی

(کراچی)

کہانیاں تو خوب سناتے ہو
اور زندگی کی بات کرتے ہو؟؟؟
جیسا تم بتاتے ہو
کیا سچ مچ میں تم ایسے ہو؟
بولو!!! کب سے تم ایسے ہو؟
دھیمے سے ہنس کر بولا وہ
میں خود سے باتیں کرتا ہوں
خود میں بس میں رہتا ہوں
ایک محل ہے آباد میرے اندر
اس محل میں کون رہتا ہے؟
میں اور وہ...!!!
وہ محل کے اندر رہتا ہے؟
نہیں وہ میرے اندر رہتا ہے
تم کب کب اس سے ملتے ہو؟
جب جب وہ چاہتا ہے
اس سے جب میں ملتا ہوں
خود سپھر میں ملتا ہوں
وہ آخر خود کیا چاہتا ہے؟
وہ!!!! وہ خود سے کب کچھ چاہتا ہے
بس جب اسکو عشق جلاتا ہے
پھر مجھ کو چپ کراتا ہے
اور خود بھی چپ ہو جاتا ہے
وہ خود بھی بس ایسا ہے
وہ بھی بس میرے جیسا ہے

○

مرثیہ

شمس الرحمٰن فاروقی

شاہ حسین نہری

(اورنگ آباد)

کیا ہُوا ہے کوئی سانحہ
شاہ بیٹھا ہے کیوں خستہ حال

چُپ یہ کیوں لگ گئی ہے، بتا
بات کیا ہے جو ہے پُر ملال

ہم ہیں کیا، سوچتا ہوں یہ میں
کیا ہیں گزرے ہوئے ماہ وسال

عمر جو مل گئی مل گئی
اب اسی میں سبھی بول چال

جائیں گے جب ندا آئے گی
بس چلے خود، کہاں ہے مجال

سب اسی طرح سے چل دیے
موت کی رہ پہ ہے بھیڑ چال

جی نہیں ! یہ تو تقدیر ہے
کب بچا کوئی مائی کا لال

شاہؔ! فرمانِ رب ہے اجل
ہے یہی زندگی کا مآل

صبر کرنا ہمیں ہے ضرور
صبر کرلیں تو ہوں گے نہال

شمسِؔ رحمٰن بھی چل بسا
کم ہوئے جگ میں ایسے رجال

رخصتِ شمسؔ کی وجہ سے
بن گیا سال یہ غم کا سال

شمسؔ پر خون روئے فلک
رُوئے گیتی بھی ہے لال لال

حرف زن موت کا زخم ہے
ہوسکے کیا کبھی اندمال

شاہؔ! اعلیٰ شعورِ ادب
شمسِ رحمٰن کا انتقال

ہوگیا --- یہ تو ہونا ہی تھا
زندہ باقی وہ رب لا یزال

روئے دل اور آنکھیں ہیں نم
کس طرح اب ہو حالت بحال

شمسؔ پر روتے ، جیتے رہو
کیوں کہو: ''اب ہے جینا محال''

دشتِ ویران سا اب ہے دل
اس میں سنّاٹا آسودہ حال

دل میں سنّاٹے کی سسکیاں
بات قابو کی ہے صرف قال

''شمسِ مرحوم'' کیسے کہوں
کیا ہوا واقعی ارتحال

اب ملاقات ممکن کہاں
میرا کب ہو سکے گا وصال

شمسؔ کا جسم پیوندِ خاک
زندہ اس کا ادب ہے مثال

شمس زندہ ادب میں ہے وہ
کس میں دم اس کو دے جو نکال

غم ترا ہے یہ اردو زباں!
تھا وہ عاشق ترا بے مثال

عشقِ اردو میں ڈوبا رہا
شمسؔ روشن وہ روشن خیال

تھا ہمہ صنف فنکار وہ
اس کی ہر صنف میں برشگال

وہ سخن داں سخن فہم تھا
وہ سخن ور بھی تھا خوش مقال

نقد و تحقیق کا شہ سوار
دیدہ ور خوش نظر باکمال

تھا شناسا وہ الفاظ کا
یوں اسے معنی سے تھا اشتغال

روحِ معنی میں ڈوبا ، بنا
لفظ و معنی کا تھا اتصال

شعر پہلے فقط شعر ہو
اور ہی طرح کا ہو نہ مال

زور سے کہہ گیا شمسؔ یہ
اس کا پختہ یہی تھا خیال

شعر پُر لطف ابہام سے
ہے خبر یہ ، نہ بس عرض حال

ادّعا شاعرانہ رہے
گر ہو شاعر کا تو ابتذال

شاعری کا جہاں ہے عجیب
یہ ہے جیسے فسونِ حلال

میرؔ و غالبؔ کے اشعار کا
جو دکھایا جلال و جمال

اس طرح کون اب کرسکے
ختم اس پر ہے یہ طرزِ دال

بے تکان اس کا خامہ رہا
کب کسی کا بنا یر غمال

نابغہ عصر کا شمس تھا
لوگ ایسے ہوئے خال خال

صاف واضح رہی فکرِ شمس
کچھ نہیں تھا کہیں اختلال

ہاں مگر یہ کہ تھا وہ بشر
بے خطا ہو بشر' ہے محال

مجھ کو بھی تھا کہیں اختلاف
اب سرِ دست کیوں یہ سوال

گفتگو اس پہ ہوتی رہے گی ضرور
لیک ممکن نہیں انفصال

شاہؔ! ذاتی نہ ہو اختلاف
یہ ادب کے لیے ہے وبال

اس کی تھی بے تعصب نظر
تھے برابر دکن اور شمال

خوب تھی اس کی جو تربیت
بڑھ کے اونچے بنے نو نہال

مجھ سے تھے سامنے اس کے یوں
شیر کے سامنے جو ں شغال

شمسؔ تھا خوب انسان وہ
انس و الفت سے تھا خوش جمال

ابتدا میں بھی تھی دلکشی
بدر بن کر رہا وہ ہلال

طورِ شخصی کشادہ دلی
ظلم اردو پر ہو تو جلال

سادگیِ طبع سادہ دلی
فخر سا انکساری ظِلال

ہاں! گیا وہ نہ شہرِ یہود
غیرتِ دین کا تھا یہ حال

ظلم پر ان کے ناراض تھا
نا پسند ان کی تھی چال ڈھال

ہے خسارہ مرا مرگِ شمس
غم میں میں' میرے اہل وعیال

جانے کیوں اس کی عظمت پہ ہے
کچھ لبوں پر رواں قیل و قیال

کس لیے آہ و زاری ہے یہ
ایک اٹھّا ہے یہ بھی سوال

اب میں کس طرح سے دوں جواب
ہے فقط اس قدر عرضِ حال

اس کی خدمت کا ہو اعتراف
چاہے اس کے نہ ہوں ہم خیال

اختلافات اپنی جگہ
تھا مگر شمسؔ صاحب کمال

ہو اصولی ہی بس اختلاف
غصہ ذاتی نہ ہو پر جلال

تھا بنی نوعِ آدم میں وہ
کیوں خطا کا نہ ہو احتمال

میرے اللہ تھا وہ بشر
بے خطا اس کا ہونا محال

تجھ پہ ایمان تھا اس کو بھی
تھا نہ بے دیں' نہیں تھا وہ ضال

تھا محبِ نبیؐ بھی وہ شمس
دل میں ایماں تھا اس کے بحال

وہ حضور اب ترے آگیا
مغفرت اس کی ہو ذو الجلال

شمسؔ کا سالِ رحلت ہے شاہؔ!
''غم الم آہ و زاری ملال''

* * *

۲۵۔ دسمبر ۲۰۲۰ء شمسی، مطابق ۹۔ جمادی الاول
۱۴۴۲ھ بمقام الہٰ آباد (یوپی)

تیرا ہی نام لیتی ہوں

نزہت شاہ

(نیویارک)

میرے ہر کام سے پہلے
میری ہر بات سے پہلے
تیرا ہی نام ہوتا ہے
تیرا ہی نام لیتی ہوں
پھر اسکے بعد کرتی ہوں
کوئی بھی کام ہو چاہے
کوئی بھی بات کہنی ہو
تجھ ہی سے لَو لگاتی ہوں
تجھی کو یاد کرتی ہوں
صبُح کی پہلی کرنوں میں
اندھیری شب کے
تاریک پہروں میں
تنہائی کے گوشوں میں
لرزتے خشک ہونٹوں سے
چھلکتے گرم اشکوں سے
صدا تجھ کو ہی دیتی ہوں
کوئی مشکل جو آجائے
پریشاں دل کو کر جائے
تیرا ہی نام لیتی ہوں
میں سجدوں میں بلکتی ہوں
توٹل جاتی ہے ہر مشکل
نظر آتی ہے پھر منزل
میسّر آ ہی جاتے ہیں
سکونِ قلب، قرارِجاں
تسکینِ روحِ سیمابی
تجھے جو یاد کرتی ہوں
تیرا جب نام لیتی ہوں
دعاؤں میں تڑپ لیکر
تیرے دربار آتی ہوں

دوہے

وشال کھُلر

(لدھیانہ)

رفتہ رفتہ عمر ہے گولی بھر بندوق
کاگا چوری کر گیا کھولا جو صندوق

○

بگیا بگیا ڈھول ہے چندن چندن شول
گھر میں ماں کیا ممتا آنگن آنگن پھول

○

ٹوٹے پھوٹے خواب کی بھینی بھینی آس
اکھڑی اکھڑی نیند کی تیکھی تیکھی پیاس

○

جلتی بجھتی سانجھ کی میٹھی میٹھی دھوپ
گھٹتی گھٹتی عمر کا ماٹی ماٹی روپ

○

من نینن کا بانورا گھر گھر مانگے دان
شہرت الھڑ چاکری گھٹتی بڑھتی شان

○

چکنا چکنا اک گھڑا سر پہ رکھّے نار
پانی بھر کر لے چلی جیسے یہ سنسار

○

ادھورا پن مکمل ہے

پروین شیر

(نیو جرسی)

کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی کا منفرد تخیل دنیائے دروں میں زلزلے پیدا کر دیتا ہے اور دنیائے بیروں کے حسین رنگوں کے کچے ہونے کا گواہ بن جاتا ہے۔ رنگین عینک سے بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی بے رنگی صاف نظر آنے لگتی ہے۔ سوچ بے چین ہو کر گھبرائی ہوئی بے منزل بھٹکنے لگتی ہے۔ یہ صورت حال فکر کے کئی چراغ روشن کر دیتی ہے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت معروف شاعر، جون گوڈفری سیکس (Jhon Godfrey Saxe) کی نظم The Blind Men and the Elephant پڑھ کر ہوئی۔

امریکہ کا معروف شاعر، جون گووڈفری سیکس (Jhon Godfrey Saxe) ورمونٹ میں ۱۸۱۶ میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۷ میں دنیا چھوڑ گیا۔ اس کے آباؤ اجداد جرمنی سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ تجارت کے پیشے سے اکتا کر اس نے شاعری شروع کر دی تھی۔

اس کی یہ سب سے مشہور نظم ایک قدیم، تقریباً ڈھائی ہزار سال سے زیادہ پرانی ہندوستانی تمثیلی کہانی کی بنیاد پر ہے جو انیسوی صدی میں وجود میں آئی تھی۔ ہندوستان کے بہت مقبول مجاز یہ Parable سے متاثر ہو کر سیکس نے یہ نظم کہی تھی اور مغرب میں متعارف کیا تھا۔ مغربی قاری نے اس مشہور طنز نگار کی اس تخلیق کو بہت سراہا تھا۔ گرچہ یہ نظم اس کی موت کے بعد زیادہ مشہور ہوئی۔

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کی داستانوں میں یہ بہت مشہور حکایت ہے جو ہندوستان سے شروع ہوئی اور ہر جگہ پھیلی۔ خاص کر یورپ میں بہت مشہور ہے۔ اس کی بنیاد پر بچوں کی کتابیں بھی شایع ہوئیں جس کے تخلیق کاروں میں پال گالڈون (Paul Galdone) کا نام نمایاں ہے۔

یہ ہندوستانی تمثیلی کہانی جس کے کئی ترجمے ہیں مختلف لوگوں کے نقطۂ نظر سے دیکھے گئے حقائق پر مبنی ہے۔

گوڈفری کی نظم کا اقتباس یہ ہے:

’’وہ ۶ ہندوستانی تھے
جو مزید علم کی طرف مائل تھے
وہ ہاتھی دیکھنے گئے، گرچہ سب نابینا تھے
پہلا آدمی ہاتھی کی طرف گیا اور اس کے کشادہ وقوی پہلو پہ گرا
وہ فوراً چیخا
’’خدا مجھے اپنی برکت عطا کرے
کہ ہاتھی بالکل ایک دیوار کی مانند ہے!‘‘
دوسرے نے ہاتھی کے دانت کو ٹٹولا
’’اوہو۔۔ یہ کیا ہے؟
اس قدر گول، ہموار اور نوکیلا
مجھ پر یہ صاف ظاہر ہے
یہ حیرت انگیز ہاتھی ایک نیزے جیسا ہے!‘‘

اس نظم میں ہاتھی خدا کا استعارہ ہے اور نابینا لوگوں کا صرف ایک حصے کے محدود لمس کی بنیاد پر ہاتھی کی پوری شبیہ کے متعلق فیصلہ کر لینا مختلف مذہبی عقائد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کے مکمل یقین کی وجہ ان کے ادھورے علم کی بنیاد ہے۔ نابیناؤں نے ہاتھی کے کسی ایک عضو کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا اور یہ سمجھ لیا کہ ہاتھی کی شکل وہی ہے۔ یوں وہ سب صحیح بھی تھے اور غلط بھی کیونکہ ان کا مشاہدہ ادھورا تھا۔ پھر تباہ کن کشمکش اور ایک دوسرے سے اختلافات پیدا ہوئے جس سے متاثر ہو کر گوڈفری نے یہ نظم کہی تھی:

’’اکثر عقائد کی جنگ میں
جھگڑنے والے
تنقید کرتے ہیں لاعلمی میں
کہ ایک دوسرے کا مطلب کیا ہے
اور بے وقوفی میں
ایک ہاتھی کے متعلق بولتے جاتے ہیں
جسے ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں دیکھا!‘‘

یہ صورت حال کئی سوالات سے ذہن کو الجھانے لگتی ہے۔ گرہیں کھلتی ہی نہیں۔

خلاؤں میں بھٹکتے ہوئے، چکراتے ہوئے سیارے، یہ گردشیں۔۔۔ ازل سے سیاروں کا ستاروں کے اردگرد منڈلاتے رہنا۔۔۔ کس تلاش میں سرگرداں ہیں یہ؟ سورج کے گرد چکراتی ہوئی ہماری زمین اور زمین پر بھٹکتے ہوئے انسان۔ شاید سہارے کی جستجو، سچ کی تلاش، سکون کی تلاش، روشنی کی تلاش، کاملیت کی تلاش میں ہیں ۔ دوڑتے، بھاگتے، رینگتے، ٹٹولتے لوگ۔ چھوٹے چھوٹے دائروں کے اندر بند جن سے باہر نکلنے کا نا کوئی راستہ ہے اور نا ہی وہ نکلنا چاہتے۔ ان کے ہاتھوں میں چراغ ہیں لیکن ٹمٹماتی ہوئی لَو کی مدھم روشنی اپنی محدود طاقت تک ہی منظر کو روشن کر سکتی ہے۔ دور تک جو پھیلاؤ ہے وہ تاریک رہ جاتا ہے۔ آدھا سچ پورا سچ بن جاتا ہے۔

دور۔۔۔ دھند کے اندر جاتے ہوئے آب وگل کے مختلف راستے، پگ ڈنڈیاں، پختہ سڑکیں، کچی راہیں، ندیاں، سمندر اور ان پر رواں مسافر۔ ایک دوسرے سے بیگانہ، الگ الگ اپنی اپنی ٹولی بنا کر چل رہے ہیں۔ یہ مختلف راستے

دور جا کر دھند کے ایک ہی نقطے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ مسافروں کو ایک ہی مقام پر پہنچاتے ہیں۔ ابتدا ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا اور انتہا ساتھ۔ لیکن اتنی دور تک دیکھنے کی آنکھوں میں طاقت کہاں۔۔۔ ان کی بصارت اور بصیرت جس راستے پر انہیں لے جاتی ہے ان کے قدم اسی سے مانوس ہو جاتے ہیں اور وہی ان کی منزلوں تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ راہیں انہیں ایک یقین کی بانہوں میں جکڑ لیتی ہیں۔ آدھے سچ کو پورا سچ سمجھنے کا یقین۔۔۔! انہیں پورا یقین ہے کہ دوسرے رستوں پہ چلنے والے کسی کھائی میں گر جائیں گے۔ لیکن دھند کی آغوش سبھی راستوں کو اپنے سینے میں سمیٹ لیتی ہے۔ بے بصیرت مسافر اپنے یقین پر جیت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے اعتبار کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر اختلافات کے بطن سے نفرتوں کی پیدائش ہوتی ہے۔

دشمنی کے خنجر ایک دوسرے کے خون پی کر بھی پیاسے رہتے ہیں۔ بے بصری تباہی کے زہریلے ناگوں کو جنم دیتی ہے جو ہر موڑ پر اپنا پھن اُٹھائے ہوئے لہراتے رہتے ہیں۔ تعصب کے گدھ انسانیت کے جسم کو نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں اور اسے لاغر بنا دیتے ہیں۔ انسانیت کی آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھیں شفافیت چاہتی ہیں لیکن یہ ممکن نہیں۔ نفرتیں اپنی سرفرازی کے جام چڑھاتی رہتی ہیں۔ سوچ کے اصلحہ خانوں میں دشمنی کے کارتوس جمع کیے جاتے ہیں۔ بصیرت کفن اوڑھ کر سوئی رہتی ہے۔ محبت کی ہری بھری شاخوں کو ایندھن بنا کر چھاؤں چھین لی جاتی ہے۔ جنون میں ڈوبے ہوئے نابینا مسافر ادھورے پن کو تکمیل سمجھ کر مختلف راستوں پر سفر پورا کرتے ہیں کہ وہ تو یہ دیکھنے سے مجبور ہیں کہ دوسرے بھی اسی دروازے کی طرف جا رہے ہیں جس طرف یہ گامزن ہیں۔

دھند سے جھانکتی ہوئی منزل مسکرا کر اس تماشے کو دیکھتی رہتی ہے۔ مختلف راستوں کے دھاگوں کے آخری سروں کو ایک ساتھ جوڑ کر اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے۔ نابیناؤں کی ٹولیاں اپنا اپنا پرچم تھامے ہوئے، ایک دوسرے کو زیر کرتے ہوئے رواں ہیں۔

مختلف عقیدوں کے سنگلاخ دائرے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے غیر مکمل علم کی اساس پر زلزلے پیدا کرتے ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔

گوڈفری کی نظم کے نابینا لوگوں نے علم حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کیا انہوں نے مطلق کو پا لیا؟ اپنے اپنے تجربات، اپنے اپنے نظریے، اپنے اپنے راستے۔ سچ کو پانے کے لیے مکمل بصارت اور بصیرت لاحق ہے۔ نیم سچائی کے چھوٹے چھوٹے بلبلے ایک دوسرے میں سما کر ایک نہیں ہوتے۔ رعونت سے سر اُٹھائے اختلافات کی پتھریلی فصیلوں کو جو بھی گرانے کی کوشش کرتا ہے ان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ زمین اپنے شانوں پر موٹی، پتھریلی تفرقے کی دیواروں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے، اپنے دل کے نہاں خانوں میں دکھ کا لاوا چھپائے ہوئے خاموش دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی تو اس کا دل اتنی شدت سے دھڑکتا ہے کہ اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے جس سے چمٹے ہوئے جاندار تہس نہس ہو جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے رواں رنج و غم کے سیلاب انہیں بہا لے جاتے ہیں۔ یہ تھراتی ہے لیکن دیواریں نہیں گرتیں۔ روز نیا سورج خون کے آنسو بہا کر افق کی خندق میں گر کر مر جاتا ہے۔ پورا چاند چمکتا ہے تو اسے بھی کرب کے ہتھوڑے روز ذرا ذرا توڑتے رہتے ہیں۔ اور آخر کار اس کا آخری ٹکڑا بھی سیاہی کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔ نفرتوں کا کثیف دھواں فضاؤں کی صیقل آنکھیں دھندلا دیتا ہے اور اس کی شفاف گود تعصب کا کوڑے دان بن جاتی ہے۔ تفاوت کی چیخ و پکار، سنگین حالات کے سیاہ بادل، بربریت کے پنجوں میں دم توڑتی ہوئی انسانیت، کھنڈر میں تبدیل ہوتے ہوئے خوابوں کے محل، سکھ چین کی اُکھڑی اُکھڑی سانسیں، حیوانیت کے قہقہوں کی گونج سے کانپتا ہوا آسمان۔۔۔ کیونکہ یہ بدنصیب سیارہ نابیناؤں کا سیارہ ہے۔

لیکن کچھ مسافر ایسے بھی ہیں جن کے راستے تنہا تنہا ہیں۔ یہ لوگ سوچ کے سر بفلک کوہ پر آگہی کے الاؤ میں جلتے رہتے ہیں۔ یہ خواب دیکھنے والی زندگانیاں ہیں جو اپنے سیارے کو تکمیل کے جواہرات سے سجانا چاہتی ہیں۔ یہ بلند فکر مسافر چاہتے ہیں کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تمام لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بن جائیں۔ ان کے خواب ان کی آنکھوں میں بھی سما جائیں۔ ان کی یہ بے چینیاں تا زندگی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہ لوگ سوچتے رہتے ہیں کہ۔۔۔ کیسی ہوتی یہ زمین جب منزل تک پہنچنے کا اس پر ایک ہی راستہ ہوتا؟ کیسا ہوتا یہ سیّارہ جب اس کے سینے پر سرحدوں کی خراشیں نہ ہوتیں؟ جب جنون کی کوکھ سے نفرتوں کے خوفناک بھیڑیے پیدا ہو کر ایک دوسرے کو لہولہان نہ کرتے؟ جب اپنے اپنے دائروں میں بے بصری انسانیت کے چیتھڑے نہ اُڑاتی؟ یہ لوگ ہتھیار کی جگہ پھول اگانا چاہتے ہیں۔

انہیں تنہا لوگوں میں برطانیہ کا ایک عظیم فنکار جون ونسٹن لینن (John Winston Lennon) بھی تھا جو ۱۹۴۰، اکتوبر میں پیدا ہوا تھا۔ ایک انتہائی مقبول گلوکار، نغمہ نگار اور مصنف تھا جو ہمیشہ اندھی اور دقیانوسی قدروں کے خلاف رہا۔ ۸ دسمبر ۱۹۸۰ کی رات نیو یارک میں اپنی رہائش گاہ کے قریب قتل کر دیا گیا جب وہ صرف ۴۰ سال کا تھا۔ اس کا قاتل مارک ڈیوڈ چیپمن (Mark David Chapman) ایک امریکی مجرم ہے جو ۱۹۵۵ میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن بہت مشکلوں میں گزرا تھا۔ جس کے ردعمل میں یہ حد درجہ مذہبی کرسچن ہو گیا اور جون لینن کی منفرد سوچ اور روشن خیال تحریروں سے نفرت کرنے لگا۔ چیپمن کے شدید غصے کی ایک وجہ لینن کی یہ مشہور غنائی نظم ’’تصور کرو‘‘ (Imagine) بھی تھی جس میں ایک حسین دنیا کے خوبصورت خواب کی شدت ہے:

’’تصور کرو..... یہاں کوئی ملک نہیں
تصور کرو..... یہاں کوئی ملکیت نہیں
تصور کرو..... سب لوگ
پوری دینا کے یکساں حصے دار ہیں
تم کہہ سکتے ہو کہ میں خواب میں ڈوبا ہوں
لیکن صرف میں ہی نہیں ہوں

باقی صفحہ ۱۰۹ پر ملاحظہ کیجیے

رعنا کوثر کی کہانی کے رنگ

جمیل عثمان

(امریکہ)

امریکی افسانہ نگار اور ناولسٹ ایف اسکاٹ فٹز جرالڈ کہتا ہے:

Find the key emotion; this may be all you need to know to find your short story.

اور انگریزی زبان کے ممتاز افسانہ نگار او ہس ری کا قول ہے:

A short story must have a single mood and every sentence must build towards it.

رعنا کوثر اپنے افسانوں کے تانے بانے بننے کے لئے اسی اصول پر کام کرتی ہیں۔ درخت کی خالی ڈالیاں دیکھ کر انہیں یہ خیال آتا ہے کہ ان پر برگ و بار آئیں گے یا آندھی اس درخت کو ہی اکھاڑ پھینکے گی۔ اور پھر وہ اس احساس کے اردگرد اپنی کہانی کی بنیاد رکھتی ہیں۔ چڑھتے او ڈوبتے سورج کو دیکھ کر انہیں زندگی کی بے ثباتی کا خیال آیا اور یوں افسانہ ''ضبطِ آرزو'' کی تخلیق ہوئی۔ گھر میں کام کرنے والی بنگالی ملازمہ کے محبت آمیز سلوک سے ''محبت فاتحِ عالم'' کی کہانی وجود میں آئی۔ آسمان پر V کی شکل بنا کر اڑنے والی بطخیں انہیں یہ پیغام دیتی ہیں کہ جیت کے لئے اونچی اڑان لازمی ہے اور اس خیال کے گرد ''یہ میرا نشیمن'' جیسا افسانہ جنم لیتا ہے۔ اور ''دل نہیں مانتا'' کا مرکزی خیال تو خود ان کی اپنی کہانی ہے۔

رعنا کوثر ایک نیچرلسٹ ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ اور وہ قدرتی مناظر سے خود بھی لطف اندوز ہوتی ہیں اور قاری کو بھی محظوظ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ذرا منظر نگاری دیکھیے:

''درختوں پر بہار کی آمد آمد ہے۔ کہیں سے سرخ پتے جھانک رہے ہیں تو کہیں زرد پتوں کا ایک جال ہے۔ کہیں کاسنی پھول ہیں تو کہیں خالی ڈالیاں۔ چھوٹے چھوٹے ننھے پودے سر اٹھا رہے ہیں۔ گلہریاں جابجا دوڑتی پھر رہی ہیں''۔

ایک اور منظر نامہ یوں بیان کرتی ہیں:

''ایک حسین جگہ تھی۔ چہار سو ہری ہری گھاس بچھی تھی۔ دور تک ندی کا صاف شفاف پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ مرغابیوں کے غول اپنے پنکھ پھیلائے پانی میں رواں دواں تھے۔ ایک جانب خوبصورت آبشار سے گرتا سفید برف جیسا پانی کافی بھلا لگ رہا تھا''۔

افسانہ ''یہ میرا نشیمن'' میں انکی منظر کشی ملاحظہ فرمایئے:

''دور تک بچھی گھاس اور پھر ایک حسین شفاف تالاب، جس کا نیلا پانی ہوا سے ہلکورے لے رہا تھا۔ اس میں بطخیں تیر رہی تھیں اور خوبصورت ہنسوں کا جوڑا بھی ہوا کے ہلکورے پر جھولے جھول رہا تھا۔ تالاب کے پیچھے ہلکے گلابی اور خاکی گھروں کی لائن تھی''۔

اور یہ آخری خوبصورت اقتباس ان کے افسانے ''بدلتا موسم'' سے ہے:

''کھلے ہوئے بڑے سے سفید دروازے اور کھڑکی میں سے چھن کر آتی ہوئی سورج کی روشنی دل کو بہت سکون دے رہی ہے۔ دور آسمان پر اڑتی چڑیاں اور زمین پر بچھا ہلکا سبزہ اور خوبصورت درخت، تھوڑے سبز اور تھوڑے سرخ اور ان میں چھلانگیں مارتے ہرن، آسمان پر کالے سرمئی بادل اور سورج کی آنکھ مچولی وقت بدلنے کا پتہ دے رہی ہے۔ اس بات کا پتہ کہ طویل سردیوں کا موسم ختم ہوا اور بہار کی آمد ہے''

رعنا کوثر کے افسانے نہایت غریب و سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا کھڑ پینچ نہیں ہوتا۔ کہانی میں ٹوسٹ (twist) کم ہی آتے ہیں۔ سیدھی سادی کہانی بہتے دریا کی طرح چلتی چلی جاتی ہے اور پھر اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ ہاں، ان کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ شستہ زبان، دلچسپ طرزِ بیان، دلکش منظر کشی، خوبصورت جزیات نگاری ان کی تحریر کا خاصہ ہیں۔

رعنا کوثر کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جہاں بھی جاتی ہیں اپنے اطراف کا گہری نظر سے مطالعہ کرتی ہیں مثلاً ''کبھی تم بھی گلاب تھیں'' میں لکھتی ہیں ''میں گھر سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ لمبے لمبے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دور تک پھیلی گھاس ان درختوں کے قدموں میں بچھی جا رہی تھی''۔ افسانہ ''وقت کا دھارا'' میں رعنا ایک غریب بنگالی بچے کے لباس کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ''وہ نیلی قمیص اور پینٹ میں ملبوس تھا۔ دبلے پتلے جسم پر کپڑے ڈھیلے لگ رہے تھے''۔ رعنا نے ضرور کسی غریب بچے کو دیکھا ہوگا جو پہلی بار اچھے کپڑے پہن رہا ہوگا مگر وہ کپڑے اس کے سائز سے بڑے ہوں گے۔ اس قسم کی جزیات ان کی تحریر کو خوبصورتی عطا کرتی ہیں۔

رعنا کوثر کے افسانوں میں ان کا تجربہ بولتا ہے۔ وہ کراچی میں پلی بڑھیں۔ ان کے شریکِ حیات شیخ امین صاحب کا بچپن اور لڑکپن مشرقی پاکستان میں گزرا تھا۔ 1971 کے بعد شیخ امین کا خاندان کراچی آ گیا اور یہیں دونوں کی شادی ہوئی۔ پھر وہ شیخ صاحب کے ساتھ امریکہ آ گئیں۔ بعد میں وہ ڈھاکہ بھی گئیں اور ان جگہوں کو دیکھا جہاں ان کے شوہر کا بچپن گزرا تھا۔ یہ تمام تجربے ہمیں ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''محبت فاتحِ عالم'' میں رعنا نے بڑی خوبصورتی سے بنگال کے مناظر کا ذکر کیا ہے اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو اگرچہ غریب ہیں مگر ان کے دل محبت کی دولت سے مالا مال ہیں۔

افسانہ ''یہ میرا نشیمن ہے'' میں انہوں نے بطخوں سے انسانوں کا موازنہ کیا ہے۔ بطخیں V کی شکل بنا کر اڑتی ہیں اور شاید اس میں یہ پیغام ہے کہ جیت اسی کی ہے جو

اڑنا جانتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے انہوں نے پیغام دیا ہے کہ سوچ کے منفی دروازے بند کر دو اور ٹھنڈی ہوا کو اپنے دل کی کھڑکی کھول کر محسوس کرو۔ پھر کوئی برا نہیں لگے گا۔ سب اچھے ہیں، ہر انسان اچھا ہے بس ہماری سوچ اسے برا بنا دیتی ہے۔ بہ قول جوش ملیح آبادی:

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا برے سے بھی نفرت نہ چاہئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹوں سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کے دل میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

رعنا کوثر انسانی نفسیات کو سمجھتی ہیں اور جا بہ جا انہیں اپنے افسانوں میں استعمال کرتی ہیں۔ ”بیبی سٹر“ کی بوا ساری عمر محنت کر کے اپنے بچوں اور پھر ان کے بچوں کو پالتی ہے۔ یہاں تک کہ بوڑھی ہو جاتی ہے مگر اس کے نواسے نواسیاں اس وقت تک گویا اس کی گود میں سوار تھے۔ تو، بہ حیثیت مصنف وہ سوال کرتی ہیں کہ بوا کس کی بے بی سٹر ہوئی؟ امریکہ میں جن کے ہاں ملازمت کرتی تھی ان کی، یا پاکستان میں اپنے پوتے پوتیوں یا نواسے نواسیوں کی؟۔ ”وقت کا دھارا“ میں رحیم کا بیٹا غربت کے زمانے میں بہت زیادہ کھاتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے ماں باپ کا حصہ بھی کھا جاتا تھا۔ اور جب رحیم کی ویزا لاٹری نکل آتی ہے اور وہ امریکہ آ جاتا ہے اور گھر میں کھانے پینے کی فراوانی ہو جاتی ہے تو وہی بیٹا اپنے پلیٹ کا آدھا کھانا کھاتا ہے اور آدھا پھینک دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تنگی میں انسان زیادہ کھاتا ہے یہ سوچ کر کہ نہ جانے پھر ملے نہ ملے اور جب افراط ہو تو پروا نہیں کرتا۔

اور آخر میں ان کے ایک مختصر افسانے کا ذکر۔ ”کیسا یہ پیار ہے“ کے دو بیٹے۔ ایک مغربی اور دوسرا مشرقی۔ مغربی بیٹے کی ماں اسی شہر میں رہتی ہے جس میں وہ رہتا ہے لیکن اس کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ اپنی ماں سے مل سکے۔ مدرز ڈے پر اس نے اپنی ماں کے لئے وقت نکالا، اسے ہیروں کے ہار کا تحفہ دیا، ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلایا اور پورا دن اس کے ساتھ گزارا۔ مشرقی بیٹا امریکہ میں ڈاکٹر ہے مگر اس کی ماں ہزاروں میل دور اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے دیس میں رہتی ہے۔ مدرز ڈے پر وہ اپنی ماں سے فون پر باتیں کرتا ہے، اسے ہزار ڈالر بھجواتا ہے اور اپنی بہن سے کہتا ہے کہ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں وہ ماں کو کھانا کھلا دے۔ رعنا کوثر پوچھتی ہیں کہ زندگی یہاں پیار بھی نہیں کرنے دیتی۔ یہ کیسا پیار ہے؟

رعنا کوثر نیو یارک اور نیو جرسی کی ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ وہ ان گنے چنے چند لوگوں میں شامل ہیں جو نثر لکھتے ہیں ورنہ شاعر تو یہاں بہت مل جاتے ہیں۔ نثر نگاروں کی کمی ہے۔ میں رعنا کوثر سے درخواست کروں گا کہ وہ یونہی لکھتی رہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم جلد ہی ان کی دوسری کتاب پڑھیں گے۔ پہلی کتاب پر ان کو ڈھیر ساری مبارکباد!

☆

- بقیہ -

ادھوراپن مکمل ہے

مجھے یہ امید ہے
ایک دن تم ہم جیسوں میں شامل ہو گے
اور یہ دنیا ایک جیسی ہوگی۔۔۔!“

لیکن اس زمین پر زندگیوں کے سیّارے اپنے اپنے عقیدوں کے ستارے چن کر اپنے محور کے گرد رقصاں ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے سرطان زدہ قانون وعقیدے بغاوت پر اکسانے لگتے ہیں تو آوازوں کے درمیان بھی ویرانے گونجنے لگتے ہیں۔ فرزانوں کی بستی میں سچ کی راہ دکھانے والے دیوانوں کو عجوبہ سمجھا جاتا ہے اور یہ دیوانے تنہائی کا مرقع بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ سچ کی پوتھی کو جھوٹ کی بھٹی میں نہیں جھونکتے۔ یہ لاعلمی کے سکون کی سزا نہیں جھیلتے۔ یہ آگہی کے درد کی طمانیت میں جیتے ہیں۔ دنیا دھوئیں کا مسکن بنتی جا رہی ہے لیکن لینن جیسے لوگوں کی آنکھیں گرد و غبار میں بھی شفاف رہتی ہیں۔ بند دروازوں کو وا کرنے کے جنون میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ گھونٹ گھونٹ خواب پیتے ہیں۔ ان کے افکار کی سرفرازی کے پھول تند ہواؤں میں بھی نہیں بکھرتے۔ لینن کی طرح خواب دیکھنے والے عریاں حقیقتوں پر غلاف چڑھانے والوں سے جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کے عظیم جذبوں کے امڈتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر بھی شدید جذبوں کی موجیں سنگین چٹانوں پر کف اچھالتی رہتی ہیں اور جھاگوں کے بلبلے ریت میں گم نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کی انفرادیت کڑی دھوپ میں جھلس کر بھی زندہ رہتی ہے۔ ایسے لوگ انسانیت کی معراج کے خواب دیکھ کر چلے جاتے ہیں.... لیکن یہ تو نابیناؤں کا سیّارہ ہے جن کے لیے ادھوراپن مکمل ہے۔۔۔!

حمد میں دل کی بات کر لینا

نسیمِ سحر

(راولپنڈی)

کسی بھی مسلمان بچّے کے کان میں پیدائش کے فوراً بعد جو پہلی آواز اذان کی گونجتی ہے اُس کا پہلا لفظ ہی اللہ اکبر ہے گویا اللہ کی کبریائی کے اعتراف ہی سے ہر مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور پھر یہی جذبہ بشرطِ توفیق ہر مسلمان شاعر سے حمد کہلواتا ہے۔ ''حمد'' کا لفظ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی تعریف وثناء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کسی اور کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ سینئیر نقّاد اور شاعر جناب ڈاکٹر عزیز احسن کہتے ہیں:

''شعراء جب حمد یہ شاعری کرتے ہیں تو اُن کے سامنے اگر اپنے مسائل ہوں تو وہ دُعا یا مناجات کا انداز اپناتے ہیں۔ اگر کائنات کی تخلیق کے حوالے سے خالق کی عظمتوں کی طرف دھیان جائے تو اشیائے کائنات کے جزوی ذکر کے ساتھ خالق کی عظمت کا اعتراف شعروں میں ڈھل جاتا ہے، اور اگر خالق کی طرف سے مخلوق کو ملنے والی نعمتوں پر شکر کرنے کا جذبہ غالب ہو تو جذباتِ تشکّر شعری متن میں ڈھلتے ہیں''۔

حمد ونعت پر مبنی شاعری ہر اچھے مسلمان شاعر کے ایمان کا جزو ہوتا ہے۔ لیکن عجیب سی بات ہے کہ کئی عشروں تک حمد ونعت کو صرف عبدیت اور عقیدت کا اظہار سمجھا جاتا رہا اور اسے ایک صنفِ ادب کے طور پر جگہ نہیں ملی۔ اردو کی شاعری میں نعت تو پھر بھی کسی حد تک لکھی گئی مگر حمد کی جانب بہت کم شعراء نے توجہ دی۔ محافل میں بھی حمد خوانی خال خال ہی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے حمد ونعت سے جڑے ہوئے تنقید نگاروں اور شاعروں نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ حمد اس لیے رائج نہ ہو سکی کہ محفل یا تقریب کا آغاز جب آیاتِ قرآنی کی تلاوت سے ہوتا تھا تو اس کے بعد حمد پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی البتہ نعت کو ضرور جگہ ملی۔

تاہم مقامِ شکر ہے کہ گذشتہ چند برس سے حمد کی جانب شعرائے کرام نے توجہ دی ہے۔ محامد پر مشتمل بیشمار کتب بھی شائع ہو رہی ہیں۔ گذشتہ دنوں جب ایک کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے راقم السطور نے حمد گوئی کے موضوع پر مقالہ لکھا تو محض پنجاب ہی سے شائع ہونے والے نعتیہ مجموعوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ نکلی جبکہ پاکستان بھر سے شائع ہونے والے خالص حمد یہ مجموعوں کی تعداد کسی طور بھی ایک سو سے کم نہیں۔ تحقیق پر یہ بھی معلوم ہوا کہ نہ صرف سینئیر شعراء نے بلکہ نوجوان نسل کے شعراء نے بھی بڑی عمدہ حمد گوئی کی ہے اور اُن کے بھی حمد یہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آج قارئین سے ایک ایسے ہی نئی نسل کے نوجوان شاعر کا تعارف کرایا جا رہا ہے جس کی تا حال ایک نہیں بلکہ دو حمد یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے عنوان 'سائیں' اور 'صاحِب' ہیں۔ اس تبصرے کا موضوع اُن کا دوسرا حمد یہ مجموعہ 'صاحب' ہے، جو کہ ۲۰۱۸ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں 'صاحب' کو ردیف بنا کر محامد کہی گئی ہیں۔ اور کہیں کہیں صاحب کے ساتھ سابقہ یا لاحقہ بھی لگایا گیا ہے مثلاً صاحب کا، صاحب سے، صاحب کی، صاحب بے نیاز، صاحب جی، وغیرہ۔ یہ تمام محامد ایک بحر میں نہیں بلکہ شاعر نے حسبِ ضرورت مختصر یا طویل بحریں استعمال کی ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق کے اندر کا پہلا ہی شعر شاعر کی تخلیقی وسعت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے:

دل پہ کوئی بھی تھاپ ہے صاحب
آپ ہی کا الاپ ہے صاحب

حسن عباسی نے ''صاحب'' کے لفظ کو پورے ادب واحترام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ایسے خوبصورت اور اچھوتے شعری پیکروں میں ڈھالا ہے کہ اُن کی تخلیقی زرخیزی کی داد دینا پڑتی ہے۔

اس کتاب پر پیش لفظ یا تقاریظ لکھنے والوں میں سینئیر اور معروف شعراء شامل ہیں جن میں بشریٰ رحمٰن، نذیر قیصر، لطیف ساحل اور لبنیٰ صفدر شامل ہیں۔ بشریٰ رحمٰن جیسی ادیبہ، شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار اور دانشور نے اس کتاب کے پیش لفظ میں کیا خوب لکھا ہے: ''عشق تو بس ایک ہی ہے۔ 'صاحب' کا عشق۔ جسے نصیب ہو وہ صاحبِ دل بن جاتا ہے، صاحبِ حال اور صاحبِ قال ہو جاتا ہے''۔۔ اور صاحب کے لفظ کی سَنَد میں کہتی ہیں ''نعتیہ شاعری میں اِس سے پہلے برِّصغیر کے صوفیائے کرام نے بلکہ عربی اور فارسی کے صوفی شاعروں نے بھی صاحب کی اصطلاح کو معنوی اور لغوی اعتبار سے سجا اور بنا کر پیش کیا ہے۔'' جدید صاحبِ اسلوب شاعر نذیر قیصر شاعرانہ انداز میں لکھتے ہیں: ''۔۔ 'صاحب کی شاعری میں خدا حاکم نہیں، دوست ہے، خدا بادشاہ نہیں، بزرگِ برتر اور صوفی ہے، اور مولانا روم کی زبان میں خدا پیالہ نہیں پانی ہے۔۔ سچا شاعر صوفی ہوتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کے درمیان پرندے کی طرح سفارتکاری کرتا ہے''۔ اسی طرح معروف شاعر ایوب خاور کتاب کے عنوان کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''۔۔ 'صاحب' صرف کتاب کا عنوان ہی نہیں ساری کی ساری حمدوں کی ردیف بھی ہے۔۔۔ ہم دن میں کئی مرتبہ عقیدتاً اپنے عجز وانکسار کا اظہار کرنے کے لیے کہتے ہیں اللہ مالک ہے۔۔ 'صاحب' میں خود ایک ایسی جدت ہے جو کم از کم میں نے کسی حمد یہ مجموعے میں نہ دیکھی نہ پڑھی''۔ ایک اور معروف شاعر لطیف ساحل نے ان الفاظ میں اظہارِ رائے کیا ہے: ''حسن عباسی کے اِس حمد یہ کلام میں الفاظ کی درو بست بھی نویکلی ہے اور الفاظ بھی منفرد ہیں۔ اُس کی حمد یہ شاعری پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اُسے اللہ تعالی کی مصاحبت راس آ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کلام کو قبولیت کے شرف سے نوازا ہے''۔ حسن عباسی کی شریکِ حیات لبنیٰ صفدر، جو خود بھی ایک عمدہ شاعرہ ہیں، یوں ان کے شعری انداز کی تعریف

کرتی ہیں ’’حسن عباسی کی رومانوی شاعری کا عکس حمد میں بھی پوری طرح اُجاگر ہے۔۔ اختراع، خوش بیانی اور جذبہ انگیزی کے کیسے کیسے پھول اور پھول بھی انتہائی دلکش اور خوش رنگوں والے کھلے پڑے ہوئے ہیں۔ ’صاحب‘ شاعری ہی نہیں بلکہ وہ اندازِ تکلّم ہے جو براہِ راست اپنے خدا سے ہے‘‘۔

حسن عباسی اس عہد کے شاعر ہیں اور اس عہد میں رائج لفظیات سے بھی حمد گوئی میں ایک الگ انداز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے ایسے مضامین باندھتے ہیں جو اب سے پہلے حمد میں تو کیا، شاید غزل میں بھی نہیں استعمال ہوئے ہوں گے۔ اُن کی خدا سے ہم کلامی کا ایک جدید انداز دیکھیے:

اتنے مشکل کیوں کرتے ہو مسیج صاحب
آخر کتنا رکھتا ہوں مَیں نالج صاحب؟

انہوں نے کئی دیگر محامد میں انگریزی کے الفاظ بڑی سہولت اور خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں، ایک ایسا ہی حمدیہ شعر دیکھیے:

آپ کا اِسم آخری منزل
اسم پہلا سٹاپ ہے صاحب

حسن عباسی کی حمد گوئی کا اسلوب کچھ ایسا ہے کہ کہیں کہیں قاری بلکہ نقاد بھی چونک جاتا ہے کہ یہ گلے شکوے کسی انسان سے ہو رہے ہیں یا اللہ تعالی سے، مگر حسن عباسی کے پاس یہی جواز ہے کہ جب اُس نے اللہ کو ’صاحب‘ مان لیا تو پھر وہ ایک عام انسان کی طرح ایسے گلے شکوے کرنے اور ایسے ہی اسلوب میں اپنی محبت کا اظہار کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اس نے روزمرہ کی زندگی کے تمام مسائل، تمام دکھ درد اپنے صاحب سے بے تکلفی کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ اور کہیں کہیں اللہ کی بڑائی اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کا نائب ہونے کا بیان بھی ایک منفرد دلیل کے ساتھ کیا ہے:

خود پہ ایمان کیوں نہ لاؤں میں
میرے اندر کتاب ہے صاحب

وہ ایک ادبی جریدے ’’ارژنگ‘‘ کا مدیرِ اعلیٰ بھی ہے، اور ناشر بھی، اِس لیے اس نے ایک شعر یوں بھی کہا:

چیدہ چیدہ لوگ اسے پڑھ سکتے ہیں
چھپتا ہے محدود شمارہ صاحب کا

اس کے اس حمدیہ مجموعے میں کچھ خالص حمد کے شعر بھی اپنے جداگانہ اسلوب کے سبب اپنی طرف کھینچتے ہیں:

حمد لکھ کر بھی کم نہیں ہوتی
مجھ میں کیسی بھڑاس ہے صاحب
حمد کیا کرتے ہیں باری باری صاحب
کالے تیتر سے ہے اپنی یاری صاحب
حمد لکھتا ہوں روز پانی پر
گھر کے پہلو میں جھیل ہے صاحب
حمد میں دِل کی بات کر لینا
اپنا طرزِ سخن ہے صاحب جی
آپ کا نام لکھنے کی خاطر
سیکھتا ہوں میں خوش خطی صاحب
وضو سے اتری تھکن ہماری
نماز میں نیند آئی صاحب

اور ’صاحِب‘ کی ردیف میں کئی بحروں میں حمد نگاری کرتے ہوئے اگر اُسے کہیں احساس ہوا ہے کہ وہ روایتی حمد گوئی سے ذرا ہٹ گیا ہے تو اس نے کسی نقّاد کے خوف یا ’خوفِ فسادِ خلق‘ کے تحت اپنے ایسے اشعار اس حمدیہ مجموعے سے خارج نہیں کیے بلکہ انہیں پورے اعتماد کے ساتھ شامل کیا ہے کہ الفاظ کے عمیق مفاہیم میں اترنے والے اور وسیع تر ویژن رکھنے والے نقّاد اور قاری انہیں رد نہیں کر سکتے:

صرف کانٹے نہیں ہیں پیروں میں
سر کے اندر بھی کیل ہے صاحب
لاڈ اور پیار نے بگاڑا ہے
آپ کی ساری ڈھیل ہے صاحب
درگزر کی اپیل ہے صاحب
اشک میرا وکیل ہے صاحب

خود حسن عباسی اس مجموعے کے آخر میں اپنے نثری نوٹ میں کہتا ہے ’’یہ خدا کے حضور نیا گیت ہے جو انسان اور خدا کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ حمد مکمل عقیدت ہے، محبت میں گندھی ہوئی عقیدت، اور شکوہ کے بغیر محبت ناممکن:

شکوے ہوں گے ہزار صاحب سے
ہو گیا ہم کو پیار صاحب سے

یہی میری حمد ہے۔۔‘‘

اور واقعی ’صاحِب‘ میں ہر شعر پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ یہی حسن عباسی کی حمد ہے۔ سلامت رہو حسن عباسی کہ تُم نے حمد گوئی کو ایک نیا آہنگ اور انداز عطا کیا ہے۔

باغی

وہ پتا جو (زوال) خزاں میں نہیں گرتا وہ اپنی برادری کی نظر میں غدار، درخت کی نظر میں وفادار، اور موسموں کی نظر میں باغی ہوتا ہے۔

میکسم گورکی

''اردو کی محبت میں''

(فنونِ لطیفہ کو پروان چڑھانے والے غیر اردوداں تخلیق کار)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

علّامہ مُحَمَّد اِقبال	(سیالکوٹ، پنجابی)
اَشفاق اَحمد	(فیروز پور، پنجابی)
مُمتاز مُفتی	(بٹالہ، پنجابی)
غُلام عَبّاس	(اَمرِتسر، پَنجابی)
صُوفی غُلام مُصطَفیٰ تَبَسُّم	(اَمرِتسَر، پنجابی)
عَطاء الحَق قاسمی	(اَمرِتسَر، پَنجابی)
اَمر تا پرِیتَم	(گُوجرانوالہ، پَنجابی)
ن م راشِد	(گُوجرانوالہ، پَنجابی)
اِمتیاز علی تاج	(لاہور، پنجابی)
ضیاءُ مُحیِ الدّین	(لائلپُور، پَنجابی)
مولوی مُحَمَّد حُسَین بٹالوی	(بٹالہ پنجاب)
سَنتوش کُمار	(لاہور، پنجابی)
آغا علی عَبّاس طالِش	(لُدھیانہ، پنجابی)
سَعادَت حَسَّن مَنٹو	(لُدھیانہ، پنجابی)
عُثمان پیرزادہ	(لاہور، پنجابی)
راحَت کاظمی	(شِملہ، پنجابی)
سَلیم مِرزا	(اوکاڑہ، پَنجابی)
ساحِر ہوشیارپُوری	(ہوشیارپُور پنجابی)
طُفَیل ہوشیارپُوری	(ہوشیارپُور پَنجابی)
ساحِر لُدھیانوی	(لُدھیانہ، پنجابی)
اِبنِ اِنشاء	(جالَندھر، پنجابی)
فَیض اَحمد فیض	(سیالکوٹ، پنجابی)
ن م راشِد	(گُوجرانوالہ' پَنجابی)
آغا شورِش کاشمیری	(لاہور، پنجابی)
سَیَّد ضَمیر جعفری	(جہلم، پنجابی)
اَمجَد اِسلام اَمجَد	(لاہور، پَنجابی)
مُنیر نیازی	(خان پُور، پنجابی)
ظَفَر علی خان	(وَزیرآباد، پنجابی)
مَجید اَمجَد	(جَھنگ، پَنجابی)
حَبیب جالِب	(ہوشیارپُور، پنجابی)

اَحمد بَشیر	(گُوجرانوالہ، پنجابی)
مولانا عَبدُ المَجید سالِک	(بٹالہ، پَنجابی)
ڈاکٹر عَرش صِدّیقی	(گُورداسپُور، پنجابی)
حَفیظ جالَندھری	(جالَندھر، پنجابی)
اَحمد نَدیم قاسمی	(خوشاب، پوٹھوہاری پنجابی)
علاؤُ الدّین	(راوَلپِنڈی، پوٹھوہاری پنجابی)
قَتیل شِفائی	(ہری پُور ہزارہ، ہِندکو پنجابی)
کرنل مُحَمَّد خان	(چکوال، پوٹھوہاری پنجابی)
پیر مہر علی شاہ	(گولڑہ شَریف، پوٹھوہاری پنجابی)
پیر نَصیرُ الدّین نَصیر	(گولڑہ شَریف، پوٹھوہاری پنجابی)
قُدرَتُ اللّٰہ شَہاب	(کَشمیر، پہاڑی پنجابی)
مولانا چراغ حَسَّن حَسرَت	(بارہ مولہ، پہاڑی پنجابی)
شَفیقُ الرَّحمٰن	(روہتگ، ہریانوی)
سَیَّد قاسِم محمُود	(روہتگ، ہریانوی)
ڈاکٹر اِسرار اَحمد	(حِصار، ہریانوی)
ضیاءُ الدّین اَحمد سُلہری	(حِصار، ہریانوی)
پروفیسر ثاقِب	(پانی پَت، ہریانوی)
نُصرَت صِدّیقی	(کرنال، ہریانوی)
ساغَر صِدّیقی	(اَنبالہ، ہریانوی)
ناصِر کاظمی	(اَنبالہ، ہریانوی)
وَقار اَمبالوی	(اَنبالہ، ہریانوی)
حَسرَت جَے پُوری	(جَے پُور، راجھستانی)
مُشتاق اَحمد یُوسُفی	(جَے پُور، راجھستانی)
جگجیت سِنگھ	(بیکانیر، راجپُوتانہ، راجھستانی)
واجِد علی یاس یگانہ چنگیزی	(پٹنہ، بہاری)
کَمال اَحمد رِضوی	(پٹنہ، بہاری)
مولانا سَیَّد سُلیمان نَدوی	(پٹنہ، بہاری)
مولانا عَطائُ اللّٰہ شاہ بُخاری	(پٹنہ، بہاری)
مُنشی پریم چند	(بَنارَس، بھوجپُوری)
پَطرَس بُخاری	(پِشاوَر، پَشتو)
اَحمد فراز	(کوہاٹ، پَشتو)
سَردار عَبدُ الرَّب نَشتَر	(پِشاوَر، پَشتو)
نُورُ الہُدیٰ شاہ	(سِندھ، سِندھی)
گوپی چند نارنگ	(دُکّی، بلوچی)
اورَنگزیب لَغاری	(ڈی جی خان، ڈیرہ والی پنجابی)
کَمال ایرانی	(ایرانی، فارسی)

ایک صدی کا قصّہ

انل بسواس

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

انیل بسواس کے بارے میں دلیپ کمار صاحب کہا کرتے تھے۔ اوپر خدا ہے اور نیچے انیل دا ہے۔ انیل کرشنا بسواس جو کہ موسیقی کی دنیا میں انیل بسواس کے نام سے جانا جاتا ہے 7 جولائی 1914 کو مشرقی بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں بارسل میں جے سی بسواس کے گھر پیدا ہوا جو کہ اب بنگلہ دیش میں ہے۔ اُس کا باپ جگدیش چندر بسواس ایک معمولی سرکاری ملازم تھا۔ اُس کی ماں کو موسیقی کے ساتھ لگاؤ تھا اور وہ اکثر بھجن گایا کرتی تھی۔ یہ ماں ہی تھی جس نے بچپن میں ہی انل دا کو موسیقی کی تربیت دلوا دی۔ اُس نے بچپن سے ہی ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ بچپن سے ہی اُس میں سنگیت سے کا رجحان تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں کئی سارے سازوں کے ساتھ طبع آزمائی کرتا تھا۔ جب وہ چودہ سال کا تھا تو اُس نے طبلہ بجانے میں مہارت حاصل کی تھی۔ کچی عمر سے ہی نہ صرف گانے گائے بلکہ وہ میوزک کنسرٹس میں بھی حصہ لینے لگا۔ دھیرے دھیرے کلکتہ میں اُس کا نام ہونے لگا۔ وہ ناٹکوں میں سنگیت دینے لگا۔ اسی بیچ اُس نے رنگ محل تھیٹر میں داخلہ لیا۔ یہاں اُس نے اداکاری بھی کی، گانے بھی گائے اور ساتھ ہی معاون سنگیت کار کے طور بھی کام کرنے لگا۔ اسی لڑکپن کے دور میں اُس نے ہندوستان کی آزادی کی مہم میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینا شروع کیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اُس کے اندر جذبہ آزادی کا جنون اس حد تک بھر گیا تھا کہ وہ اُس نے کئی بم دھماکوں میں حصہ لیا۔ ملک دشمن سرگرمیوں کی پاداش میں اُسے چھ بار جیل بھیج دیا گیا جس سے اُس کی تعلیم پر کافی برا اثر پڑا۔ اُسکی باغیانہ سرگرمیاں اُس کے لئے سم قاتل ثابت ہوئیں۔ وہ میٹرک سے آگے اپنی پڑھائی پوری نہ کر سکا۔ 1930 میں اُس کے والد کا انتقال ہوا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ کافی دل برداشتہ ہوا اور مزید حراست سے بچنے کے لئے وہ کلکتہ سے بھیس بدل کر فرار ہوا۔ یہ اُس کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے کئی طرح کے چھوٹے موٹے کام کئے۔ دل میں انتشار اس قدر بھر گیا تھا کہ کوئی بھی کام کرنے میں اُسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اُسے پرائیویٹ میوزک ٹیچر کا کام ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کام سے فیضیاب ہوتا، پولیس کو کہیں سے اُس کی موجودگی کی بھنک لگ گئی اور وہ اُسے پکڑ کر لے گئی۔ اسی دوران مشرقی بنگال کے مایہ ناز شاعر نذرالاسلام جو کہ اُس کی صلاحیتوں کو پہچان گیا تھا اور وہ اُسکے تھیٹر کے ساتھ جڑ بھی گیا تھا۔ اُس نے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کر کے نہ صرف اُسے جیل سے رہا کروا دیا بلکہ میگھا فون گراما فون کمپنی میں نوکری بھی دلوا دی۔ اُس نے اس کمپنی کے لئے کافی گانے ریکارڈ کئے مگر اُن میں سے ایک بھی گانا بازار میں نہیں آیا۔ اس عدم توجہی سے اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے اس کمپنی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ نتائے موتی لال جو کہ اپنے زمانے کا ایک جانا مانا موسیقار تھا، اُس کی سفارش سے اُسے رنگ محل تھیٹر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ 1932 سے لے کے 1934 تک اُس نے کئی سارے کمرشل اسٹیج پروڈکشن میں حصہ لیا جہاں اُس نے نہ صرف اداکاری کی بلکہ اُس نے گانے بھی گائے۔ اُس نے خیال، ٹھمری اور دادرا گائن میں مہارت حاصل کی تھی۔ انل دا نے ”ہندوستان ریکارڈنگ کمپنی“ میں بطور گلوکار، گیت کار اور موسیقار کام کیا۔ یہ وہی کمپنی ہے جہاں کندن لال سہگل اور سچن دیو برمن نے بھی کام کیا تھا۔ اس بیچ اُس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ اُس نے گائیکی میں خاصا نام کمایا۔ اُس کی سریلی آواز لوگوں کو خوب بھا گئی۔

1934 میں بنگال کے جانے مانے ہدایت کار ہرن بوس جو اُسے ایک عرصے سے جانتا تھا اُس کی صلاح پر اُس نے کلکتہ کو الوداع کہہ کے بمبئی کا رخ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب پلے بیک کا چلن شروع ہوا تھا۔ ہرن بوس کی سفارش سے اُسے بمبئی کے ”کمار موی ٹون میں نوکری مل گئی۔ یہ نوکری زیادہ دن تک نہیں چلی۔ ایک دن کمپنی کے منیجر سے اُس کا جھگڑا ہوا۔ اُسے نوکری سے برخواست کیا گیا۔ وہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہا۔ اُسے بہت جلد ایسٹرن آرٹ سنڈکیٹ میں نوکری مل گئی اُس نے اپنی قابلیت کے حساب سے کئی طرح کے کام کئے۔ بالآخر وہ آزادانہ طور پر فلم میں موسیقی دینے میں کامیاب رہا۔ اُسے پہلا بریک 1935 میں ”دھرم کی دیوی“ کی پس منظر کی موسیقی تیار کرنے کا آزادانہ موقع ملا۔ اس کمپنی کے روح رواں تھے دو بھائی فلمساز کے ایس دریانی اور ہدایت کار رام دریانی۔ اُس نے فلم ”بال ہتیا“ اور فلم ”بھارت کی بیٹی“ کی موسیقی میں بطور معاون کام کیا۔ اس فلم میں اُس نے بیک گراونڈ موسیقی ہی نہیں دی بلکہ اس فلم میں اداکاری بھی کی اور گانے بھی گائے۔ اُس نے رام دریانی کی کمپنی کو جلدی ہی خیر باد کہہ دیا اور وہ ”ساگر موی ٹون“ میں چلا گیا جہاں اُس نے معاون سنگیت کار کے طور پر موسیقار اشوک گھوش کے ساتھ فلم ”منموہن“ اور ”دکن کوئن“ میں کام کیا۔ جب یہ کمپنی یوسف فضل بوائے کی کمپنی ”نیشنل اسٹوڈیو“ میں ضم ہو گئی تو بھی وہ بدستور کام کرتا رہا۔

اگلے دو سالوں میں اُس نے گیارہ فلموں کے لئے موسیقی ترتیب دی۔ تمام تر فلمیں سٹنٹ فلمیں تھیں جن سے اُس کو کوئی خاص پہچان نہ ملی۔ بہت جلد اُس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو گئی۔ اُسے محبوب خان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ فلم تھی ”جاگیردار“۔ یہ فلم 1937 میں ریلیز ہوئی اور بیحد کامیاب رہی۔ اس فلم نے انل بسواس کو بے پناہ شہرت بخشی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ محبوب خان اور انل بسواس کی ایسی دوستی تھی کہ محبوب خان اُسے بنگالی کہہ کر بلاتا تھا جب کہ انل دا اُسے موالی کہہ کر چڑایا کرتا تھا۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد اُس کی مانگ بڑھ گئی۔ بہت سارے فلمساز اُس کے ساتھ کام کرنے کے خواہش مند تھے۔ ”تین

سودن‘‘ ’’گراموفون سنگر‘‘ ’’ہم تم اور وہ‘‘ ’’ایک ہی راستہ‘‘ محبوب خان کی فلم ’’وطن‘‘ ’’علی بابا‘‘ اور محبوب خان کی کلاسک ’’عورت‘‘ جو بعد میں ’’مدر انڈیا‘‘ کے نام سے دوبارہ کلر میں بنائی گئی۔ یہ فلم 1940 میں ریلیز ہوئی۔ فلم ’’علی بابا‘‘ کا ایک قصہ ہے کہ اس فلم کا ایک گانا ’’کاہے کرتا دیر براتی‘‘ انل دا خود گانا چاہتا تھا جب کہ محبوب خان کو یہ منظور نہیں تھا۔ دونوں اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ اُنہوں نے آپس میں بول چال بند کردی۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے کیمرہ مین فریدوں ایرانی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ آخر میں محبوب خان کو جھکنا پڑا۔ اس کے باوجود اُن کی دوستی میں کوئی دراڑ نہیں پڑی۔ اس تلخی کے بعد آئی فلم ’’بہن‘‘ جو کہ نیشنل اسٹوڈیوز کی فلم تھی اور اس کے ہدایت کار محبوب خان تھے۔ فلم ’’روٹی‘‘ بھی محبوب خان کی فلم تھی۔ اس میں انل بسواس نے سنگیت ہی نہیں بلکہ اس کہانی کا مرکزی خیال بھی انل بسواس کا ہی تھا۔ یہ اپنے زمانے کی کامیاب فلم رہی ہے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس فلم میں اختر بائی فیض آبادی نے نہ صرف اداکاری کے جلوے دکھائے تھے بلکہ اس کے بیشتر گانے بھی اُسی کی آواز میں ریکارڈ کئے گئے تھے۔ یہ اختر بائی فیض آبادی کوئی اور نہیں بلکہ بیگم اختر تھی جسے غزلوں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہ گانے کسی کاروباری تنازعے کی وجہ سے فلم سے نکال دئے گئے۔

انل بسواس اب سنگیت کا ایک معتبر نام بن گیا تھا۔ بمبئی ٹاکیز جس کا طوطی بولتی تھا، اس فلم کمپنی کی روح رواں دیوکا رانی کی طرف سے انل بسواس کو ایک فلم کی پیشکش ہوئی جس کا نام ’’قسمت‘‘ تھا جس کے مرکزی کردار اشوک کمار اور ممتاز شانتی تھے۔ یہ فلم ششادھر مکھرجی کے چھوٹے بھائی گیان مکھرجی کی ہدایت میں بننے والی فلم تھی۔ اس فلم میں کل آٹھ گانے تھے۔ جنہیں امیر بھائی کرناٹکی ،خان مستانہ، اشوک کمار، ارون کمار اور پرل گھوش نے اپنی آواز بخشی تھی۔ پرل گھوش انل دا کی چھوٹی بہن تھی جس نے گائیکی میں خوب نام کمایا تھا۔ پرل گھوش، پنا لال گھوش کی اہلیہ ہیں جس نے بانسری وادن میں خوب نام کمایا ہے۔ فلم ’’قسمت‘‘ کے بارے میں کسی نے سوچا نہیں تھا کہ یہ بمبئی ٹاکیز کی ہی نہیں بلکہ کئی سارے لوگوں کی قسمت بدل کے رکھ دے گی۔ یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔ اس کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ کلکتہ کے ایک سینما ہال میں تین سال تک مسلسل چلتی رہی۔ اس فلم کا ریکارڈ لیش چوپڑا کی فلم ’’دل والے دلہنیا لے جائیں گے‘‘ نے توڑا۔ اس فلم کی موسیقی نے فلم میں چار چاند لگا دئے۔ ایک ایک گانا نگینے کی طرح فلم میں جڑا ہوا تھا۔ دور ہٹوا ے دنیا والو، اب تیرے سوا کون میرا کرشن کنہیا، دھیرے دھیرے آ رے بادل میرا بلبل سو رہا ہے، ہم ایسی قسمت کو، ایک دن ہم کو ہنسائیں، پپیا رے میرے پیا سے کہیو جا اور تیرے دکھ کے دن پھریں گے، زندگی بن کے جیا جا۔ سارے کے سارے گانے زبان ذد عام ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں یہ فلم دو لاکھ میں بن کر تیار ہوئی تھی جب کہ اس فلم نے ایک کروڑ کا کاروبار کیا۔

امیہ چکرورتی کی ہدایت میں بننے والی فلم ’’جوار بھاٹا‘‘ جو کہ دلیپ صاحب کی پہلی فلم تھی، اس فلم کو سنگیت سے آراستہ کرنے کے لئے انل بسواس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس فلم میں نو گانے تھے جسمیں سے ایک گانا انل بسواس کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ یہ فلم خاص چلی نہیں۔ یہ فلم 1944 میں ریلیز ہوئی۔ اس کے فوراً بعد دلیپ کمار کو لے کر بمبئی ٹاکیز نے ایک اور فلم شروع کی جس کا نام ’’ملن‘‘ تھا۔ اس فلم کا سنگیت بھی انل بسواس نے ہی دیا۔ اس فلم کا ہدایت کار مشہور ہدایت کار نتن بوس تھا جس کے ماتحت کسی زمانے میں بمل رائے نے بھی بطور کیمرہ مین کام کیا تھا۔ یہ فلم کامیاب رہی۔ اس فلم کے گانے آرزو لکھنوی اور پی ایل سنتوشی نے لکھے تھے۔ اس فلم کے گانے خوب مقبول ہوئے۔ اسی دوراں انل بسواس اور دلیپ کمار کی دوستی ہوگئی۔

انل بسواس وہ پہلا شخص ہے جس نے مکیش کو پہلا بریک دیا۔ کہا جاتا ہے کہ فلم ’’پہلی نظر‘‘ کے لئے مکیش کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ ہونے والا تھا۔ برسات کے دن تھے۔ شہر میں خوب بارش ہورہی تھی جس کی وجہ سے شہر کا ٹرانسپورٹ سسٹم درہم برہم ہو کے رہ گیا تھا۔ اُدھر انل بسواس اپنے سازندوں کے ساتھ ریکارڈنگ روم میں مکیش کا انتظار کر رہا تھا اور ادھر مکیش ریکارڈنگ روم تک پہنچنے کے لئے پیدل چلا آرہا تھا کیونکہ اُسے کوئی بھی سواری مل نہیں پا رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب وہ ریکارڈنگ روم میں پہنچا تو انل بسواس اُسے دیکھ کے بھنّا اُٹھا اور اُس نے طیش میں آکر اُسے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ اُس کے بعد اُسے مائک کے سامنے کھڑا ہونے کے لئے کہا گیا۔ گانا تھا ’’دل جلتا ہے تو جلنے دے‘‘ جو کہ ایک درد بھرا گانا تھا۔ چونکہ اُس کا من کافی دکھی تھا اسلئے وہ سارا درد گانے میں چھلک کے باہر آگیا۔ گانا ختم ہونے کے بعد انل بسواس نے مکیش کو گلے سے لگایا اور اُس سے معافی بھی مانگی۔ اس گانے نے مکیش کی زندگی بنادی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مصروف گلوکار بن گیا۔ یہ انل بسواس ہی تھا جس نے مکیش کو سمجھایا کہ وہ کسی اور گلوکار کی نقل نہ کرے بلکہ اپنے اسٹائل میں گانے کی کوشش کرے۔ اُن دنوں ہر گلوکار کے ایل سہگل کی نقل کیا کرتا تھا۔ یہ وہی گانا ہے جسے سن کے کے ایک سہگل نے اپنے سیکرٹری سے دریافت کیا کہ یہ گانا اُس نے کب گایا تو سیکرٹری نے اُس کا یہ مغالطہ دور کر دیا کہ یہ گانا اُنہوں نے نہیں بلکہ ایک نئے گلوکار نے گایا ہے جس کا نام مکیش چندر ماتھر ہے۔ اتنا اثر تھا سہگل کا مکیش پر کہ سہگل صاحب بھی غچہ کھا گئے۔

دوسرا گلوکار طلعت محمود تھا جسے انل بسواس نے پہلا بریک دیا تھا۔ وہ تپن کمار کے نام سے بنگال میں کافی مشہور تھا۔ انل بسواس چونکہ خود بنگالی تھے اور وہ اکثر طلعت محمود کے گانے سنا کرتے تھے۔ وہ اُن دنوں فلم ’’آرزو‘‘ پر کام کر رہے تھے جسمیں عظیم اداکار دلیپ کمار اور کامنی کوشل کام کر رہے تھے۔ انل بسواس نے تپن کمار کو دلیپ کمار کے لئے گوانے کا فیصلہ کیا۔ تپن کمار کو دو بار بلایا گیا مگر وہ انل بسواس سے نہیں ملا۔ تیسری بار انل بسواس اُس سے خود ملنے گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا تم اپنے آپ کو اتنا بڑا گلوکار سمجھتے ہو کہ میرے دو بار بلانے پر بھی تم مجھ سے

ملنےنہیں آئے۔ اصل میں اُسکے یاردوستوں نے اُسے ڈراکے رکھا تھا کہ ایک بار اگر تم انل بسواس سے ملوگےتو وہ تمہیں سنتے ہی رد کردے گا کیونکہ تمہاری آواز میں جو لرزش ہے وہ تمہاری گائیکی میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے۔ اس لرزش کی وجہ سے کئی موسیقاروں نے اُسے رد کردیا تھا۔ وہ جب انل بسواس کے سامنے پیش ہوا تو انل بسواس نے اُسے دھن سمجھائی اور پھر اُس کے ہاتھ میں گانا تھما دیا۔ گانے کے بول تھے۔ ''اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو۔'' اُسے دوستوں کی کہی ہوئی بات یادتھی اسلئے جب وہ ریکارڈنگ روم میں چلا گیا تو وہ اپنی مخملی آواز میں نہ گا کراس گانے کوسہگل کے انداز میں گانے لگا۔ انل بسواس نے جب تپن کمار کی آواز سنی تو وہ چکرا کے رہ گئے۔ اُسنے فوراً ریکارڈنگ روکنے کا حکم دیا اور تپن کمار کو باہر بلایا گیا۔ انل بسواس دکھ اور حیرت سے تپن کمار کی طرف دیکھ کر بولے۔ تم کون ہو؟ تپن کمار نے کہا کہ میں طلعت محمود ہوں۔ انل بسواس نے غصے سے کہا کہ تم طلعت محمود ہو ہی نہیں سکتے تم کوئی بہروپیہ ہو۔ طلعت کی آواز میں جولرزش ہے وہ تمہاری آواز میں ہے ہی نہیں۔ طلعت نے شرمسار ہوکے کہا کہ بات یہ ہے کہ مجھے دوستوں نے ڈرا کے رکھا تھا کہ انل دا کے سامنے یہ آواز نہیں چلے گی۔ وہ تم کو پہلی ہی نشت میں رد کردیں گے اسلئے میں نے اپنی آواز بدل ڈالی۔ انل دا نے مسکرا کے کہا کہ میں نے تمہیں تمہاری آواز کی لوچ اور لرزش کی وجہ سے پسند کیا۔ اُسکے بعد طلعت محمود نے اُسی مخملی آواز میں اپنا گانا ریکارڈ کیا جس نے طلعت محمود کو کامیابی سے ہمکنار کردیا۔ طلعت محمود ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ یہ انل بسواس ہی ہے جس نے طلعت کو سمجھایا کہ وہ ایکٹنگ کے لئے نہیں بنا ہے۔ اگر اُس نے ایکٹنگ کو گانے پر ترجیح دی تو یہ اُس کے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ بہت جلد طلعت محمود کو اس بات کا احساس ہوگیا کیونکہ اُس کی کوئی بھی فلم چل نہیں پائی جب کہ اُس کے گانے سر چڑھ کے بول رہے تھے۔ اُس نے انل بسواس کے مشورے کو سر آنکھوں سے لگایا اور اُس نے اداکاری کو ہمیشہ کے لئے تلانجلی دی اور سارا وقت اپنی گائیکی پر صرف کرنے لگا۔

بہت سارے گلوکاروں کی کامیابی کے پیچھے انل بسواس کا ہاتھ تھا جن میں سریندر ناتھ، پارل گوش، امیر بائی کرناٹکی، روشن آرا بیگم اور لتا منگیشکر تھیں۔ لتا منگیشکر کو انل دا نے جب پہلی بار سنا تو وہ نور جہاں کے اسٹائل میں گا رہی تھی کیونکہ اُس دور میں نور جہاں کی آواز کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ انل دا نے لتا کو ڈانتے ہوئے کہا۔ ''تم نور جہاں ٹو کیوں بننا چاہتی ہو۔ تم لتا منگیشکر نمبر ون کیوں بننا نہیں چاہتی۔ کسی کی نقل کرنے سے اچھا ہے کہ تم اپنی آواز میں گانے کی کوشش کرو۔ تمہاری آواز میں جو لوچ اور مٹھاس ہے وہ ایک دن تمہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دے گی۔'' لتا منگیشکر نے انل دا کی بات گرہ میں باندھ لی اور اُس نے اپنی آواز میں گانے گائے جنھوں نے دھوم مچا دی۔ لتا منگیشکر انل بسواس کے اس احسان کا ذکر بار بار کرتی ہیں اور ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کرنے سے کبھی احتراز نہیں کیا کہ انل دا نے اُسے مائک کے سامنے کیسے سانس روکنی چاہیے یہ سب سکھایا۔

انل بسواس ایک رومان پسند آدمی تھا۔ پہلی بار اُسے ایک لڑکی سے پیار ہوا جو اُس سے چار سال بڑی تھی۔ اس لڑکی کا اصلی نام مہرالنسا تھا۔ ''شکتی موی ٹون میں شامل ہونے کے بعد اُس نے اپنا نام بدل کر آشا لتا رکھ دیا۔ اُس نے شکتی موی ٹون کی تین فلموں میں کام کیا جن کے نام تھے ''آزادی'' ''سنجیو موِرتی '' اور ''ستی تورل ''۔ اس کے علاوہ اُس نے بمبئی ٹاکیز کی ''چار آنکھیں'' 1944 اور پربھات فلمز کی ''سورن بھومی'' میں بھی کام کیا۔ اُس نے محبوب خان کی فلم ''منموہن'' کے علاوہ پرتھوی راج کپور کے مدمقابل ''دیپک'' میں کام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں لکس صابن کے جس اشتہار نے دھوم مچائی تھی اُس میں کام کرنے والی اداکارہ آشا لتا ہی تھی۔ انل بسواس اور آشا لتا کی ملاقات نیشنل اسٹوڈیوز کی فلم ''منموہن'' کی فلم بندی کے دوران ہوئی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ آنکھیں ہوئی چار دل میں آیا پیار۔ دونوں پیار کے بندھن میں بندھ گئے۔ جلدی ہی دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ انل بسواس کے گھر والے اس شادی کے خلاف تھے۔ اُس نے اپنے پریوار کی مخالفت کے باوجود اس لڑکی سے شادی کی۔ اُس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ بیٹوں کے نام ہیں پردیپ، امیت اور اُتپل جب کہ بیٹی کا نام شکھا ہے۔ اُتپل باپ کے نقش قدم پر چلا اور اُس نے امر اُتپل کی جوڑی بنا کر کئی فلموں میں سنگیت دیا جن کے نام ہیں ''شہنشاہ'' ''میں آزاد ہوں'' اور ''آجا میری جان'' ہے۔

1946 میں اُس نے بمبئی ٹاکیز کو خیر باد کہہ دیا اور اُس نے اپنا پروڈکشن ہاوس کھول لیا جس کا نام رکھا گیا، ''وئرائٹی پکچرس''۔ یہ کمپنی اُس نے اپنی بیوی آشا لتا کے نام سے کھولی۔ اس بینر کے تلے اُنھوں نے چار فلمیں بنائیں جن کے نام ہیں ''لاڈلی'' 1949 ''لاجواب'' 1950 ''بڑی بہو'' 1951 اور ''ہمدرد فلم ''لاڈلی'' کے لئے لتا منگیشکر نے ایک بھی پیسہ نہیں لیا۔ اُس نے سارے گانے بنا کسی معاوضے کے گائے۔ آشا لتا نے لتا کے اس احسان کو ایک بار ہیرے دے کر چکایا۔ شاید یہ اُن ہی ہیروں کی کرامات تھی کہ لتا منگیشکر کو ہیروں سے پیار ہوگیا اور وہ آج بھی ہیرے پہننے کی شوقین ہے۔

اس بیچ ایک ایسی فلم آئی جس نے انل بسواس کے سنگیت کا ہر خاص و عام کو دیوانہ بنا دیا۔ فلم تھی ''ترانہ''۔ 1951 کی یہ فلم اپنے لازوال گانوں کی وجہ سے آج بھی اُتنی ہی مقبول ہے جتنی اُس زمانے میں تھی۔ اس فلم کے اداکار تھے دلیپ کمار، مدھو بالا، شیاما اور جیون۔ یہ اُسی رام دریانی کی فلم تھی جس کے ساتھ انل بسواس نے اپنے فلمی کیریر کی ابتدا بطور معاون سنگیت کار کی تھی۔ دلیپ صاحب کی یہ خواہش تھی کہ اس فلم کو انل بسواس اپنے سنگیت سے آراستہ کریں گے۔ یہ ایک رومانٹک فلم تھی جس میں دلیپ کمار اور مدھو بالا کی فطری اداکاری کے ساتھ انل بسواس کے گانوں نے جادو کا کام کردیا تھا۔ اس فلم کے گانے ایسے سُریلے تھے کہ سننے والا ان گانوں کے سحر میں کھو جاتا تھا۔ کون بھول سکتا ہے طلعت محمود اور لتا منگیشکر کے اس دوگانے کو، سینے میں سُلگتے ہیں ارمان، آنکھوں

میں اُداسی چھائی ہے۔ نین ملے نین ہوئے باورے، لتا اور طلعت محمود، مجھ سے روٹھ گئے میرا سانوریا کس کی لگی دل کو نظریا، واپس لے لے یہ جوانی، لتا منگیشکر۔ کیا خبر تھی کہ محبت میں یہ دن آتے ہیں۔ وہ دن کہاں گئے بتا ۔ لتا منگیشکر واپس لے لے یہ جوانی۔ او جوانی دینے والے۔ لتا منگیشکر اسی فلم میں ایک گانا تھا جو بڑا اچنچل قسم کا گانا تھا۔ یوں چپکے چپکے میرا آنا یاد رہے بھول نہ جانا۔ ہم کو ستاؤ گے، بڑا دکھ پاؤ گے لگ جائے گی میری ہائے۔ یہ خوبصورت گانے پریم دھون اور ڈی این مدھوک نے لکھے تھے۔ اس فلم نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دئے تھے۔ اس فلم کی کامیابی میں دلیپ کمار اور مدھو بالا کی رومانی جوڑی کے ساتھ انل بسواس کے گانوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ یہ فلم مدھو بالا کی سب سے بہترین فلم تسلیم کی جاتی ہے۔

ایک اور فلم تھی جس کے گانے بیحد مقبول ہوئے تھے ۔ یہ فلم تھی ''آرام'' جس کے اداکار دیو آنند اور مدھو بالا تھے ۔ ساتھ میں طلعت محمود بھی تھے۔ اس فلم میں بھی انل بسواس کے مدھ بھرے گانوں نے دھوم مچائی تھی ۔ اے جان جگر دل میں سما کے آجا۔ مکیش۔ او متوالے من میں کسی کی پریت بسا لے۔ لتا منگیشکر، روٹھا ہوا چندا ہے، روٹھی ہوئی چاندنی۔ آواز لتا، مل مل کے بچھڑ گئے نین۔ آواز لتا، شکریہ اے پیار تیرا شکریہ۔ آواز طلعت محمود، بالم وانا دان، لتا۔ انل بسواس نے سینکڑوں گانوں کو اپنی دھنوں سے آراستہ کیا۔ میں نے چند گانوں کا ذکر اس لئے کیا کہ یہ وہ گانے ہیں جن میں اس مٹی کی خوشبو ہے۔ جن کی دھنوں کا آدھار کسی راگ پر ہے۔ ان گانوں میں جو مٹھاس اور سادگی ہے اُس نے ان گانوں کو لازوال بنادیا ہے۔

انل بسواس کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ رہی ۔ آشا لتا سے چار اولادیں ہونے کے باوجود اُن کے رشتے میں دراڑ پڑ گئی۔ 1954 میں ان دونوں کے بیچ طلاق ہوا۔ طلاق کے چار سال بعد اُس نے مینا کپور نام کی ایک گلوکارہ سے شادی کی جس سے اُسکی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ مینا کپور گائکی میں نام بنا چکی تھی۔ انل دا کی جیون ساتھی بننے کے بعد اُس کی گائکی کو جلا ملی۔ اُس نے انل بسواس کی ہر اُس فلم میں گانا گایا جس کی موسیقی اُس نے دی تھی۔ مہرالنسا طلاق کے بعد اکیلی زندگی گزارتی رہی۔ 1992 میں وہ اس دنیا فانی سے رخصت ہوئیں۔

فلمی دنیا میں اپنے آخری ایام میں اُسنے خواجہ احمد عباس کی فلم ''راہی'' کے لئے سنگیت دیا۔ 1954 میں ریلیز ہونے والی فلم ''منا'' کے لئے اُس نے پس منظر موسیقی سے فلم کو آراستہ کیا۔ یہ فلم بغیر گانوں کے تھی۔ انڈو رشیئن کے باہمی اشتراک سے بننے والی فلم ''پردیسی'' کے موسیقار بھی انل دا ہی تھے۔ اس فلم کے مرکزی کردار میں نرگس تھی۔ اسی طرح خواجہ احمد عباس کی فلم ''چار دل چار راہیں'' کا سنگیت بھی انل بسواس نے ہی دیا تھا۔ اس فلم میں کئی نامور اداکار کام کر رہے تھے۔ جیسے راج کپور، اجیت، شمی کپور، مینا کماری اور نمی۔ یہ فلم خواجہ احمد عباس کی سب سے کامیاب فلم ہے۔ انل دا کی آخری فلم موتی لال کی ہدایت میں بننے والی ''چھوٹی چھوٹی باتیں'' تھی جس میں موتی لال اور نادرہ مرکزی کردار میں تھے۔ یہ فلم باکس آفس پر ناکام رہی۔

فلمی موسیقی کا مزاج بدل گیا تھا۔ ہندوستانی موسیقی پر مغربی موسیقی کی یلغار ہوگئی تھی ۔ نئے موسیقار مغربی دھنوں پر گانے بنانے لگے تھے۔ یہ نئی تبدیلی انل دا کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ ہندوستانی کلاسیکی کا پرستار تھا۔ وہ اس تبدیلی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر پایا اس لئے اُس نے فلمی دنیا سے سنیاس لے لیا۔ اسی بیچ سن 1961 میں اُسے دو دو صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس کا چھوٹا بھائی اور بڑا بیٹا پردیپ ایک موٹر حادثے میں جان بحق ہوگئے۔ ان دو حادثوں نے انل دا کو توڑ کے رکھ دیا۔ وہ بمبئ چھوڑ کر دلی چلا گیا جہاں اُسے آل انڈیا ریڈیو نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُسے ڈائرکٹر نیشنل آرکسٹرا بنایا گیا۔ جب بھی دلیپ کمار دلی جاتے تھے تو انل بسواس سے ملنا نہیں بھولتے تھے۔ انل بسواس اور دلیپ کمار کا ساتھ ''جوار بھاٹا'' سے شروع ہوا تو ''انوکھا پیار'' اور ''آرزو'' سے ہوتے ہوئے ''ترانہ'' پر جا کر ختم ہوا۔ انل دا نے پانچ سو پچاس گانوں کی دھنیں تیار کیں۔ انل دا کو موسیقی کا بھیشم پتاما کہا جاتا ہے۔ انل دا نے بنگال کی لوک دھنوں کو جاوداں کر دیا۔ وہ پہلا موسیقار تھا جس نے مغربی ساز کا استعمال تو کیا مگر ان سازوں کو ہندوستانی دھنوں میں سجادیا۔ انل دا ہر لحاظ سے ایک مہان سنگیت کار تھے۔

Great Stories

"...The secret of the Great Stories is that they have no secrets. The Great Stories are the ones you have heard and want to hear again. The ones you can enter anywhere and inhabit comfortably. They don't deceive you with thrills and trick endings. They don't surprise you with the unforeseen. They are as familiar as the house you live in. Or the smell of your lover's skin. You know how they end, yet you listen as though you don't. In the way that although you know that one day you will die, you live as though you won't. In the Great Stories you know who lives, who dies, who finds love, who doesn't. And yet you want to know again.

That is their mystery and their magic."

Arundhati Roy –The God of Small Things.

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

جس وقت آپ نے مجھے چہارسو کی خاص اشاعت کے لیے دعوت دی تو میں اُس وقت بہت بیمار تھی اور میں نے آپ سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میں مرگئی تو پھر آپ کیا کریں گے؟ جواب میں آپ نے میری ہمت بندھاتے ہوئے اپنی دعوت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ وہ تمام کام بھی خود ہی انجام دیے جو مجھے کرنے چاہیے تھے۔ آپ ہمت اور لگن کے آدمی ہیں، آپ نے جو کچھ کہا تھا اُس سے زیادہ کر دکھایا۔ افسوس یہ ہے کہ جواب میں مَیں کچھ نہیں کرسکی یا کر بھی نہیں سکتی کیونکہ گھٹنوں کی سرجری کے بعد میری کیفیت پہلے سے زیادہ خراب ہے اور میں ایک طرح سے مردہ بدست زندہ کی مثال بن کر رہ گئی ہوں۔ بہرحال آپ اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھ ناچیز کو اس لائق جانا۔ آپ اور آپ کے قارئین سے گزارش ہے کہ میرے لیے جس قدر بھی ممکن ہو دعاؤں کی سوغات بھیجتے رہیں۔ جتنی ضرورت دعاؤں کی آج مجھے ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔

عذرا عباس (کراچی)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

ماہنامہ ’’چہارسوُ‘‘ کا عذرا عباس نمبر ہمدست ہوا۔ حسبِ روایت قلب کی تسلّی، روح کی تازگی اور ذوقِ سلیم کی آسودگی کا باعث ہوا۔ ’’براہِ راست‘‘ میں آپ کا لیا انٹرویو لاجواب ہے۔ اس انٹرویو کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ عذرا عباس صاحبہ ایک نڈر، بیباک اور مشکل پسند قلمکار ہیں ساتھ ہی درونِ ذات کی حصار کی قائل بھی ہیں۔ آپ کے انٹرویو کو پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ انٹرویو لینے والا اگر زیرک نگاہ ہو تو کسی بھی Introvert کو اپنی ذات کی گرہیں کھولنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ عذرا صاحبہ نے بڑے نپے تلے انداز میں جوابات دیے ہیں پھر بھی بڑی حد تک ہم ان سے متعارف ہو سکے۔

عذرا صاحبہ کی خودنوشت اور فکشن پڑھ کر مجھے لگا کہیں کہیں میں بھی اُن تخلیقات میں شامل ہوں۔ ہم پاکستانی ادیبوں سے شخصی ملاقات تو نہیں کر سکتے مگر اللہ تعالیٰ کے احسان مند ہیں کہ قلم و قرطاس کے ذریعے ایک وسرے سے ملاقات تو کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں ’’بادبان‘‘ کے ذریعے پاکستانی ادبی محافل میں گاہے گاہے شریک رہا کرتی تھی۔ اس کے بعد طویل تعطّل رہا۔ جب سے ’’چہارسوُ‘‘ سے تعارف ہوا ہے پاکستانی ادیبوں میں شامل ہو کر خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ موقع مجھے آپ کی وجہ سے میسر آ سکا۔ اس کے لیے میں آپ کی احسان مند ہوں۔

افسانے سبھی اچھے ہیں۔ ہندوستان کے معروف افسانہ نگار اسرار گاندھی صاحب کا ’’سرد موسم کی تپش‘‘ اور فرخندہ شمیم صاحبہ کا ’’ریچھ‘‘ بہت پسند آیا۔

قمر جمالی (حیدرآباد، دکن)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جنوری فروری ۲۰۲۱ء جلد ۳۱، (ماشاءاللہ) آن لائن ملا۔ آہستہ آہستہ مطالعہ دلچسپی اور تجسس میں اضافہ کرتا رہا۔ خطوط کے بعد ’’براہِ راست‘‘ کا مطالعہ میرے لیے ہمیشہ مفید اور دلچسپ رہتا ہے۔ ’’براہِ راست‘‘ میں آپ کے اہم سوالات اور عذرا عباس کے جوابات نے بہت سے نئے سوالات میرے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے ہیں کچھ سوالات کے جوابات میں انہوں نے اختصار سے نہ جانے کیوں کام لیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر طاہرہ کاظمی کے سوال ’’ادب برائے ادب یا ادب برائے تاریک راہیں‘‘ مگر کچھ کے جوابات سچائی اور ادبی بے باکی سے دیے۔ محترمہ عذرا عباس سے میرا پہلا تعارف اُن کی کتاب ’’میز پر رکھے ہاتھ‘‘ کے ذریعے ہوا۔ کراچی میں دو چار ملاقاتیں بھی رہی ہیں۔ ’’کوئی لوٹا دے‘‘ میں بھی اُن کا اسلوب تیز اور رواں ہے۔ محمد سلیم الرحمان نے ’’قسطوں میں بٹی محبتیں‘‘ افتخار جالب مرحوم ’’نیند کی مسافتیں‘‘ اور ڈاکٹر تنویر انجم کا مضمون عذرا عباس کی سوچ اور فکر و فن کی تہہ داری کو بخوبی سامنے لاتے ہیں۔ آپ نے صاحبِ قرطاس کی نظموں کو سنین کے لحاظ سے (مختلف کتابوں) سے انتخاب کیا ہے جو اُن کی فکر کو سمجھنے میں مددگار رہے۔ اُن کی نظمیں ’’بیٹی کے نام‘‘، ’’جیسے میں تنہا ہوں‘‘، ’’چڑھائی‘‘، ’’نیند کی مسافتیں‘‘، ’’آنکھوں میں پھیلی ہوئی بے زاری‘‘، ’’تمہارے وعدے‘‘، ’’گمشدہ‘‘، ’’پچھتاوا اب نہیں ہے‘‘، ’’یہ قت کی ریاکاری ہے‘‘ اور ’’ایک قوم کو کیسے قابو میں کیا جاسکتا ہے‘‘ نظمیں اپنے موضوع کے لحاظ سے اہم تخلیق ہیں جس میں معاشرے کے کئی داغ اور چہرے نظر آتے ہیں۔

’’چہارسوُ‘‘ میں اب خطوط اور ’’براہِ راست‘‘ کے بعد ’’خاکِ شفا‘‘ کی قسط پڑھنے کی بے قراری رہتی ہے۔ دلی کی زبان جو شاید اب دلی میں بھی نہیں بولی جاتی ہو۔ محاوروں اور روزمرہ کا برمحل استعمال رواں اسلوب میں کمال کا ہے ذرا لہجہ ملاحظہ ہو:

’’آپ نے کون سا ہمیں لٹھ دے مارا ہے کہ ہم تلوار سونت کر میدان میں اُتر آئیں‘‘ (ص۔۸۰)

’’بزرگوں کی محفل کو لونڈوں کی منڈلی نہ بنایا جائے۔‘‘

نفسیاتی اور تہذیبی طنز دیکھئے:

’’بڑھتی عمر اور اختصار میں ہمیشہ اینٹ کتے کا بیر رہا ہے۔‘‘

''ہماری بینائی ہچکولے کھا رہی ہے یا واقعی آپ مسلمان ہو گئے ہیں'' (ص۔۷۸)

اشعار کا برمحل استعمال خوب ہے۔ رواں اسلوب میں مذہبی، تاریخی، سیاسی اور سماجی اشاروں سے ماضی کی بازیافت کا عمل بھی نظر آ رہا ہے جس میں ایک تہذیب کے نقوش اُبھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ خلش دہلوی، قاضی شہاب الدین، قاضی رفیع الدین، نورو چائے والا، بانکے بلم، چھکن میاں، وجاہت مرزا، عبدالشکور خاں، خلیفہ عبدالرشید، نواب شبن مرزا اور فائق بجنوری وغیرہ اتنے کرداروں کے مکالمے، حُلیے حرکات وسکنات کو کس مہارت سے پیش کر رہے ہیں۔ فائق بجنوری مشرقی علمی شرافت کا بہترین کردار تخلیق کیا ہے بہت خوب۔ چھوٹے پیر صاحب کی مسلسل شکایتیں اور بڑے پیرے صاحب کا مثبت ردِعمل روک تھام، کہانی کو آگے بڑھا رہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار۔۔۔ پیرزادہ آل انوار کے اس قسط وار ناول پر بہن رینو بہل کے یہ الفاظ معنی خیز ہیں۔

''خاکِ شفا کی بابت ایک شبّہ سا ہے اس ناول کا اندازِ بیان گلزار جاوید صاحب کی طرح ہی ہے'' (ص۔۱۲۲)

عبداللہ جاوید، آصف ثاقب، نذیر قیصر، نسیم سحر، ڈاکٹر ریاض احمد، جنید آزر، انجم جاوید، جاوید زیدی اور انیس الرحمٰن کی غزلوں کے اشعار میں ایک مانوس سا احساس بھی ہے متنوع رنگ و آہنگ بھی ہے۔

مسکرانا بہت آساں تھا کسی کے ہوتے
اب یہ عالم ہے کہ روتے ہیں سبھی کے ہوتے
(عبداللہ جاوید)

میں نے وہ شعر سنایا ہے یہاں
شہر کا شہر اڑا لے جائے
(آصف ثاقب)

اس شبنم میں ہونٹ بھگوئے جا سکتے ہیں
ان رنگوں میں ہاتھ ڈبویا جا سکتا ہے
(نذیر قیصر)

نامکمل سا خواب دیکھا تھا
عمر بھر کی تکان چھوڑ گیا
(انجم جاوید)

رضیہ اسماعیل کی نظم ''یک طرفہ محبت'' شخصیت کی اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے فیصل عظیم کی نظم ''تو مری نظم ہے جانِ من'' کومل جذبوں اور رنگیں لمحوں کی خوب صورت نظم ہے۔ سمیرا سلیم نے پاکستان کے حقیقی ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بصورت نظم زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ فرح کامران کی نظم ''ریگ زارِ ہستی'' اور ڈاکٹر رؤف خیر کی نظم بھی دل و دماغ کے قریب محسوس ہوتی ہے۔ انجم جاوید کے ہائیکو متاثر کرتے ہیں۔ افسانوں میں سب سے زیادہ متاثر اسرار گاندھی کے افسانے ''سرد موسم کی تپش'' نے کیا۔ محبت کی یادوں کے زخموں کو بڑے متوازن انداز سے پیش کیا ہے۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''رخصتِ سحر گاہی'' جمیل احمد عدیل کا ''تعزیت کی سافٹ کاپی'' اور رعنا کوثر کا ''دھوپ چھاؤں'' متاثر کرتا ہے ان کی بنت اچھی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب معروف افسانہ نویس، مضمون نگار اور مترجم ہیں اُن کے افسانے جیسے اہم ہوتے ہیں وہ ترجمے کے لیے کہانی بھی انوکھے موضوع کی تلاش کرتے ہیں اور جم کر ترجمہ کرتے ہیں۔ ''خوش باش شہزادہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔

گلزار بھائی اس شمارے میں عطیہ سکندر علی نے کمال کیا ہے۔ کیا جوہر تلاش کیا ہے ڈاکٹر ماہ نظیر درس وتدریس میں خدمات کے ساتھ ساتھ انہوں نے جس ماحول میں تعلیم حاصل کی وہ لائقِ تقلید ہے۔ بہت خوب۔ ''ایک صدی کا قصہ'' کا تو اپنا رنگ ہے۔ رس رابطے کے سب دوستوں کو میر پور خاصی سلام۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''مجلسِ چہارسو'' میں شامل کرنے پر ممنون ہوں۔ ''چہارسو'' جیسے معیاری رسالہ کا بغیر کسی مالی معاونت کے باقاعدگی سے شائع ہونا آپ کے جذبۂ شوق اور اردو ادب سے لگاؤ کا آئینہ دار ہے۔ رسالہ میں شامل مختلف ممالک کے ادیبوں کے دلچسپ مضامین، افسانے اور شاعری قارئین شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ ایک عظیم کارنامہ ہے جو آپ کے ادبی ذوق اور دلچسپی کا مظہر ہے۔ اس کامیاب کاوش پر آپ کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

انٹرویو میں زیادہ تر سوالات نفسیاتی بیماریوں سے متعلق تھے۔ قارئین کی معلومات کے لیے میں وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ نفسیاتی عوارض کا علاج نفسیات کے صرف ایک شعبہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ درحقیقت نفسیات زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ایسا علم ہے جو نہ صرف ہمارے روزمرہ کے رویوں، ان کے اسباب اور نتائج کا احاطہ کرتا ہے بلکہ لوگوں کے طرزِ زندگی کو سمجھنے، ان کے بارے میں پیش گوئی کرنے، ان میں ترمیم کرنے اور انہیں بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات تدریس، تحقیق، کاروبار، صنعتوں، ذہنی صحت، شخصیت کی نشوونما، نفسیاتی مسائل اور ذہنی امراض کے علاج معالجہ کے علاوہ ہمارے طرزِ عمل اور دیگر تغیرات کے مابین منظّم تبدیلیوں کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات ہمارے کردار، روزمرہ رویوں اور ان کے پس پردہ کارفرما عوامل کی نہ صرف وضاحت کرتی ہے بلکہ قبل از وقت ان کی نشاندہی بھی کرتی ہے اور ہمیں ناپسندیدہ عادات پر قابو پا کر پسندیدہ طور طریقوں کو اپنانے کے قابل بھی بناتی ہے۔

ڈاکٹر ماہ نظیر ریاض (پشاور)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ افسانوں، ناول نگاری اور دلچسپ نثری

نظموں کے حوالہ سے مشہور ادیب عذرا عباس سے منسوب کر کے ان کی ادبی خدمات کو قارئین سے شیئر کرنا قابلِ تحسین ہے۔ موصوفہ کی مشہور نظم ''نیند کی مسافتیں'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ شمارہ میں دلچسپ افسانے، شاعری اور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

''خوش باش شہزادہ'' افسانہ نویسی یا دوسری زبانوں سے افسانوں کا انتخاب اور ترجمہ کے حوالے سے ڈاکٹر فیروز عالم کا انتخاب ہمیشہ عمدہ اور بامقصد ہوتا ہے۔ خوش باش شہزادہ میں دلچسپ اور خوبصورت انداز میں معاشرہ میں اشاروں کی زبان میں جو منظر کشی کی گئی ہے قابل تعریف اور قابل غور ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کہیں تو بے دریغ دولت لٹائی جا رہی ہے اور نزدیک ہی کہیں کسی غریب کی جھونپڑی میں دو وقت کی روٹی اور بیمار بچے کی دوا کے لیے پیسے نہیں ہیں جو نہایت دکھ کی بات ہے بقول شاعر:

سینۂ چرخ میں ہر چند اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

''خاکِ شفا'' پیرزادہ انوار کے ناول کی تیسری قسط حسب سابق منفرد انداز کے ساتھ انتہائی دلچسپ ہے۔ دلی والوں کا مخصوص اندازِ گفتگو چھوٹے پیر صاحب کی شرارتیں اور گستاخانہ حرکتیں دریودھن اور پانڈوں کا مقابلہ اور اس کے پسِ منظر کا بیان جہاں قاری کو آخر تک گرفت میں رکھتا ہے وہیں ناول نگار کی برصغیر کے حوالہ سے تاریخی مذہبی، معاشرتی، سماجی اور ادبی معلومات پر ہمہ جہت دسترس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہے جو کہ قابلِ تعریف ہے۔

''دھوپ چھاؤں'' میں رعنا کوثر نے کسی خاندان کے حالات اور واقعات کو ایسے خوبصورت اور جذباتی انداز میں رقم کیا ہے جیسے لگا یہ کہانی سچی اور فرضی ناموں سے بیان کی گئی ہے کیونکہ اکثر اس سے ملتے جلتے واقعات ہم نے بھی اپنے اردگرد دیکھے ہیں۔ ''لمحوں نے خطا کی۔۔۔'' میں سید احمد قادری نے عمدہ انداز میں وطن سے جذباتی لگاؤ اور محبت کا ایک منظر نامہ پیش کیا ہے۔ ابتدائی عمر وطن میں گزارنے کے بعد جو لوگ کسی بھی وجہ سے دیارِ غیر میں چلے جاتے ہیں وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتے ہیں جیسے وہ اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں اور اکثر اوقات وطن کی یادوں میں بڑے جذباتی انداز میں کھو جاتے ہیں لیکن مجبور ہوتے ہیں اور کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ عموماً اگلی نسل کو نہ اُن کے وطن سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی لگاؤ۔ میرے بڑے بیٹے نے جو آج کل بمع فیملی ٹیکساس امریکہ میں ہے اور بہت اچھی پوسٹ پر کام کرتا ہے ۔ دو تین بار فیملی کے ساتھ پاکستان آ کر رہنے کی کوشش کی لیکن بیس سال وہاں رہنے کے بعد وہ یہاں کے سماجی اور تعلیمی نظام میں قابلِ قبول جگہ نہ حاصل کر سکے اور واپس چلے گئے۔

''کندھا'' تابش خانزادہ کی کہانی جذباتی حوالہ سے ایک حقیقت کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک نہایت طاقتور انسان کا وہ مضبوط کندھا جو مادی طور پر بڑے بڑے وزن اٹھا لیا کرتا تھا آخر ایک کم وزن کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا کیونکہ وزن اس کی اولاد کے جنازے کا وزن تھا۔

''تعزیت کی سافٹ کاپی'' جمیل احمد عدیل نے غیر معمولی اور جذباتی انداز میں اپنے خیالات اور تصورات کے بہاؤ کو اپنے مرحوم دوست سے ایس ایم ایس یا وٹس ایپ کے انداز سے پہچانے کے لیے ذریعہ بنا کر اُس کی روح سے رابطہ کی کوشش کی ہے۔ تحریر کے آخری حصہ کے الفاظ نہایت متاثر کن کیونکہ تقریباً ہر انسان یونہی محسوس کرتا ہے۔ ''وہ جس ویران جگہ پر آج لیٹا ہے اتنا نفیس تھا کہ شاید وہاں ایک منٹ بھی کھڑا ہونا پسند نہ کرتا'' زندگی کی حقیقت بس یہی ہے۔

''رخصت سحر گاہی'' شہناز خانم عابدی نے کہانی میں ایک افسوناک واقعہ بیان کیا ہے۔ مہر النساء اپنے گاؤں میں ایک نوجوان سے رشتہ کے لیے منسوب ہو چکی تھی البتہ گاؤں میں بڑے زمیندار کا زور چلتا تھا اور اس کے بندوق بردار آدمیوں کے سامنے کوئی پر نہیں مار سکتا تھا۔ خوبصورت مہر النساء اور اس کے گھر والے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ زمیندار کے بندوق برداروں نے گاؤں میں اچانک یہ اعلان کر دیا کہ زمیندار صاحب نے مہر النساء کو اپنے بڑے بیٹے کے لیے منتخب کر کے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انکار کی صورت مہر النساء اور اس کے منگیتر دونوں کی جانیں جانے کا خدشہ تھا چنانچہ قہر درویش بر جانِ درویش کے مصداق یہ شادی نہ ہو سکی لیکن مہر النساء نے ظالم زمیندار کے گھر کی بہو بننے کے بجائے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا۔ رخصتی کی آخری رات وہ روتی رہی اور گھر کی ہر ایک چیز کو دیکھتی اور محسوس کرتی رہی۔ وہ آخری بار گھر میں قریب ہی سوئے ہوئے افراد کو دیکھ کر الوداع کہتی رہی۔ صبح جب گھر والے اسے جگانے آئے اور آوازیں دیں تو مہر النساء کا بے جان اور سرد جسم تو پڑا تھا لیکن روح پرواز کر چکی تھی۔ معاشرہ میں ظلم کے ایسے مناظر نہ جانے کب ختم ہوں گے۔

''مجلسِ چہارسو'' میں ڈاکٹر ماہ نظیر ریاض سے آپ کا مکالمہ اور تعارفی کلمات شائع ہوئے ہیں۔ سوالات خوبی سے ترتیب دے کر جوبات کو قارئین کے لیے معلوماتی اور قابلِ غور بنانے کا موقع دیا گیا ہے۔ نفسیات گو کہ زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے مگر اس انٹرویو میں صرف انہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو نفسیاتی امراض سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں انسان کو اپنے رویوں، خوبیوں اور خامیوں کا ادراک ہونا چاہیے تاکہ وہ رویوں میں بہتری اور خامیوں کو دور کر کے ایک کامیاب انسان کی طرح زندگی گزار سکے۔

شاعری میں شازیہ اکبر، نسیم سحر، عبداللہ جاوید، ڈاکٹر عمر قیاز قائل، مبارک صدیقی اور وحیدہ نسیم کا کلام قابلِ تعریف اور متاثر کن ہے۔ ''چہارسو'' کو ایک خوبصورت شکل میں ترتیب دے کر قارئین کی نذر کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

باغ و بہار پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

انٹرنیٹ کی قسم رابطے کی تجدید ہو رہی ہے۔ وہ تو کہیے اس آڑے وقت میں نوتھیں ملکاں کے تصور اقبال کام آئے ہیں۔ کام آئے ہے کوئی اور مطلب نہ لیا جائے۔ آپ جانیں تصور اقبال کام کے آدمی ہیں۔ شاعری میں پر پرزے خوب درخوب نکال رہے ہیں۔ ان کی تمنا وہی کہ آصف ثاقب چہارسو سے جڑا رہے۔ پس میں جڑ گیا ہوں۔ تازہ چہارسو کے سارے صفحات تو نصیب نہیں ہوئے شاعری کا حصہ نظر نواز ہوا ہے۔ دیپک کنول کا فلمی آہنگ میرے لیے خاصا دلچسپ ہے۔ اب کے وجے بھٹ کو انہوں نے خوب ڈوب کر ابھارا ہے۔ یہ بڑا اچھا مضمون ہے۔ اس ضمن میں فلم ''بیجو باورا'' پر گفتگو دل کو لگی ہے۔ بیجو باورا اس وقت پاکستان میں آئی تھی میں نے موسیقی اور فن کاری کے برتتے پر متعدد بار دیکھی۔ مینا کماری اور بھارت بھوشن کی اداکاری خوب رہی وہ دونوں نرگس اور دلیپ کمار سے کسی طرح کم نہ رہے تھے۔ فلم کے گانے (درباری) او دنیا کے رکھوالے (بھیروی) من تڑپت ہری درشن کو آج (بھیرو) مجھے بھول گئے سانوریا قیامت خیز تھے۔ نوشاد نے تن من لگا کے موسیقی ترتیب دی تھی۔ دیپک کنول سے التماس ہے کہ وہ دلیپ کمار کے جنازے کا آنکھوں دیکھا حال بھی رقم کر دیں۔ آپ جانیں بوئی دور دراز کا گاؤں ہے یہاں نہ کوئی اخبار ہے نہ کوئی اور وسیلہ موت کی خبر تو سن لی تھی۔ کیا ہوا کیسے ہوا تفصیل معلوم نہیں۔ میرا خط بھی چہارسو میں نکلا تھا وہ دیکھا نہیں۔ اب وہ پرانے مزے پڑھنے کے کہاں؟

چہارسو میں میری تجدید ملاقات، احباب خوش ہیں تو میں بھی بہت راضی خوش ہوں۔ اللہ رکھے گلزار صاحب کی ساری برکتیں ہیں۔ میری غزل کے دوسرے شعر میں لفظ خاطر نجانے کیوں خطر ہو گیا ہے۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

برادرِ عزیز گل و گلزار جاوید، سلام مسنون۔

حسبِ معمول چہارسو کا تازہ شمارہ ڈاؤن لوڈ اور پرنٹ کر کے پڑھا کہ جدید ترین سائنسی سہولتوں کے باوجود ابھی تک مجھے ''مشینی خواندگی'' کی عادت نہیں پڑ سکی۔

محترمہ عذرا عباس کا آپ کے ساتھ مکالمہ بہت خوب لگا۔ یہاں یہ بات شاید دُہرا رہا ہوں کہ آپ جس شخصیت کا بھی انتخاب کرتے ہیں اس کے فن کا اور اس کے فن پر پہلے لکھی ہوئی تحریروں کا مطالعہ کر کے ایسے سوالات تیار کرتے ہیں جس سے اس شخصیت کی کچھ نئی جہات سامنے آ سکیں۔ عذرا عباس صاحبہ نے بڑے دبنگ اور مدلل انداز میں آپ کے کچھ نازک سوالات کا جواب دیا ہے اگرچہ ساتھ ساتھ وہ (صاف دلی سے) سوالوں پر غصے کا اظہار بھی کرتی رہی ہیں۔ بہرحال ان کا تفصیلی انٹرویو پڑھ کر بڑا لطف آیا اور اُن کی شخصیت کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو ان کی تحریریں پڑھ کر معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

جناب جمیل احمد عدیل کا افسانہ ''تعزیت کی سافٹ کاپی'' ایک مرحوم دوست سے monologue کی صورت میں ہے اور خوبصورت الفاظ سے مزیّن ہونے کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے اس جبر کو آشکار کر رہا ہے جب کسی کی خوشی یا غمی میں شرکت کے لیے جانا ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان جذبوں کی ترسیل بھی اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بآسانی ہو جاتی ہے۔ یہ سارا افسانہ اتنا اچھا لگا کہ اس کے نثری حسن کے اندر پنہاں شعری حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا، اور اختتامی جملے میں ''روحانی گلشنوں کا سارا کاروبار پہلے ہی سافٹ کاپیز کو قبول کرتا ہے'' کے تناظر میں افسانے کے عنوان ''تعزیت کی سافٹ کاپی'' پر افسانہ نگار کو بے ساختہ داد دی۔

اِسی طرح جناب تابش خانزادہ کا مختصر افسانہ ''کندھا'' بھی ایک جوان کی موت کے نتیجے میں ایک بوڑھے کے صدمے کی داستان سنا رہا ہے جو اتنا صحتمند تھا کہ تنومند اور وزنی لوگوں کو بھی کاندھوں پر اٹھا لیتا تھا، مگر اپنے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ وہ جنازے کو کندھے دیتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ جناب تابش خانزادہ نے اختصار سے انتہائی بھرپور افسانہ اس موضوع پر لکھا ہے۔

دیگر افسانے اور مضامین ابھی پڑھ نہیں سکا ورنہ ان پر بھی کچھ لکھتا۔

منظوم حصے میں سے چنیدہ اشعار لکھ رہا ہوں:

دشت در دشت مسافت ہے کڑی
مجھ کو دریا ہی بہا لے جائے
(آصف ثاقب)

اس شبنم میں ہونٹ بھگوئے جا سکتے ہیں
ان رنگوں میں ہاتھ ڈبویا جا سکتا ہے
(نذیر قیصر)

طیش جب آنے لگتا ہے مجھ کو
سر پہ پانی انڈیل لیتا ہوں
(احمد سوز)

شاید کہ مل ہی جائے کوئی ان دنوں کی
شے
الماریاں بھی کھول تُو سارے دراز دیکھ
(تصور اقبال)

گزر رہی ہے گلی سے برات خوشبو کی
بجا رہی ہے ہوا ہلکے ہلکے دروازے
(جیند آزر)

گھر کے گوشے گوشے کو روشنی میں رہنے دو
بند مت کرو صاحب روشنی کے دروازے
(شیوشرن بندھو)

تیری چاہت کی گرمجوشی پر
میں دسمبر کو بھی مئی لکھوں

(ڈاکٹر انیس الرحمٰن)

محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان مرحوم پر محترمہ سُمیرا اسلیم کا جل کی نظم مرحوم کی جانب سے اپنے ہم وطنوں کے نام خوب انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ پڑھ کر یاد آیا کہ چند برس پیشتر مَیں نے بھی اُن پر ایک نظم لکھی تھی اور ایک تقریب میں انہیں پیش کرنے کے لیے لے کر بھی گیا تھا، سیکورٹی وجوہات کی بناء پر وہ اس تقریب میں شامل نہ ہو سکے تھے تاہم میں نے وہ نظم وہاں پڑھی ضرور تھی اور بعد میں اسے فریم کروا کے اُنہیں ذاتی طور پر اُن کے گھر جا کر پیش بھی کی تھی۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام اور احترام۔

تازہ شمارہ کچھ مختلف وضع کا تھا، انٹرویو کی ترتیب کے حوالے سے بھی۔ عذرا عبّاس صاحبہ کی نظمیں چڑھائی، جب بیزاری آتی ہے، کہیں سے کوئی نقطہ آ جائے، اگر تم مجھے برقع پہنا کر۔۔۔۔ اور کچھ دوسری زوردار بھی ہیں اور پُر اثر بھی۔ نسیم سحر صاحب کی نعت کا چوتھا اور پانچواں شعر بالخصوص پُر لطف تھے۔ وحیدہ نسیم صاحبہ اور زاہد سعید زاہد کی غزلیں اچھی تھیں، ڈاکٹر ولا جمال العسیلی کی اردو پر دسترس قابل دید ہے۔ انجم جاوید صاحب کی غزل خوب ہے، اس کی آڈیو میرے پاس محفوظ ہے، ان کی ہائیکو بھی اچھی تھی۔ افسانوں میں عذرا عباس کا گرگٹ کا کھیل تہ دار ہے، ڈاکٹر ذاکر فیضی کا ادھورا نروان اس الجھن پہ کھل کر بات کرتا ہے جس کا ہم ابھی شکار ہو رہے ہیں بلکہ ایسے واقعات یہاں حقیقتاً ہو بھی چکے ہیں۔ تابش خانزادہ کا کندھا بہت خوب تھا۔ پیرزادہ آلِ انوار کا ناول ”خاکِ شفا“ پڑھا بلکہ تینوں قسطیں ایک ساتھ ہی پڑھیں اور محسوس ہوا کہ ابھی اس کا پلاٹ کھلنا باقی ہے۔ اگرچہ اس میں بڑی چابک دستی سے گئے وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے مگر بعض جگہیں محلِّ نظر ہیں جہاں زمانے مل گئے ہیں کہ ملکوں کے ناموں کا ذکر کرتے وقت لگا کہ آج کے ذرائع ابلاغ کے زیر اثر بات ہو رہی ہے۔ کہانی کا اصل موضوع غالباً اب واضح ہونا شروع ہوگا، اس کا انتظار رہے گا۔ ادب کے ساتھ۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

تازہ شمارے کے ذریعہ عذرا عباس سے مل کر خوشی ہوئی۔ اُن کی نظمیں اور بچپن کی یادوں پر مبنی اُن کا مضمون ”کوئی لوٹا دے“ اُن کی بے باکی، صاف گوئی اور دلیری کی غمازی کرتا ہے۔ سوالات میں اس بار اُن کی ذاتی زندگی کے متعلق جھلک نہیں ملتی، نہ ہی اُن کے والدین، بھائی بہنوں سے اُن کے تعلقات کے متعلق کچھ ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرطاسِ اعزاز کی شخصیت کو آپ اپنے انٹرویو میں ایسے لپیٹتے ہیں کہ اس کی زندگی کھلی کتاب بن کر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس بار کچھ تشنگی رہ گئی۔ ساری نظمیں کمال کی ہیں۔ ایک اور نامور ادیبہ سے متعارف کرانے پر آپ کا بے حد شکریہ۔

شہناز خانم صاحبہ کا افسانہ ”رخصت سحر گاہی“ شروع میں تو روایتی یادوں پر مبنی کہانی لگ رہی تھی مگر ان کے اختتام نے ہلا دیا۔ کہانی نے زبردست پلٹا کھایا اور کہانی سیدھی دل پر چوٹ کر گئی۔ اسرار گاندھی صاب کی رومانی کہانی بھی پسند آئی۔ منظر کشی کمال کی کی ہے۔ ”تعزیت کی سافٹ کاپی“ آج کے دور کی بھاگتی دوڑتی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ دوست کی وفات پر دل کے جذبات پرت در پرت کھلتے جاتے ہیں۔ ”ادھورا نروان“ پڑھ کر آنکھیں بھی کھلیں اور ذہن بھی ہلا۔ مردوں کی ذہنیت، اُن کی سوچ کا اچھا پردہ فاش کیا حالانکہ کہانی بولڈ ہے مگر شاید حقیقت میں بھی لوگ ایسا کرتے ہوں۔ تابش خانزداہ کی کہانی ”کندھا“ مختصر مگر دلچسپ اور درد بھری کہانی ہے۔ فرخندہ شمیم کی کہانی ”ریچھ“ ہمارے معاشرے کی گھناؤنی سچائی ہے جسے پڑھ کر تکلیف ہوئی۔ کاش یہ دنیا رہنے کے قابل بن سکتی۔ انسان صرف انسان بن کر رہے حیوان نہ بنے۔ ”لمحوں نے خطا کی“ سید احمد قادری نے جڑوں سے بچھڑنے کی تکلیف اور درد کو افسانہ ”لمحوں نے خطا کی“ میں بخوبی بیان کیا ہے۔ رعنا کوثر کا ”دھوپ چھاؤں“ ماں بیٹی کے رشتوں پر مبنی دلچسپ اور حقیقی کہانی ہے۔ صرف ماں کا رشتہ بے لوث محبت کا رشتہ ہوتا ہے۔ اولاد بھی اُس کسوٹی پر کھری نہیں اترتی۔ ”نامکمل چہرے کے نقوش“ کا ماحول بڑھا مایوس کن اور بوجھل ہے۔ بے روزگاری بہت بڑی سزا ہے۔ کل ملا کر افسانوں کی رنگ برنگی محفل خوب سجی ہے۔

خاک شفا کے بارے بات کریں تو اس میں مصنف نے اس باب کو نہ صرف دلچسپ واقعات سے آراستہ کیا ہے بلکہ اس میں سیاسی، فلمی، تاریخی معلومات بھی مہیا کرائی ہیں۔ پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان صاحب کے متعلق، وجے لکشمی پنڈت کے متعلق جو تفصیل درج ہے وہ میرے لیے نئی تھی۔ سہراب مودی کا مرزا غالب فلم بناتے ہوئے مرزا صاحب کے خستہ حال مزار کو پھر سے تعمیر کرانا پڑھ کر اچھا لگا۔ مرزا صاحب کی جو غزل درج ہے وہ بھی میں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ دوروپدی چیر ہرن کی تفصیل بھی دلچسپ انداز میں دی گئی ہے۔ کل ملا کر پیرزادہ صاحب ناول میں ہر عہد کے اہم پہلوؤں کو روشن کرتے ہوئے اچھی رفتار سے قارئین کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ زبان اور بیان پر گرفت کافی مضبوط ہے۔ آئندہ باب کا انتظار ہے۔ آسکر وائلڈ کا فیروز عالم صاحب کا ترجمہ کیا ”خوش باش شہزادہ“ دلچسپ ہے۔

شاعری کی محفل بھی خوب ہے۔ غزلیں اور نظمیں کمال کی ہیں۔

اس مرتبہ تو ایک نہیں دو دو انٹرویو پڑھنے کو ملے اور مزے کی بات یہ کہ دونوں خواتین اور اپنی اپنی فیلڈ میں ماہر۔ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ماہ نظیر نے کئی ریکارڈ توڑے ہیں۔ عطیہ سکندر علی کا لیا ہوا یہ انٹرویو بھرپور بھی ہے، معلوماتی بھی۔ نفسیات ایک ایسا موضوع ہے جس کی کوئی انت نہیں۔ پھر بھی نفسیات کے متعلق جو معلومات مہیا کرائی گئی ہیں مفید اور دلچسپ ہیں۔ ایک ایسی شخصیت سے متعارف کرنے کا بے حد شکریہ۔

حسبِ معمول فلرز بھی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ایک اور کامیاب شمارہ نکالنے کے لیے بے حد مبارکباد۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

جنابگلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

عذرا عباس نمبر نظر سے تو اسی وقت گزر گیا تھا جب آپ نے نومبر میں بھیجا تھا۔ سرِ ورق بہت خوبصورت تھا۔ بہت شکریہ اس بات کا ادا کرنا ہے کہ آپ نے سرورق پر میری کتاب رعنائی یال کو بھی عزت بخشی۔ عذرا عباس کی تصویر اور براہِ راست میں پڑھنے والے سوالوں کے جوابات مکمل طور پر مصنف کے بارے میں آ گہی دے دیتا ہے۔ ۱۰ دسمبر کو میری کتاب رعنائی خیال کی تقریب رونمائی ہوئی اور میں تھوڑی مصروف ہوگئی تھی۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کارنامے پر خوش ہو رہے ہیں آپ نے تو بے شمار ادیبوں کو ہم سے متعارف کرایا ہے جو کئی کتابوں کے خالق ہیں۔ اس میں عذرا عباس بھی ہیں جو شاعرہ، ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں ان کے مضامین پڑھ کر ان کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عذرا عباس کی خوبصورت تحریر ''کوئی لوٹا دے'' پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ہمیں کوئی اختیار نہیں بس ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے عذرا عباس نے صحیح کہا۔

افسانوں میں تمام افسانے تو نہیں پڑھ سکی مگر جو پڑھے وہ پسند آئے۔ شہناز خانم عابدی کا ''رخصت سحر گاہی'' ڈاکٹر فیضی کا ''ادھورا نروان'' تابش خانزادہ کی کہانی ''کندھا'' اور ''لمحوں نے خطا کی'' حساس افسانے ہیں معاشرے کی تصویر کشی ہے خاص طور سے ''ادھورا نروان'' اور فیروز عالم کا ''اُفق کے اُس پار'' پسند آیا۔

خاکِ شفا ایک دلچسپ ناول ہے اور تیسری قسط میں آہستہ آہستہ چھوٹے پیر صاحب بڑے ہو رہے ہیں اور خوب رنگ نکال رہے ہیں۔ پیر صاحب کے نام و نمود اور جاہ و جلال اپنی اولاد کو سنوار نہیں رہا بگاڑ رہا ہے۔ طنز و مزاح سے بھرا ہوا یہ ناول نہ صرف دلی کی زبان میں چٹخارے لے رہا ہے بلکہ ناول نگار کو مہا بھارت کا سبق بھی یاد ہے۔ بہت خوب۔

اب نظموں اور غزلوں کی طرف آتے ہیں۔ جمیل عثمان کا جاوید نسیم سے اظہار گفتگو ان کے اپنے کزن کے بچھڑنے کا غم بتلا رہا ہے۔ بہت عرصے بعد افسانہ نگار اور شاعرہ محترمہ وحیدہ نسیم کا کلام نظر سے گزرا خوشی ہوئی۔ فرح کامران کا ریگ زارِ ہستی ان کے دل کی آواز ہے اور غزلیں بھی پسند آئیں مگر لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ دیپک کنول فلمی دنیا کی معلومات لاتے ہیں اور میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ وجے بھٹ کامیاب ہدایت کار کی جدوجہد اور مضبوط ارادے پڑھ کر احساس ہوا کہ لوگ ترقی یوں ہی نہیں کرتے۔ ''چہارسُو'' مکمل معلوماتی رسالہ ہے۔ ایک مصنف کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ خدا کرے دن بدن ترقی کرے۔

رعنا کوثر (نیویارک)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

آج کا انسان مشینی دور سے گُزر رہا ہے لمحے کی فرصت نہیں بھاگ دوڑ اور باگ ڈور کی گتھیوں میں ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ اپنے پیاروں سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں گھڑی کی سوئی گھوڑے کی چال سے کہیں زیادہ تیز چل رہی ہے روز افزوں بگڑتے ہوئے حالات کے لگائے ہوئے گہرے گھاؤ نے حضرتِ انسان کو ادھ موا کر دیا نہ وہ چابک دستی نہ وہ شوخیاں نہ ذوقِ آگاہی فکرِ معاش اور تلاشِ معاش نے دورِ حاضر کے انسان کو انتہائی بور اور احساسات سے عاری کر دیا ایسے میں ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی قریب آ کے ہولے سے میٹھی بات کہہ جائے کوئی چٹکلہ چھوڑ جائے کوئی عمدہ مشورہ دے جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی کے پاس دلِ دردمند ہو وہ ہر شخص کے مزاج کے مطابق ڈھل جاتا ہو اس کی خواہش کے مطابق خیالوں کے پھول چُن کر لفظوں کی مالا بنانا ہر شخص کے پاس پہنچ کر اس کے ساتھ بیٹھ کر خوشگوار ماحول بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اسی لئے اس کے نعم البدل آج کے برقیاتی اور ٹیکنیکل دور میں بہت سے زرائع وارد ہو چکے ہیں لیکن جو مقام ذوقِ مطالعہ کا ہے وہ کسی کا نہیں اور اسی خیال کو مدِ ظر رکھتے ہوئے ہمارے پیارے گُلزار جاوید بھائی نے چہارسُو نامی رسالے کا ذمہ اپنے کاندھوں پہ لے لیا اور چہارسُو پاکستان کی سرحدوں سے ہوتا ہوا دنیا کے مختلف مما لک کے باسیوں کے زیرِ نظر ہے اور انتہا کو پہنچے ہوئے حالاتِ زار میں کچھ عمدہ مواد مطالعے کو مل جائے تو با ذوق افراد کے لیے باعثِ سکونِ قلب ہوتا ہے پردیس میں جہاں ہم زبانی لا مکانی کی سی حیثیت رکھتے ہیں وہاں چہارسُو کی آمد اندھیرے میں کسی دیئے کی لَو کا کام کرتی ہے ہر ماہ کسی اچھے مصنف، شاعر، نقاد یا ناول نگار کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جس سے ہم جیسے کم علم اور بے وقعت اشخاص بھی فائدہ اُٹھاتے اور کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس مرتبہ بھی عذرا عباس جیسی نامور شخصیت کا مکمل تعارف ہمارے سامنے ایک سے بڑھ کے ایک عمدہ نثر پارہ اور بھرپور مقصد سے مزین نثری نظمیں بے حد اعلا ذوق کی غماز ہیں اور مختلف شعراء کی شاعری تو چہارسُو کی زینت بنتی ہی ہے۔ ہر دو تحریروں نے تو دل ہی موہ لیا ایک میل خوردہ قالین اور دوسری آخری نشانی۔

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

مکاں کی خیر ہو

سب ہی کے گھر بسے رہیں سب کے مکاں کی خیر ہو
آ میرے دل دعا کریں سارے جہاں کی خیر ہو
گزرے ہوئے دنوں کا حبس پھیل رہا ہے چارسُو
اب جو نئی ہوا چلے سالِ رواں کی خیر ہو

سلیم کوثر

...... آئینہ در آئینہ ......

ادب میں بیک وقت کئی اصناف میں اپنی نمایاں شناخت قائم کرنے والے کم ہی ادیب ہوتے ہیں۔ اس کے لیے متنوع تخلیقی وتنقیدی بصیرت اور کثرتِ مطالعہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آئینہ در آئینہ (مرتبہ جمیلہ صغیر) میں شامل صغیر اشرفؔ کے فن اور شخصیت پر مضامین اور دوسرے نوشتہ جات کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں بلکہ تخلیقی ادب یعنی شاعری اور فکشن میں بھی اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ صغیر اشرف کی تحریروں کے غائر مطالعے کے بعد یہ منکشف ہوتا ہے کہ ان کے یہاں سنجیدہ مطالعات پر حد درجہ توجہ ہے۔ وہ اپنے بہت سے معاصرین کی طرح لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ وہ اختراعی اور تقابلی ذہن کے مالک ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں اکثر مقامات پر ایسے کئی ان چھوئے پہلوؤں کا تجزیہ اور احتساب نظر آتا ہے جن پر لکھنے والوں کی نظر نہیں جاتی۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر ان کی نصف درجن سے زیادہ کتابوں (اردو/ہندی) کے محتویات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ صغیر اشرف ادب کو کسی ازم یا تحریک کے تابع نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ فن کو مقدم جانتے ہیں اور اکثر وبیشتر معروضی طریقۂ کار اپناتے ہوئے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ شاید اسی لیک سے ہٹ کر چلنے کی روش نے انہیں دوسرے بہت سے لکھنے والوں سے ممتاز ومیّز بنا دیا ہے۔ ان کی تنقیدی وتحقیقی تحریروں کا متعدد مستند ادبا و ناقدین نے محاسبہ کیا ہے، ساتھ ہی ان کے یہاں انفراد وامتیاز کا سراغ لگایا ہے۔ محترمہ جمیلہ صغیر صاحبہ مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے بہت ہی جگر کاوی کے ساتھ صغیر اشرفؔ کی شخصیت اور فن پر بھرپور کتاب پیش کر کے ایک ایسے ادیب کو متعارف کرایا ہے جو بہت ہی جینوئن اور آریجنل ہوتے ہوئے بھی ایوانِ ادب میں اس طرح ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا جاتا، جس طرح کہ لیا جانا چاہیے۔ مجھے امیّد ہے کہ ’’آئینہ در آئینہ‘‘ کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ادب کا خالص حلقہ صغیر اشرفؔ کی متنوع ادبی خدمات کا بڑے پیمانے پر اعتراف کرے گا۔

...... **ڈاکٹر نسیم احمد نسیم**

...... آپ کے خطوط ......

احساس اخلاص کی لذت آمیزی کے طلسم نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ محبت کی خوشبو نہ صرف ہمہ تن کیف بن کر میرا طواف کر رہی ہے بلکہ میں اس کا لمس بھی محسوس کر رہا ہو، اور سرشار ہوا جا رہا ہوں۔ یہ خطوط جن کی عبارتوں کی چمک دمک سالہا سال کے لمحات کی تیز رفتار نے قبض کر لی ہے، ابھی تک صدق وصفا کے زم زم میں نہائے ہوئے ہیں، ابھی تک ان کے الفاظ میں خلوص اور محبت کا نور جگمگا رہا ہے، جو کسی اور کو نظر نہ آئے لیکن پوری تجسیم اور تصیم کے ساتھ میرے زیرِ مشاہدہ ہیں۔ ان خطوط میں اپنائیت کی کلیاں ہیں۔ ان میں خلوص کے مہکتے ہوئے گلہائے رنگیں ہیں۔ ان میں عقیدت وآشنائی کی وہ شاداب پتیاں ہیں جن کے بطن میں بہار نمودار ہوتی ہے۔ ان میں اکثر ایسے خطوط ہیں جو رسالہ ’’روشنی‘‘ کی اشاعت کے دوران شعرا اور ادبا نے مجھے لکھے ہیں لیکن زیادہ خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں، ان خطوط کے لکھنے والوں نے خوب ہی جولانئ طبع دکھائی ہے، اور میرے لیے تفننِ طبع کے ساتھ ہی علم وآگہی کے کئی ابواب وا کر دیے ہیں۔

...... **نقشبند قمر نقوی بخاری**

...... سہ ماہی کانگاں ......

جس طرح آدمی کو انسان بننے کے لیے دینی اور دنیاوی تعلیم کی اہمیت اور اولیت مسلم ہے اسی طرح مادری زبان میں بامعنیٰ تعلیم لازمی ہونا چاہیے بلاشبہ اہل قلم اپنی حیثیت میں قومی زبان کے ذریعہ اردو زبان وادب کی خدمت احسن طریق پر انجام دے رہے ہیں مگر مادری زبان سے عدم توجہی سنگین مسائل کا موجب بن رہی ہے۔ جناب افضل راز اور اُن کے رفقائے سفر جناب شاہد اقبال گھمن، جناب مقصود چوہدری اور جناب رانا پرویز اختر لائق مبارک باد ہیں جو نہایت تندہی سے سہہ ماہی ’’کانگار‘‘ کے ذریعہ پنجابی ادب کی ترویج بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ کانگاں کی ہمہ رنگی الفاظ میں بیان کرنا مشکل بھی ہے اور دشوار بھی پھر بھی وقت کی آواز میں آواز ملانا ’’کانگاں‘‘ کا وصفِ خاص ہے ملاحظہ کیجیے:

بابا آیا کرتا رپُر بھیکی اُداسی سکل اُتار/ پھر سناری کپڑے منجنی بیٹھ کیا ورتار/ اُلٹی کنکپ و پاؤں گرانک، بنر اوپر دھارا/ پتر بن کُول نہ پالیا من کھوٹے آ کی تارا/ بانی مُکھہ اُچاریئے ہوئے رُشنائی مِٹے اندھار/ گیان گوشت چرچا سدا انہد اشبد اُٹھے دُھنکار/ سودر آرتی گاریئے امرت ویلے جاپ اوچا آر/ گُر مُکھ بھارا تھر بن تارا

...... **فاری شا**

مایہ ناز مصنف و مترجم **ظفر قریشی** کا اُردو میں منفرد ناول

بُوم بسیرا شائع ہوگیا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو امریکا جا کر بس گیا۔ اس ناول میں دیسی سچائیاں اور دوسرے معاشروں کی بُرائیاں بھی ہیں۔ اس میں منافقین کے فتنے، جمہوریت کے نام پر سازشیں اور دین کے نام پر دین سے کھلواڑ کرنے والوں کی داستانیں اور وہ بہت کچھ ہے جسے پڑھ کر آپ کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ صدیوں بعد ایک ایسا ناول آتا ہے۔ ''بُوم بسیرا'' اسی دور کا فکر انگیز ناول ہے۔

قیمت صرف 1200/- روپے

رابطہ **فرید پبلشرز** 12 مبارک محل نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

ٹیلی فون نمبر **021-327-7005** ای میل mdfaridbooks1@live.com

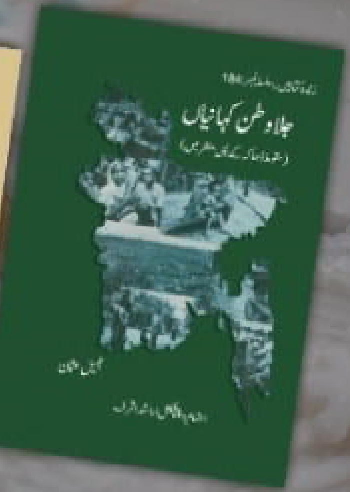
جلاوطن کہانیاں

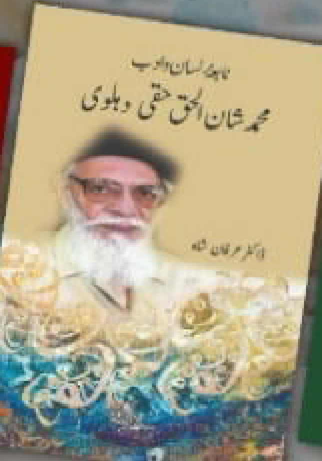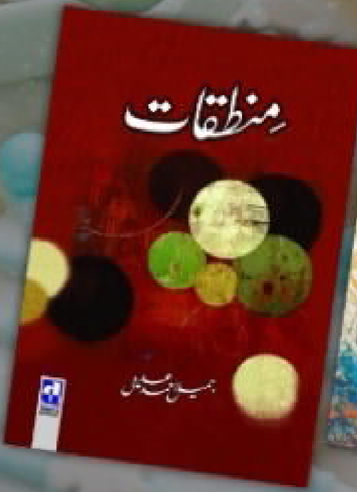
ماہر لسانیات و ادیب
محمد شان الحق حقی دہلوی
ڈاکٹر عرفان شاہ